بانی
سہام مرزا

مُدیرِ اعلیٰ ـــــــــ منزہ سہام
مُدیر ـــــــــ کاشی چوہان / رضوانہ پرنس
نائب مُدیر ـــــــــ دانیال شمسی
منیجر مارکیٹنگ ـــــــــ زین العابدین
قانونی مُشیر ـــــــــ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ـــــــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

جون 2015ء
جلد: 43 ☆ شمارہ: 06
قیمت: 60 روپے

خط و کتابت کا پتا
88-C II ـ فرسٹ فلور ـ خیابانِ
جامی کمرشل ـ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ـ فیز-7 کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆ منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

ناولٹ

افسانے

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

ناولٹ

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سی 7-OB تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com
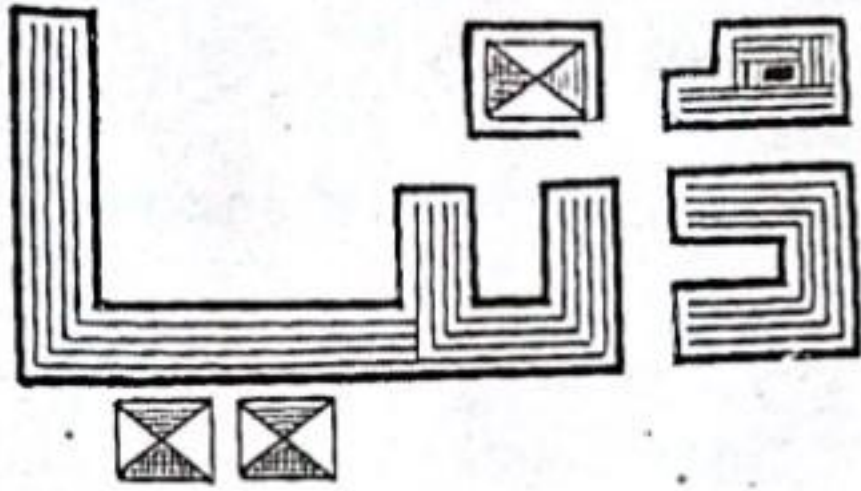
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا ــــ اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

اُمید...... زندگی ہے

ساتھیو!

آج ہم جس عہد میں جی رہے ہیں۔ اس عہد کا کیا ذکر کروں کہ یہ عہد مختلف آسمانوں والی کئی دنیاؤں کی بقائے باہمی کا اظہار کرتا، روشنی کی دھجیاں لیے، نیلے آسمان کی جھلک دکھاتا۔ اسکاچ ٹیپ سے ہر دن کو وقت کی ڈائری پر چسپاں کرتا، ہر برس پُر ہجوم دنیا کو غریب سے غریب تر کرتا جارہا ہے۔

ابھی 60 انسان اڑا دیے گئے۔ سرنہیں ٹوپیاں کاٹی گئیں۔ (یہ استعارہ دنیا نے دیکھ بھی لیا) کیا ہم حضرتِ انسان اس عہدِ ناگفتہ بامیں اتنے ارزاں ہوگئے ہیں؟ انصاف!!! ایک لفظی التماس کا استعارہ بن چکا ہے۔

غلط وقت پر بولنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

واویلا کرنے میں اگر امید ہے تو واویلا کریں۔ امید بہر طور ایک ایسے شہر کی طرح ہوتی ہے جو قدامت اور جدت کی دو اینٹوں سے تعمیر ہوتا ہے۔

اس شہر کے بیچ سے محبت کا دریا بہتا ہے۔ رات کے روشن دانوں سے امید ہمارے بدن میں سرائیت کرتی ہے اور خوابوں تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔

کوئی کی تلخی بہت مزہ دیتی ہے۔ جب یہ سب سوچتا ہوں، لکھتا ہوں۔

ابھی بھی امید کا تازہ پھول میرے اندر کہیں نہ کہیں کھلا پڑا ہے۔ لہلہا رہا ہے اور اپنی مہکار سے مجھے آگے بڑھنے اور ہر غم اور سانحے کو ہمت سے برداشت کرنے کا حوصلہ دے رہا ہے۔

ساتھیو! امید زندہ رکھو! خدا سب کچھ آپ کے حسبِ منشا کردے گا۔

کاشی چوہان

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

آج ذرا ہم اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں جینے کا مقصد صرف ایک ہی نظر آتا ہے کہ کسی طرح عالیشان مکان، کوٹھی یا بنگلہ بنالیں اور جنہیں اللہ نے عالیشان مکان دیے ہوئے ہیں وہ اس فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ میں اس مکان کو مزید عالیشان کیسے بناؤں۔

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

ایک نومسلم اعرابی آیا اور اس نے نظر بھر کر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرف دیکھا اور کہا ''کاش میں ان کا مالک ہوتا۔'' اسے خبر نہ تھی کہ وہ شہنشاہِ دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں کھڑا ہے۔ رسول ﷺ نے وہ ریوڑ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اعرابی ہکا بکا کبھی اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھتا اور کبھی اپنی تنگ دامانی کو دیکھتا۔ آخر جب اسے یقین آگیا کہ یک جنبشِ لب پر وہ اتنے بڑے ریوڑ کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف بیان کرتے ہوئے خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہوا۔ یہ غزوہ حنین کا موقع تھا۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مالِ غنیمت کی اتنی کثرت سے نہیں نوازا تھا۔ مالِ غنیمت کے ڈھیر جتنے بلند تھے ہادی برحق ﷺ کا دست مبارک اتنی سرعت سے انہیں تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔ اس دوران انصارِ مدینہ کے بعض نوجوانوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ نبی کریم ﷺ مال کی تقسیم میں انہیں نظر انداز فرما رہے ہیں۔ انہیں خیال گزرا کہ چند دن قبل فتح مکہ کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے ان کی اسلام کے لیے اتنی قربانیاں نہیں ہیں لیکن انہی نو مسلموں کو مالِ غنیمت میں سے زیادہ حصہ دیا جا رہا ہے جب کہ اسلام کے لیے ہم نے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا لیکن ہمیں ان کے مقابلے میں بہت کم دیا گیا ہے۔ انہیں مال کے کم ملنے سے زیادہ اس بات کا احساس ہوا کہ رسول ﷺ کی نظرِ اقدس میں ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ انصار مدینہ کو اداسی اور یاسیت نے گھیر لیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کی یہ کبیدہ خاطری کہاں چھپی رہ سکتی تھی چنانچہ آپ نے انصار کو بلوایا۔ جب انصار ایک جگہ جمع ہو گئے تو اللہ کے حبیب حضرت محمد ﷺ ان کے درمیان جلوہ افروز ہوئے۔ انصار کے چہروں پر اداسی نمایاں تھی۔ آپ ﷺ نے انصار کی جانب محبت

پاش نظروں سے دیکھا اور فرمایا ''اے گروہ انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ تو مال و دولت کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر واپس جاؤ؟''

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ انصار کی چیخیں نکل گئیں۔ شمعِ رسالت کے پروانوں میں نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور وہ زور دار ہچکیوں سے رو پڑے یہاں تک کہ ان کے داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ سب نے بے اختیار ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم راضی ہیں۔ (زادالمعاد جلد 3)

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اپنے آقا و مولا ﷺ سے بے پناہ محبت کی ادنیٰ مثال ہے۔ ان کی نگاہ میں سیم و زر کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو محبتِ رسول ﷺ کی لازوال دولت سے مالا مال تھے اور ایک آج ہم ہیں کہ تہی دامانی پر اتراتے پھرتے ہیں۔ حضور کی محبت کے لیبل چسپاں کیے ہوئے ہیں مگر ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھیے اور سچ بتایئے کہ ایسا ہے کیا؟ یقین جانیں کہ حضور سراپا نور ﷺ کی محبت کے ماسوا مومن کے لیے کوئی دولت نہیں ہے۔ یہ حضور ﷺ سے صحابہ کرامؓ کی محبت ہی تھی جو ان کی زندگیوں میں عظیم انقلاب لے آئی۔ ہماری زندگیاں اونچے اونچے محلات کی تعمیر میں صرف ہوئی جاتی ہیں مگر ذرا نگاہ ناز نبوت ﷺ کی ناراضی کا واقعہ بھی پڑھیے کہ کسی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خفا ہو گئے تو سمجھ لو کہ اس کی دنیا و آخرت ویران ہو گئی۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کے ہمراہ مدینۃ المبارک کی ایک گلی سے تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک اونچا اور پختہ مکان نظر آیا اس پر قبہ (گنبد دار حجرہ) بنا ہوا تھا۔ آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے۔ عرض کیا گیا کہ حضور یہ فلاں انصاری صحابہ نے مکان بنایا ہے۔ یہ سن کر حضور خاموش ہو گئے اس کے بعد جن صحابہ کا مکان تھا وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا۔ حضور ان صحابہ سے ایسے ہو گئے جیسے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ یہ حضور کا اپنے پروانوں سے ناراضی کا ایک انداز تھا۔ وہ صحابی سمجھے شاید حضور مصروفیت کی وجہ سے میری طرف متوجہ نہیں ہو پا رہے ہیں مگر جب کئی مواقع پر ایسا ہوا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کے آقا ﷺ ناراض ہیں۔ اس بات کا ادراک ہونا تھا کہ ان صحابی کی تو دنیا ہی ویران ہو گئی۔ بے قرار اور دیوانے ہو کر ہر ایک سے پوچھنے لگے کہ شاید کسی سے حضور کی ناراضگی کا سبب پتا چل سکے۔ آخر تحقیق کرنے پر پتا چل ہی گیا کہ حضور کو ان کا گنبد دار پختہ مکان ناپسند ہوا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی۔ حضورؐ کے پاس جا کر کوئی عذر پیش نہیں کیا فوراً گئے اس مکان کا سرے سے وجود ہی مٹا دیا۔ اسے توڑ کر زمین کے برابر کر دیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''ہر تعمیر آدمی کے لیے وبال ہے سوائے اس تعمیر کے جو سخت ضرورت اور مجبوری کے ہو۔'' (ابوداؤد)

آج ذرا ہم اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں جینے کا مقصد صرف ایک ہی نظر آتا ہے کہ کسی طرح عالیشان مکان' کوٹھی یا بنگلہ بنا لیں اور جنہیں اللہ نے عالیشان مکان دیے ہوئے ہیں وہ اس فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ میں اس مکان کو مزید عالیشان کیسے بناؤں۔ اسراف کے دریا ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی میں ہم نے بہا رکھے ہیں۔ نافرمانی کے ماہر تیراک بنے بیٹھے

ہیں۔ سوچتے سمجھتے ہیں کہ کبھی نہیں ڈوبیں گے۔
شریعت ہمیں پختہ مکان بنانے کی اجازت ضرور دیتی ہے مگر ضرورت کی حد تک مکان اور اس کی سہولیات اتنی کافی ہیں جن کے سہارے زندگی کے سرد و گرم عزت و آبرو سے کٹ سکیں بے جا آسائش و آرام اسراف کے زمرے میں آتا ہے اور اسراف سراسر ہلاکت ہے۔ اسراف پورے معاشرتی نظام کو بھی درہم برہم کرتا ہے۔ دولت کی تقسیم عدم توازن کا شکار ہوتی ہے۔ جس نمود و نمائش پر آپ خوش ہو کر اپنی شان بڑھا رہے ہوتے ہیں' اس نمائشی شان و شوکت کو دیکھ کر بہت سے محروم لوگ حسد و رقابت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب وہ جائز طریقوں سے ان آسائشات کو حاصل نہیں کر سکتے تو ناجائز راستے اپناتے ہیں۔ رشوت خوری ہونے لگتی ہے' چوری' ڈاکہ زنی' لوٹ مار عام ہو جاتی ہے۔ ہمارے آج کے معاشرے میں جو لوٹ کھسوٹ کا عمل عام ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ امراء اپنے مکانات اور اپنے رکھ رکھاؤ کے ذریعے مال و دولت کی بے پناہ نمائش کرتے ہیں جس سے محروم اور غریب لوگوں میں بھی ان چیزوں کو حاصل کرنے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس کے لیے جائز و ناجائز کو پسِ پشت ڈال کر ہر وہ طریقہ اپناتے ہیں کہ بس جس سے دولت کا حصول ہو جائے۔

ہم میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو یہ سطریں پڑھتا ہوگا اور اسے اچھائی اور برائی کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ اسراف اور میانہ روی کے بارے میں معلوم نہ ہو مگر اس کے باوجود ہماری عملی زندگیاں اسلام کے ان عظیم اسباق سے خالی نظر آتی ہیں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ اللہ کے رسول ﷺ بس ذرا سے خفا ہی ہو جاتے تھے تو انہیں اپنی زندگی بے کار لگنے لگتی تھی اور وہ اس بات کی جستجو کرتے تھے جس کی بنا پر حضورؐ خفا ہیں اور اگر حضورؐ کسی بات کے بارے میں منع فرما دیں تو وہ تو صحابہ کرام کے لیے پتھر پر لکیر ہو جاتی تھی۔ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر صحابہ حضورؐ کے فرمان سے بال برابر نہیں ہٹتے تھے۔ ان میں یہ حوصلہ' یہ ہمت صرف اور صرف سچی اور پاک محبت رسول ﷺ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے دل عشق رسول ﷺ کے جذبے سے معمور تھے۔ وہ تو حضور کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کے کان ہر وقت سرگوشی رسول ﷺ سننے کے لیے بھی ہمہ وقت چوکس و تیار رہتے تھے۔ یک جنبش ابرو وہ اپنی جانیں حضور ﷺ پر نچھاور کر دیا کرتے تھے۔

ایک صحابہ حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ تعالیٰ کو غزوہ احد کے کچھ عرصے بعد کفارِ مکہ نے دھوکے دہی سے قید کر لیا۔ انہیں صفوان بن امیہ نے پچاس اونٹوں کے بدلے خرید لیا تاکہ وہ اپنے باپ امیر بن خلف کے بدلے میں انہیں قتل کر سکے۔ جب انہیں شہید کیا جانے لگا تو ابوسفیان نے کہا۔ ''اے زید خدا کی قسم سچ کہنا' کیا تم یہ بات منظور کرتے ہو کہ تمہاری جگہ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا جائے اور تم اپنی جان بچا کر واپس چلے جاؤ اور اپنی بیوی بچوں کے درمیان عیش و عشرت سے رہو۔'' (نعوذ باللہ)

حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان افروز جواب سنیے۔ جنہیں تاریخ نے سنہرے الفاظ سے اپنے سینے پر رقم کیا ہے۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا۔ ''تم میرے قتل کی بات کرتے ہو۔ خدا کی قسم مجھے یہ بات بھی گوارہ نہیں کہ محمد ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر

میں آرام سے رہوں۔'' ابوسفیان یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ قریش کہنے لگے کہ محمد ﷺ کے ساتھی جتنی ان سے محبت کرتے ہیں اس کی نظیر ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ سبحان اللہ لیکن ان ظالموں نے حضرت زیدؓ کو تلواروں اور نیزوں سے چھلنی چھلنی کر کے شہید کر دیا۔ (ابوداؤد)

غزوہ احد میں مسلمان شہداء کی خبریں مدینہ کی گلیوں میں پہنچ رہی ہیں ایسے میں ایک صحابیہ خاتون دیوانہ وار دوڑی دوڑی میدانِ جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ راستے میں کوئی ملا تو اس سے پوچھتی ہیں کہ بھائی مجھے یہ تو بتاؤ ''حضورؐ کیسے ہیں؟'' وہ جواب دیتے ہیں تمہارے والد کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ صبر سے تسبیح پڑھتی ہیں اور بے قراری سے دوبارہ حضورؐ کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ اتنے میں کوئی انہیں بتاتا ہے کہ بی بی تمہارے شوہر بھی شہید ہو گئے ہیں۔ حضور کی یہ غلام بے قرار ہو کر پوچھتی ہے۔ میرے آقا کے بارے میں بتاؤ وہ کیسے ہیں؟ مگر ابھی تو عشق و محبت کے امتحان اور باقی ہیں کوئی بتاتا ہے کہ بی بی تمہارا بھائی اور تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں مجھے میرے حضور کا بتاؤ، وہ کیسے ہیں۔ کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو دوڑی دوڑی احد کے میدان میں جا پہنچتی ہیں۔ سامنے ہی حضور ﷺ کے رُخِ روشن کی زیارت ہو جاتی ہے۔ اس میدان میں ان کے باپ، ان کے شوہر، بیٹے اور بھائی راہِ خدا میں سر کٹائے پڑے ہیں یہ ان کی طرف نہیں جاتیں سیدھا دامنِ مصطفیٰ کی طرف جاتی ہیں۔ حضور کا دامن تھام کر عرض کرتی ہیں ''یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان جب آپؐ زندہ و سلامت ہیں تو مجھ پر کوئی تکلیف اور ہلاکت بھاری نہیں ہے۔''

(سبل الہدیٰ، تاریخ خمیس)

صحابہ کرام کی زندگیاں حضور ﷺ کی محبت سے عبارت تھیں۔ حضورؐ جیسا جیسا فرماتے جاتے تھے ان کی زندگیاں اسی قالب میں ڈھلتی جاتی تھیں۔ آج بس اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے اور اپنی زبان کا محاسبہ کیجیے جو بار بار حضور کو برملا رسول ﷺ سے محبت کرنے والا بتاتی ہے۔ اس سے پوچھیے کہ اے میری زبان کیا تو نے میرے اندر ایسا عمل بھی دیکھا ہے جو محبت رسول کا مظہر ہو۔

یہ شکایت عام سننے کو ملتی ہے کہ ہمیں اسلامی احکامات کے بارے میں علم تو ہے مگر نہیں ہو پاتا، سستی رہتی ہے۔ اسلام کے سچے اور ہدایت یافتہ احکامات پر عمل کرنے کا آسان سا نسخہ ہے اور وہ ہے کہ رسول ﷺ کی سچی محبت کو اپنے دلوں میں بسایئے۔ اس کے بعد ایسا ہوگا کہ ہر عمل کے بعد آپ کو خیال گزرے گا کہ کہیں یہ عمل میرے حضور ﷺ کو ناپسند نہ ہو، کہیں میرا یہ کام سنت کے خلاف نہ ہو جائے۔ حضور ﷺ سے محبت ہی ہماری تمام دنیاوی اور اخروی پریشانیوں سے نجات کا حل ہے۔ حضور ﷺ سے قلبی محبت کا طریقہ اہلِ طریقت کے ہاں کثرت سے درود شریف کا پڑھنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جنت میں میرے سب سے قریب وہ شخص ہوگا جو کثرت سے مجھ پر درود پڑھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ میرے اور آپ کے دل کو عشق رسول ﷺ سے روشن فرمائے، آمین بجاہِ النبی الکریم۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتہ: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II۔ خیابانِ جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے دوستو!
آپ سب کو رضوانہ پرنس کا سلام قبول ہو۔ کہیے گرمی کی اِس شدت میں دلوں کو ٹھنڈک کا خوبصورت احساس دلاتا ہوا یہ ناولٹ نمبر آپ کو اچھا لگ رہا ہے نا۔ ویسے بھی جب یہ پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو رمضان کی آمد آمد ہوگی۔ یہ مقدس مہینہ اپنے اندر صرف روزے اور عبادات ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے ایسے فریضے سمیٹ کر لاتا ہے جس کو ہم لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جس میں سب سے اہم آپ کی زبان آپ کا برتاؤ اور آپ کا اخلاق ہے۔ روزہ رکھ کر اگر آپ کی زبان کسی کے لیے نشتر بن جاتی ہے تو یہ روزہ ایسا ہی ہے جیسے بغیر وضو کے نماز۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اگر آپ کسی انسان کو جاننا چاہتے ہیں تو یہ مت دیکھیں کہ وہ کتنی عبادت کرتا ہے۔ کتنے روزے رکھتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ اس کا اخلاق لوگوں کے ساتھ کیسا ہے۔ اللہ کے زیادہ نزدیک وہ ہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کے بندوں سے حسن سلوک رکھتے ہیں۔ تو میرے پیارے ساتھیو! محبت کے اس پیغام کو لیے ہمارے مہمان یقیناً ہمارے منتظر ہوں گے۔ آیئے چلتے ہیں محبت کی اس ٹھنڈی چھاؤں تلے۔

کھ: ہماری غزالہ عزیز، کراچی سے لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم! امید ہے آپ خیر و عافیت سے ہوں گی۔ کاشی، منزہ کو خلوص بھرا اسلام اور دعا قبول ہو۔ دوشیزہ کو نکھارنے، سنوارنے والے تمام دوشیزہ اسٹاف کی کاوشوں کے لیے پُر خلوص دعائیں حاضر ہیں۔ سب سے پہلے آپ کو دوشیزہ میں خلوصِ دل سے ایک بار پھر خوش آمدید ہے۔ کافی عرصے بعد فون پر آپ کی ہمیشہ کی طرح میٹھے لہجے اور نرم اندازِ تکلم نے دل کو سرشار کر دیا۔ واقعی کچھ لوگ پھولوں کی طرح خوشنما ہونے کے ساتھ نرم و میٹھے لہجے کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ رضوانہ آپی آپ کی دلکش شخصیت بھی مہکے پھولوں کی طرح بے حد خوشنما اور دل پسند سے ہے۔ اب آئی ہیں تو دیر تک ساتھ رہیے گا۔ کاشی کی ہمراہی میں آپ کی دوشیزہ سے محنت ولگن کا اندازہ دوشیزہ کی روز افزہ بڑھتی ہوئی مقبولیت اور بلند ہوتے ادبی گراف بخوبی ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ ترقی کا بلندی کا یہ سفر آگے اور آگے کی جانب گامزن رہے۔ آمین۔ اب دوشیزہ کے مئی کے شمارے پر تبصرہ حاضر

ہے۔ کاشی کے اداریے ”بادشاہ گر۔ مزدور“ کی طرح کاشی کا افسانہ ”روح دیکھی ہے“ اپنے اُچھوتے پن کے ساتھ بہترین تھے۔ کاشی کی ادبی و تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں ویسے بھی اب کسی بھی قسم کے ستائشی الفاظ استعمال کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ امید ہے دیگر رائٹرز اور قارئین بھی میری اس رائے اور سوچ سے اتفاق کرتے ہوں گے۔ ویل ڈن کاشی! کیپ اِٹ اپ۔ دوشیزہ کے تمام سلسلے اچھے اور دلچسپ ہیں۔ لیکن اگر ہر ماہ کسی ایک رائٹر جو صرف دوشیزہ میں لکھنے والی نہ ہو پورے کراچی اور پاکستان سے تعلق رکھتی ہوں کا انٹرویو تعارف کے ساتھ شروع کیا جائے تو اچھا ہوگا۔ یہ صرف ایک تجویز ہے۔ (انشاء اللہ ضرور عمل کریں گے) ماہِ مئی کے گرم مہینے کے تمام افسانے اپنے منتخب و منفرد موضوعات کے حوالے سے بہت اچھے تھے۔ تمام رائٹرز کو مبارکباد۔ انتخابِ خاص میں ”نقشِ پا“ بہترین تخلیق تھی۔ اِمِ مریم کا ناول اچھا جا رہا ہے۔ مریم کا اپنا مخصوص انداز تحریر ہے۔ ویل ڈن مریم!! مستقل سلسلے وار ناول میں چونکہ پڑھتی نہیں ہوں اس لیے رائٹرز سے معذرت! البتہ دونوں ناولٹ اچھے تھے۔ امید اگلے ماہ کا ناولٹ نمبر بھی افسانہ نمبر کی طرح بہترین کاوشوں سے مزین شمارہ ہوگا۔ چونکہ خط اگلے ماہ کے عید نمبر کے افسانے کے ساتھ کو ریئر کرنے سے آدھے گھنٹے پہلے لکھ رہی ہوں۔ اس لیے ماہِ مئی کے دوشیزہ شمارہ پر تفصیلی تبصرے سے قاصر ہوں۔ اس کے لیے میری معذرت قبول فرمائیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گی۔

✉: عید نمبر کے لیے تمہارا افسانہ سب قارئین کے لیے ایک خوب صورت عیدی کی مانند ہے۔ ایسے ہی آتی رہنا پیاری سی لڑکی۔

کھ: ہماری دیرینہ دوست شائستہ عزیز نے بھی آج دوشیزہ کو رونق بخشی ہے۔ اسلام علیکم! امید ہے سب کچھ بخیر ہوگا۔ آپ کو دوشیزہ کی مسندِ ادارت مبارک ہو۔ بہت دنوں بعد دوشیزہ کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ وجہ یہ بنی کہ کافی عرصے بعد دوشیزہ کے ساتھ ”سچی کہانیاں“ بھی موصول ہوا۔ دونوں بروقت کے ساتھ ساتھ نکھار آ گیا ہے ماشاءاللہ۔ دوشیزہ مجھے باقاعدگی سے نہیں مل رہا ہے، اپریل کا شمارہ بھی نہیں مل سکا۔ ”دمحفل“ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آنگن میں بارات بھی اُتر آئی اور شمع حفیظ نے ”میں ہاری“ بھی لکھ ڈالا۔ عنوان پڑھ کر بہت چونکی کہ پچھلے برس جولائی میں، میں نے اسی عنوان سے افسانہ لکھا تھا جو ایوارڈ کا مستحق ٹھہرا تھا سو میں تو یہی

سمجھ رہی تھی کہ میں بھی ہاری ہوں مگر اب پتہ چلا کہ اِدھر تو گئی اور بھی ہارے ہوئے ہیں۔ (شمع بُرا تو نہیں منایا؟) دوشیزہ کے تسلسل سے نہ ملنے کی وجہ سے میں پہلی مرتبہ رفعت سراج کا ناول نہیں پڑھ پا رہی ہوں ورنہ زندگی میں ہمیشہ دل لگا کر انھیں پڑھا، سُنا اور سیکھا ہے۔ اس مرتبہ منی اسکرین کے حوالے سے سجل علی کا انٹرویو پڑھنے کو ملا جو میری پسندیدہ اداکارہ ہیں۔ ڈراموں پر تبصرہ میں صرف ARY کے ڈرامے پر تبصرہ کیوں ہونے لگا ہے؟ ہر چینل کا ڈرامہ تبصرہ کا مستحق ہے۔ محفل میں نگہت غفار نے اطلاع دی ہے کہ نزہت جبیں ضیاء کے بیٹے کی بھی شادی ہوگئی ہے۔ امید ہے وہ جلد احوال نذرِ قارئین کریں گی۔ اب بات افسانوں کی ہوجائے۔ دردانہ نوشین نے اس کڑی گرمی میں خوب صورت ترین عنوان کے ساتھ بہترین افسانہ لکھا ہے۔ عنوان دیکھ کر ہی بدلی سی چھا گئی، رم جھم پھوار برسنے گی۔ پچھلے برس جب دردانہ ایوارڈ کی تقریب میں آئی تھیں تو کئی رائٹرز انھیں اپنے ہاں مدعو کرنا چاہتی تھیں۔ مگر فرزانہ، دردانہ اور دلشاد سمیت سب اپنے طے شدہ شیڈول کے مطابق آئی تھیں اس لئے کتنے ہی دل مسوس کر رہ گئے۔ دردانہ کا کہنا تھا کہ آئندہ کوئی رائٹر ایسا گیٹ توگیدر رکھنا چاہیں تو پہلے سے مطلع کردیں تاکہ رائٹرز اپنی تیاری کے ساتھ آئیں۔ اب میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گی اُمّ مریم کا۔ جس کے لیے اس مرتبہ محفل میں کسی نے جملہ لکھا ہے وہ بہت متوازن لکھتی ہیں نہ ایک حرف کم نہ زیادہ۔ تو واقعی اُن کی یہ تحریر دوشیزہ کے لیے تحفۂ خاص ہے۔ بہت پختہ اور منجھا ہوا اندازِ تحریر ہے اُن کا اور موضوع پر گرفت بھی لاجواب ہے۔ ایسے ہی خیالات میرے احمد سجاد بابر کی تحریر کے لیے بھی ہیں۔ وہ زیادہ تر منفرد موضوعات کے ساتھ آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ اس مرتبہ اُن کی کہانی میں جگہ جگہ شاعری کے تڑکے نے بڑا لطف دیا۔ اب ایک خاص اور بڑا نام نگہت اعظمی، جو کہ شاید اب تک مجھ سے ناراض ہوں مگر میں پہلے ان کی تحریر پر تبصرہ کردوں کہ نگہت کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ روزمرہ کے معاشرتی پہلوؤں اور رویوں کو ضبطِ قلم میں لاتی ہیں اور موضوع کا حق ادا کردیتی ہیں اس مرتبہ انھوں نے واقعی سلگتے موضوع کو چُنا۔ نگہت آپی ناراضگی سرآنکھوں پر۔ پچھلے برس جب آپ کا شکوہ پڑھا تھا تب سے دل بے چین تھا کہ آپ کی ناراضگی کیسے دُور ہو، میرے پاس سے آپ کا نمبر ڈلیٹ ہوگیا تھا۔ کنویں میں بانس ڈال کر آپ کے دو نمبرز ملے مگر دونوں پر رابطہ نہ ہوسکا پتہ نہیں کیا وجہ تھی؟ یہی حال رضیہ مہدی کے نمبرز کا بھی ہے۔ نگہت آپ کے پاس تو میرا نمبر ہوگا۔ آپ ہی رابطہ کرلیں آپ کو چند خفیہ ایٹمی راز سونپنے ہیں!! کاشی، اب سچی کہانیاں ملتا رہے گا ناں؟ مجھے بھی ایک سچی کہانی سپردِ قلم کرنی ہے۔ ماشاءاللہ سچی کہانیاں پر بھی خاصا نکھار آگیا ہے۔ آپ لوگوں کی انتھک محنت ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ سروق سے لے کر کچن کارنر تک۔ تقریبِ ایوارڈ کی کوئی سن گن ہے؟ میرا اپنا جوڑا اِسلا رکھا ہے اور ہماری جوڑی (سیما مناف اور میں) بھی جب ہی منظرِ عام پر آتی ہے۔ خدا آپ سب کو بھی خوشیوں تلے سلامت رکھے۔ آمین سب کو درجہ بدرجہ سلام اور دِلی دعائیں۔

مبارک باد

پیارے قارئین! ہم آپ کے مشکور ہیں۔ آپ کی دعاؤں سے، رخسانہ سہام مرزا کی صحت میں بتدریج بہتری آرہی ہے۔ زیرِ نظر تازہ تصویر اپنے قارئین کی نذر
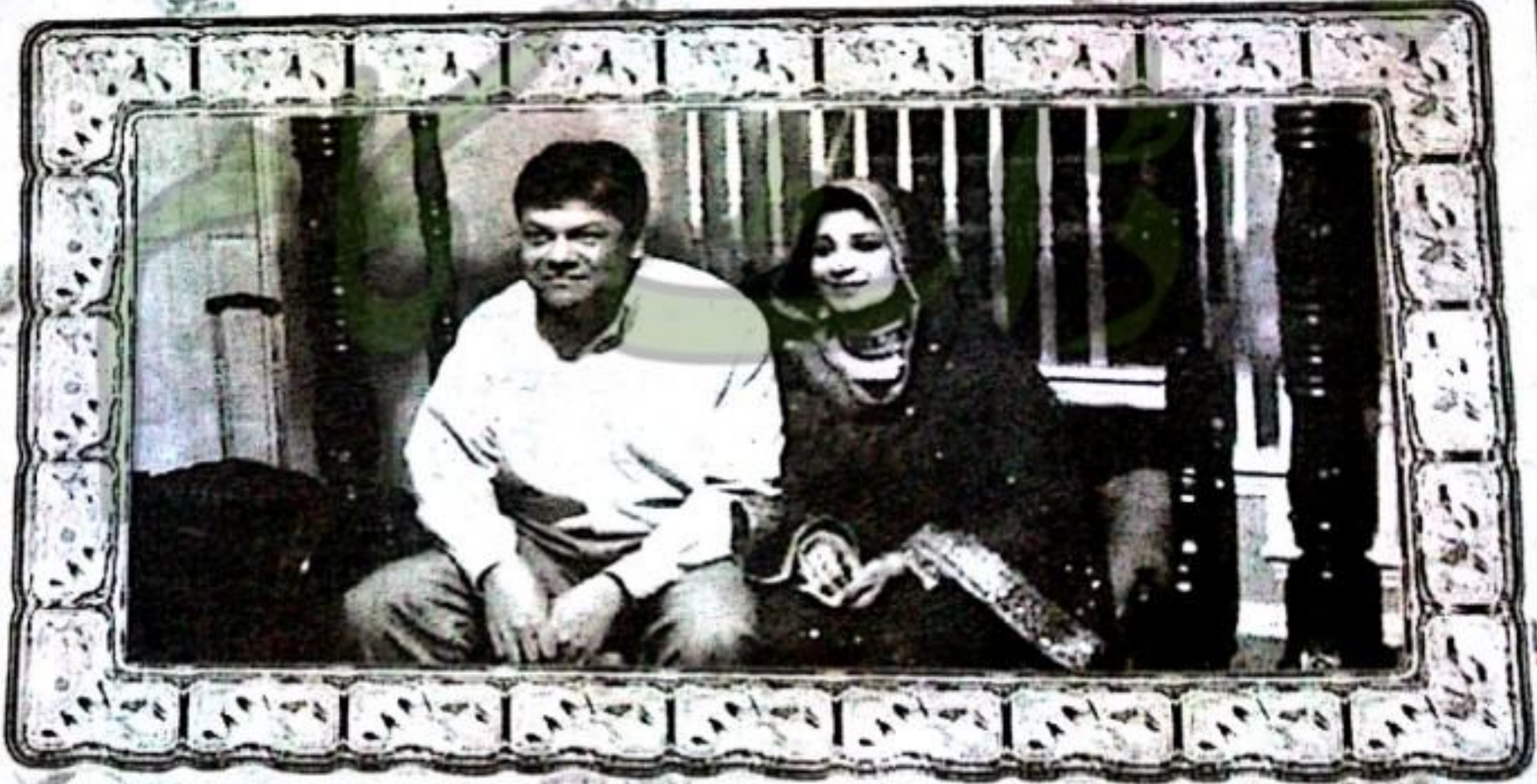
ہماری پیاری بہن تابندہ سہام کو نئی زندگی میں قدم رکھنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد
یہ پُر وقار تقریب سہام مرزا کی بڑی صاحبزادی رعنا سہام کے گھر ڈیلاس، امریکہ میں انجام پائی

✉: پیاری سی دوست خوش آمدید۔ تمہیں اور سیما مناف کو ہم اکثر یاد کرتے رہتے ہیں اور آج تم ہماری محفل میں آ ہی گئیں۔ سیما کیسی ہیں۔ دوشیزہ شدت سے تم لوگوں کی تحریروں کی منتظر ہے۔ اور ہاں دوشیزہ ایوارڈ جلد ہوگا جس میں تم دونوں کی ہٹ جوڑی کی شرکت لازمی ہے۔

✍: ندیا مسعود، کراچی سے اپنے تبصرے کے ساتھ آئی ہیں۔ ڈیر رضوانہ خوش رہیں۔ اِس بار کا دوشیزہ حسب معمول اپنی آب وتاب کے ساتھ ملا۔ ٹائٹل پرکشش تھا۔ سب سے پہلے آپ کی سجائی ہوئی محفل میں جا کر بیٹھے۔ یقین جانیے یہاں بیٹھ کر ہمیشہ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ بہت اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی ڈرائنگ روم میں سب خواتین آپس میں بیٹھی محو گفتگو ہیں۔ مدرڈے پر نظم بھی دل کو چھوگئی۔ اور ماں کے حوالے سے افسانے بھی اثر انگیز تھے۔ تجل علی کا انٹرویو پسند آیا۔ باقی سارے افسانے بھی بہت اچھے تھے لیکن خاص طور پر ''بارش میں گلابی ٹہنی'' کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ یہ کیفیت زندگی میں تقریباً ہر شخص پر آتی ہے لیکن سنبھل جانے میں ہی عافیت ہے۔ دوشیزہ گلستان میں ہائے رے فیس بک اور غلطی نے بے اختیار ہنسا دیا۔ بعداز مرگ بھی بہت مزے کا لکھا۔ یہ دعا شاید ہر دوسرے پاکستانی کے لیے پڑھائی جاتی ہوگی۔ باقی سارے سلسلے بھی اچھے رہے۔

✉: اچھی ندیا! تمہاری یہ بات ہمیں بھی بہت مزے دار لگی کہ ''بعداز مرگ'' شاید ہر دوسرے پاکستانی کے اوپر فٹ بیٹھتی ہے۔ ایسے ہی پیارے تبصرے کے ساتھ آتی رہنا۔

✍: انزا نقوی، کراچی سے لکھتی ہیں۔ بہت پیاری سی رضوانہ آپی۔ اسلام علیکم! 14 مئی یعنی مدرڈے کے حوالے سے شگفتہ شفیق کی نظم بہت دل کو اچھی لگی۔ بہت اچھی منظر کشی کی ہے۔ اپنی نظم میں اور ایک بیٹی کے جذبات واحساسات کی صحیح عکاسی کی ہے جو اپنی ماں کو کھو چکی ہے۔ یہ زندگی کا ایک ایسا سچ ہے جو کہ ایک چاہنے والی اور محبت کرنے والی اولاد یا بیٹی اسے کسی قیمت پر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ وہ غم ہے جو روح میں اس طرح سرائیت کر جاتا ہے اور رچ بس جاتا ہے جو زندگی میں دل سے کبھی نہیں جاتا۔ آپ تو بہت بہادر، سمجھدار اور ذہین ہیں آپ کی امی آپ سے بچھڑی ضرور ہیں مگر ان کی دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی اور وہ آسمان پر رہ کر آپ کو دیکھ کر آپ کی ہر خوشی پر خوش ہوتی ہوں گی۔

ماں وہ ہستی ہے جو ہر وقت دعا دیتی ہے
دعا بگڑی ہوئی تقدیر بنا دیتی ہے
لاکھ منجدھار میں کشتی ہو بچالیتی ہے
ہر کڑے وقت کا آسان بنا دیتی ہے

ناول ''دامِ دل'' رفعت سراج کی وہ تحریر ہے جو معاشرے کی حقیقتوں کو آشکار کرتی ہے اور رشتوں کی نزاکت اور سفاکی کا سحر اس ناول کے کرداروں میں نمایاں دکھایا گیا ہے۔ وہ بہت اچھے انداز میں معاشرے کی کمزوریوں کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ عصمت پروین عظیمی کا افسانہ ''ٹھنڈی چھاؤں'' میں ماں
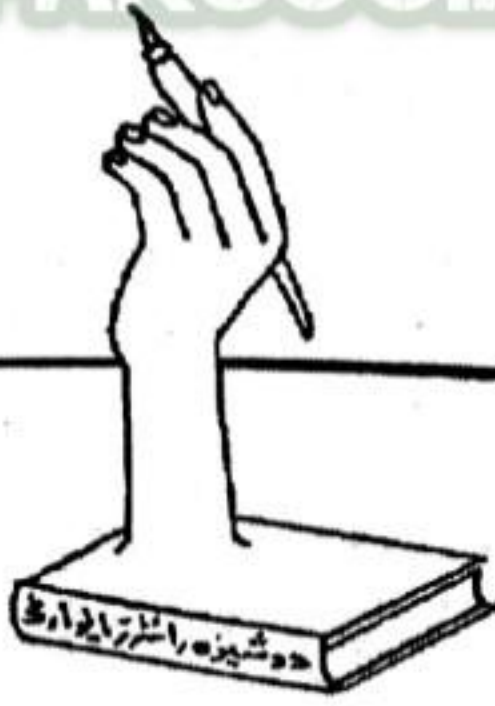
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

مئی 2015 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

"بارش میں گلابی ٹہنی" دردانہ نوشین خان

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ — جون 2015

عنوان: ______________________

قلم کار: ______________________

نام: ______________________

پتا: ______________________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی
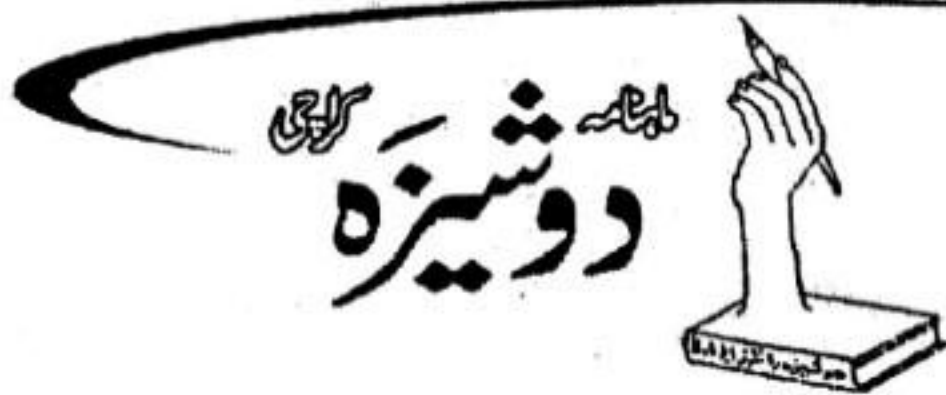
سے ایک مخصوص محبت عقیدتِ اور عظمت کے احساس کو جگایا ہے اور ایک ماں کی لائق اور خدمت گزار اور چاہنے والی بیٹی کا کردار بہت اچھا اس افسانے میں دکھایا ہے۔ جو حالات کی وجہ سے اپنی ماں کی خدمت تو نہ کر سکی لیکن کسی دوسرے کی ماں کو اپنی ماں سمجھ کر وہ فرض بہت خوش اسلوبی سے ادا کر دیا۔ احمد سجاد بابر کا افسانہ ''کربِ آ گہی'' بھی ایک باہر نکلنے والی اور لوگوں کو Face کرنے والی خواتین کیلئے لمحہِ فکر یہ اور عبرت پر مبنی تحریر ہے جب عورت باہر قدم نکالتی ہے تو اس کا رویہ خشک روکھا اور بدتمیزی کے قریب ہونا چاہیے۔ ورنہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں ایک عمدہ اور اچھی تحریر۔ کاشی چوہان کا افسانہ ''روح دیکھی ہے کبھی''، بچپن کی محبت بھی عجیب ہوتی ہے جو مذہب، رنگ نسل کچھ نہیں دیکھتی بس ہو جاتی ہے بہت اچھا افسانہ تھا۔ انتخابِ خاص میں فرخندہ لودھی کا ''نقش پاء'' بھی خاص تحریر کا حامل تھا جو پسند آیا۔ دردانہ نوشین خان کا افسانہ ''بارش میں گلابی ٹہنی'' بھی ایک منفرد تحریر تھی جو پسند آئی۔ واقعی سوال تو یہ ہے کہ محبت کہاں سے ہے پھر یہ جاتی کہاں ہے؟ رنگِ کائنات میں محمد عظمت اللہ کی مزاح پر مبنی تحریر ''بعد از مرگِ ناگہاں'' بہت زبردست تھی جس میں مرحوم کے قریبی دوست نہایت خلوص اور بہت عاجزی سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرا رہے ہیں اور حاضرین با آوازِ بلند آمین کہہ رہے ہیں۔ مرحوم کی زندگی کے تمام واقعات اتنے مزاحیہ اور مزیدار انداز میں بیان کیے ہیں کہ میرا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا اور محمد عظمت اللہ آپ اسی طرح ہنساتے رہیے اپنی تحریر کے ذریعے۔ دوشیزہ گلستان بھی بہت اچھا لگا۔ فرمان الٰہی، اقوال حضرت علیؓ اور لطائف سب ہی کچھ لاجواب تھا۔ ''یہ ہوئی نا بات'' میں سوال کے جواب جو زین العابدین اپنے مخصوص اور برجستہ انداز میں دیتے ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ ''کچن کارنر'' نادیہ طارق کے کھانے لاجواب ہوتے ہیں۔ س سے سوال کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ سجل علی کا انٹرویو اچھا لگا۔ سجل نے بہت کم عرصے میں اپنی کامیاب اداکاری کا لوہا منوالیا۔ ڈاکٹر خرم مشیر ہمیشہ کی طرح بہت اچھے مشورے دیتے ہیں۔ اب کی بالوں کے بارے میں بہت اچھی اور مفید باتیں اور معلومات حاصل ہوئیں۔ یاسمین اقبال سنگھ پورہ لاہور سے جنھوں نے میری غزل پسند کی ان کا میں بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی اور یہ کہوں گی آپ خود بھی بہت اچھی شاعری کرتی ہیں جو مجھے پسند آئی۔ ریحانہ مجاہد کراچی سے انھوں نے بھی میری غزل کو بہت پسند کیا۔ آپ کی حوصلہ افزائی دعائیں۔ محبت پیار اور غزل پسند کرنے پر آپ کی بھی بہت شکر گزار ہوں۔ یونہی آپ سب مجھے اپنی دعاؤں، پیار اور حوصلہ افزائی میں یاد رکھئے اور میری غزلیں پڑھتے رہیے۔ تحسین عابدی کا افسانہ ''تمنا'' بھی بہت عمدہ اور حقیقت سے قریب تر تحریر ہے۔ زیادہ تر لوگ سانولی رنگت والی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے حالانکہ سانولے رنگ میں بہت کشش ہوتی ہے اور نقوش بھی دلکش ہوتے ہیں۔ اِس افسانے کا End اچھا تھا۔ دوشیزہ میگزین کے تمام ممبرز اور مینجمنٹ کو میرا سلام۔ میگزین کی ترقی کے لیے میری بہت ساری دعائیں۔

✉: بہت پیاری انزا! تمہاری شاعری کی طرح تمہارا خط بھی اپنے اندر ایک افسانوی سا رنگ چھپائے ہوئے ہے خاص طور پر ماں کے اوپر تمہارے خیالات بہت اچھے لگے جو جگہ کی کمی کی وجہ سے

ایڈیٹ کرنا پڑے۔ خوش رہو۔

بھ: فصیحہ آصف نے ہمیں ملتان سے یاد کیا ہے۔ ڈیئر رضوانہ آپی! اسلام علیکم! امید ہے کہ مزاج اچھے اور بہترین ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں بھی عافیت میں ہوں۔ پچھلے ماہ آپ کے محبت بھرے حکم پر فٹافٹ خط لکھا اور پوسٹ کر دیا (نئے ایڈریس پہ) پر جانے کیوں نہ ملا آپ کو، آپ کی تعریف میں اس میں بے شمار پل باندھے اور دریا بھی بہائے۔ مگر کیا کہا جائے۔ افسوس ہوا! اس لیے ایک بار پھر امید کا وسیع دامن تھام کر آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہوں گی کہ دوشیزہ ہر ماہ کے شروع کی 2 یا 3 تاریخ کو مل جایا کرے، جس کی عرصۂ دراز سے خواہش ہے۔ اس جانب خصوصی توجہ دیں۔ اب ذرا مئی کے گرما گرم مہینے کے دوشیزہ پر اپنا جاندار و شاندار تبصرہ تحریر کروں۔ سرورق کی دوشیزہ کا رنگا رنگ لباس موسم کی شدت کو کم کرتا محسوس ہوا۔ گو ماڈل زیادہ پسند نہیں آئی مگر اس کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ (خوب صورت آنکھیں میری کمزوری ہیں، جیسا کہ میری آنکھیں دوسروں کی کمزوری ہیں۔ سچ مذاق نہیں) خیر جی افسانہ نمبر کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔ کاشی بھائی کے کاٹ دار مگر حقیقت سے پُر الفاظ معنی خیز تھے۔ اور فکر انگیز بھی۔ اسلامیات کی کلاس کے بعد اس محفل میں آئے جہاں خلوص و محبت کی چاشنی کے ٹوکرے ایک دوسرے پر انڈیلے جاتے ہیں۔ وفا کے پھول دامن میں بھرے جاتے ہیں آپ کی آمد یقیناً بہار کے جھونکے کی مانند لگی، اللہ کرے آپ کے ساتھ ہمارا یہ سفر اور ساتھ خوشگوار گزرے۔ رخ چوہدری، شمع حفیظ، عقیلہ حق، زم نعیم اور سنبل صاحبہ نے بہت تفصیلی اور خوبصورت تبصرے کیے۔ یہ سب اس کی باریک بینی کا نتیجہ ہے۔ عادل حسین، مسز نوید، باجی نگہت غفار کے دلکش اور من موہنے تبصرے بھی محفل میں رنگ جما گئے، کہ وہ اپنے قیمتی اوقات اس محفل کو دیتی ہیں قیمتی وقت مطالعہ کرکے۔ سجل علی سے ملاقات اچھی لگی۔ ڈراموں پر تبصرے ٹھیک تھے۔ رفعت جی، دامِ دل کے ذریعے دامن پکڑ رہی ہیں۔ موضوعات خاصے نازک اور حقیقی تاثر کیے ہوئے ہیں۔ ایک تو آج کل ان ڈبہ پیروں نے خاصا تنگ کر رکھا ہے۔ عقیدے کی ناپختگی ان کی دکان بڑھا رہی ہے، اور عقل و شعور سے عاری یہ اشرف المخلوقات انسان جہالت کی انتہا پر جا پہنچا ہے۔ رفعت جی یہاں پر مردوں کو سزا ضرور دیں ساری تکالیف عورت ہی کیوں بھگتے۔ ''تیرے عشق نچایا'' کی ہر قسط بے حد خوبصورتی سے تخلیق کی بینا جی خاص طور پر منظر نگاری کا سحر، جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کہانی بھی خوبصورت طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے اور تجسس برقرار ہے۔ مصطفیٰ ملک کا صراطِ مستقیم پر آنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ بلال کو بھی شاید نورین کی صورت اپنے گناہوں کی معافی کا صلہ مل جائے۔ اور ہمدردیاں تو ام فروا کے ساتھ ہیں ہی۔ دردانہ نوشین کی تحریر فسوں خیز لگی، جملہ یاد آ گیا، پیار تو پیار ہے، پیار کا عمر سے کیا واسطہ؟ بس اب کیا کہیں سوالیہ نشان ہمارے ذہن میں بھی کلبلا رہا ہے۔ تمنا سمجھ سے بالاتر لگا۔ کیا عامر عقل کا اندھا تو تھا ہی آنکھوں کا بھی اندھا تھا۔ ''مذاق'' سمجھانے والی اچھی تحریر تھی۔ نگہت اعظمی کی آگ کی کہانی تشنگی کا احساس دلا گئی۔ ذرا اور تفصیل ہوتی اور ابرار احمد کو مزید سمجھ آتی۔ ''ٹھنڈی چھاؤں'' رلا گئی، ماں جیسی عظیم ہستی کو لاوارث چھوڑ دینا جہنم کا ایندھن بننے کے برابر

ہے۔ ''فیصلہ'' درست نہیں لگا۔ نکاح کے بعد سونی کا اس طرح کرنا غلط لگا۔ مرتضیٰ کو سمجھا بجھا کر، ماں کو منا کر، کراچی لایا جا سکتا تھا۔ ''اصل سے سود'' میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ عابدہ سبین کے ''کچوان کہے جذبے'' لفظوں کی جادوگری کے سبب پسند آئے۔ ''کرب آگہی'' احمد سجاد بابر، کے حرف حرف سے آگاہی کا درس دے گئے۔ لڑکیوں کے لیے بطورِ خاص یہ افسانہ ان کی عقلِ سلیم کو جانچنے کے لئے کافی موثر ثابت ہوگا۔ نسیم سحر کا ''تمہارا ساتھ چاہیے'' افسانہ نئے موضوع پر تھا پسند آیا۔ ''روح دیکھی ہے کبھی'' ایک منفرد افسانہ تھا۔ ادبی تحریر ''نقشِ پا'' بے حسی کے پردے چاک کرنے والی تحریر تھی۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی جگہ درست ہے۔ رضوانہ جی عیدالفطر نمبر کے لیے ناولٹ پیش خدمت ہے۔ امیدِ واثق ہے کہ جولائی میں جگہ پائے گا۔ آپ کی محبت و تعاون ہمارے رشتے کو اور مضبوط کرے گا۔ اللہ کرے دوشیزہ اسی طرح ترقی کرتا رہے۔ شگفتہ شفیق جی رابطہ توڑنے کی وجہ بتا دیں۔ اور رضوانہ کوثر صاحبہ آپ کی محبتوں کی مشکور ہوں۔ اجازت درکار ہے۔ والسلام وخدا حافظ۔

✉: پیاری سی فصیحہ! ایسے ہی مفصل تبصرے کے ساتھ ہماری محفل کی رونق بڑھایا کرو۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ عید نمبر کے لیے تمہارا ناولٹ مل گیا ہے۔ اب تو تمہاری عید میں مزید چار چاند لگ جائیں گے ہے نا؟

✉: ثمینہ عرفان نے کراچی سے ہمیں یاد کیا ہے۔ ڈیئر پرنس۔ خوش رہو۔ کیسی ہو پرنس۔ یقیناً کراچی کے حالات پر دلگرفتہ ہو گی۔ یہ صحیح ہے کہ کراچی کے حالات پر دل بہت ٹوٹا ہوا ہے۔ نجانے روشنیوں کے اس شہر کو کس کی نظر لگ گئی۔ وہ بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ جب بچوں کو نظر لگتی ہے کہ اپنوں کی نظر لگی ہے۔ تو کچھ یہی حال کراچی کا بھی ہے جس کو اپنوں ہی کی نظر لگی ہے۔ یہ کہہ کر دامن بچانا کہ فلاں واردات میں ''را'' کے ملوث ہونے کے شواہد ملے ہیں۔ سب بکواس ہے۔ آپ لوگ خود نااہل ہو چکے ہیں۔ نہ قانون کی پاسداری ہے۔ صرف پل، انڈر پاس اور بڑے شاپنگ مال بنا کے سمجھتے ہیں کہ صوبے کی ترقی کیلئے بہت کام کر لیے۔ دہشت گردوں کو نہ پکڑیں گے اور نہ دہشت گردی کی روک تھام کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات کیے جائیں گے۔ بس دہشت گردی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کے ورثاء کو چیک دے کر اپنی ہر ذمہ داری سے عہدہ براں ہو جاتے ہیں۔

جانے کل کون سے کہرام کو ہے برپا ہونا
بس اس سوچ میں ہر رات گزر جاتی ہے

اِس طرح سے ''دوشیزہ ڈائجسٹ'' کا سرورق دینے کے لیے آپ لوگوں کی کوئی ''کاروباری'' پالیسی ہو، لیکن ڈائجسٹ پڑھتے پڑھتے سارا سرورق خراب ہو جاتا ہے۔ ہماری والدہ محترمہ ایک لفظ بہت بولتی تھیں۔ ''سجل''، کسی بھی کام یا کسی شے کو اچھی طرح رکھنا۔ لیکن اس سرورق کے ساتھ ڈائجسٹ ''سجل'' سے رہ نہیں پاتا۔ (آپ کی شکایت متعلقہ شعبہ تک پہنچا دی ہے) اس دفعہ تو کمال ہو گیا ڈائجسٹ بہت جلدی مل گیا۔ گرمی کی شدت سے آپ لوگوں کے کام کی رفتار کو بڑھا دیا۔ اسی طرح پورے دن کی مدت کے بعد بتدریج موسم کچھ بہتر ہونے لگتا ہے۔ اور پھر رات آٹھ بجے ٹی وی کے ڈرامے دیکھتے وقت تو ٹھیک ہو چکا ہوتا ہے لیکن اے آر وائی کے خوب صورت پروگرام کے تبصرے میں

''تصویری'' تبصرہ نو بجے کے ڈراموں کا زیادہ ہے۔ معذرت کے ساتھ۔ شگفتہ شفیق کی شاعری ''منافق'' شعبان کھوسہ کی ''محنت کش مزدور کا دن بہت زبردست تھی۔ سنبل علی کا انٹرویو اچھا تھا۔ دردانہ نوشین خان کے افسانے ''بارش میں گلابی ٹہنی'' کے آخر میں پوچھا گیا ہے۔ ''آپ متفق ہیں؟'' کاش کچھ ایسے لکھنے والے بھی پوچھ لیتے جو اپنے افسانوں میں جانے کون سے ''جنت نظیر'' جہانوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ جو آج کل نمو پانے والے معاشرے میں دُور دُور تک نظر نہیں آ رہی ہیں۔ ہاں البتہ افسانہ نگار کی اپنی خیالی دنیا ضرور ہوسکتی ہے۔ تو پھر آخر میں وہ بھی ''آپ متفق نہیں؟ لکھ دیا کریں۔'' بس پرنس! اس دفعہ کے دوشیزہ کا حاصل ''ماں'' سے آنکھوں کو بارش سے جل تھل کر دیا۔ اور اس جل تھل کا زور اس وقت ٹوٹا جب ایفا اپنے شوہر اور اپنے گل گوتھنے انظر کے ساتھ بھری دوپہر میں اچانک آ کر سینے سے لگ گئی اب اجازت اس دفعہ ٹوکن پُر کر کے ساتھ ہی منسلک کر دیا ہے۔ سب کو بہت بہت سلام۔

''اِک تقریبِ ملاقات''

بہت عزیز قارئین!

رائٹرز کے ساتھ تو گیٹ ٹوگیدر ہوتے ہی رہتے ہیں، کیوں نہ اِس موسم میں اپنے دوشیزہ پڑھنے والے قارئین کے ساتھ ایک شام منائی جائے کیونکہ دوشیزہ کی یہ جگمگاہٹ آپ سب پڑھنے والوں کے دم سے ہی تو ہے۔ سو محبتوں اور رابطوں کے اِس بندھن کو مضبوط کرنے کے لیے ہم بہت جلد ''ایک تقریب ملاقات'' کا اہتمام کر رہے ہیں، جس میں ہم اپنے قارئین کے ساتھ چائے پر کچھ لمحات کو یادگار بنائیں گے اور پھر اِس تقریب خاص کی تصویری جھلکیاں بھی دوشیزہ میں شائع کی جائیں گی۔ تو قارئین اِس تقریبِ ملاقات میں شرکت کے لیے فوری طور پر مندرجہ ذیل ٹوکن پُر کر کے ہمیں آج ہی پوسٹ کر دیں۔

نوٹ: دیر سے ملنے والے کوپن تقریب کے دعوت نامے میں شامل نہیں ہوسکیں گے

تقریبِ ملاقات

نام: ____________________

پتا: ____________________

رابطہ نمبر: ____________________

کوپن برائے
جون 2015ء

نوٹ: اپنا کوپن ہمیں فوراً ارسال کریں، ہم آپ کے منتظر ہیں

✉: پیاری سی ثمینہ آپ نے ٹھیک لکھا ہمارا روشنیوں کا شہر جہاں زندگی ہمہ وقت جاگتی رہتی تھی۔ اب عجیب سے خوف اور دہشت میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کراچی میں کیڑے مکوڑے زیادہ ہیں یا دہشت گرد کہ مارے جارہے ہیں۔ لیکن پھر کونے کھدرے سے نکل آتے ہیں۔ اور ہاں اللہ آپ ماں بیٹی کی محبت کو ہمیشہ سلامت رکھے۔

خط: کراچی سے مسز نوید ہاشمی لکھتی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس! اسلام علیکم! دوشیزہ اور سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی میری ممبر شپ ہے۔ تب بھی ہمیں رسالہ دیر سے ملتا ہے۔ 14 مئی کو ہمیں ملا ہے۔ اس وجہ سے دوشیزہ کی محفل میں شامل نہیں ہوسکے۔ نئے لہجے نئی آواز کے لیے دو غزل تحریر کی ہیں۔ پسند آئے تو دوشیزہ میں جگہ دینا پلیز۔

✉: ڈیئر مسز ہاشمی! آپ کے بنا تبصرے کے مختصر سے خط نے مزہ نہیں دیا۔ ہمیشہ کی طرح اطمینان سے آیئے نہ۔ آئندہ پرچہ دیر سے ملنے کی شکایت نہیں ہونے دیں گے۔ خوش!

خط: عادل حسین کراچی سے لکھتے ہیں۔ اسلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ مئی کا دوشیزہ سخت گرمی میں افسانہ نمبر کی صورت جلوہ گر ہوا تو سمجھیں بہار آگئی۔ سب سے پہلے میرے افسانے اور غزل کی اشاعت پر شکریہ۔ لفظوں کی حرمت کاشی بھائی نے خوب سمجھائی ہے بادشاہ گر...... مزدور کی صورت۔ زادِ راہ ہمیشہ ہی دل کے سکون کا سبب بنتا ہے۔ اپنی محفل میں پہنچے تو دل خوش ہوگیا۔ تجل علی سے ملاقات بھی خوب رہی اور اے آر وائی کے ڈراموں پر تبصرہ بھی۔ لائف بوائے اچھا لگا۔ بارش میں گلابی ٹہنی خوب لکھا ہے۔ دردانہ نوشین صاحبہ نے۔ اچھا لگا۔ تحسین عابدی صاحبہ کا تمنا ظاہری شکل وصورت کی وجہ سے ٹھکرائی ہوئی لڑکی کی کہانی، جسے خوب صورتی سے پیش کیا گیا۔ اک ذرا سا مذاق کتنی مشکلات پیدا کرسکتا ہے یہ بات اچھی طرح سمجھ آگئی۔ راحت وفا راجپوت کے مذاق کو پڑھ کر۔ آج کے حالات کے تناظر میں آگ کی کہانی زبردست تحریر تھی۔ نگہت اعظمی صاحبہ کی۔ ویلڈن نگہت جی۔ ٹھنڈی چھاؤں ماں کی محبت میں لکھی گئی۔ عصمت پروین عظمی صاحبہ کی اچھی کوشش۔ محبت اور فرض میں ایک کو چنا مشکل فیصلہ ہوتا ہے۔ اور اگر فرض ماں کا ہو تو یقیناً فیصلہ ماں کے حق میں ہی ہوتا ہے، یہ بات حنا اصغر نے خوب سمجھا دی سب کو۔ اصل سے سود بھی سلمیٰ غزل صاحبہ کی پُراثر تحریر۔ جو رشتوں کی سچائیوں کو خوب صورتی سے پیش کررہی تھی۔ آئزہ (یاں) بھی الماس روحی صاحبہ کی ماں سے محبت کی دلیل۔ احمد سجاد بابر بھائی کی کربِ آگہی زبردست تحریر تھی۔ بالکل حقیقت۔ اندازِ بیاں بھی خوب صورت تھا۔ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ ویری نائس احمد بھائی۔ نسیم سحر کا تمہارا ساتھ چاہیے بھی دلچسپ لگا۔ عائشہ خان کا چمکیلا بکل اچھے موضوع پر لکھا گیا تھا۔ اور لکھا بھی اچھا گیا تھا۔ کاشی بھائی کا روح دیکھی ہے کبھی بھی زبردست رہا۔ ان جذبوں کو زباں مل جاتی تو کیا ہوتا؟ زبردست کاشی بھائی۔ عافیہ رحمت صاحبہ کا بہار آئے گی پڑھ کر کتنے خواب آنکھوں میں چلے آئے۔ کاش ایسا عملی زندگی میں ممکن بنا سکیں ہم سب۔ انتخابِ خاص ہمیشہ کی طرح زبردست اور بعد از مرگِ ناگہاں بھی مزیدار۔ لمحوں نے خطا کی تھی کی یہ قسط بھی خوب رہی اور کچھ ان کہے سے جذبے بھی اچھا تھا۔ عابدہ سبین جی نے رشتوں کی خوبصورتی کو بہت

خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ ناول تینوں ہی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور دلچسپی کو بڑھاتے جارہے ہیں۔ شاعری سب نے بہت اچھی پیش کی۔ باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح خوبصورت چل رہے ہیں۔ میں چاہتے ہوئے بھی کوئی غلطی نہیں نکال سکتا۔ اتنا خوبصورت افسانہ نمبر پیش کرنے پر میری طرف سے آپ سب کو بہت مبارک۔ اللہ یہ محبتیں سلامت رکھے۔

✉: عادل صاحب آپ چاہتے ہوئے بھی کوئی غلطی نہیں نکال سکے۔ آپ کے اِس جملے سے ہماری ساری محنت وصول ہوگئی اور دیکھیے سارے رائٹرز بھی خوش نظر آرہے ہیں۔

ﮫ: لاہور سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری رضوانہ کوثر کی۔ لکھتی ہیں۔ مئی کا افسانہ نمبر خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ دل کو چھو گیا۔ کاشی کا اداریہ بادشاہ گر...... مزدور! اے دن تھا۔ زادِ راہ سے ہوتے ہوئے محبتوں کے طلسم کدے میں آ پہنچے۔ سب سے پہلے تو آٹھ جون کو ہماری رضوانہ پرنس کو سالگرہ کی بہت بہت مبارکباد۔ اس کے بعد پچیس جون کو بہت پیاری لکھاری دوست عقیلہ حق کو بھی جنم دن بہت بہت مبارک ہو۔ رُخ چوہدری، شمع حفیظ، عقیلہ حق، زمر نعیم، سنبل، روبینہ شاہین، ثمینہ عرفان، یاسمین اقبال، عادل حسین، مسز نوید ہاشمی، ریحانہ مجاہد، انزاء نقوی، نگہت غفار، سیما رضا ردا اور تحسین عابدی کے خطوط نے مزہ دیا۔ س سے سوال میں بجل علی کمال کا انٹرویو رہا۔ منی اسکرین میں صرف اے آر وائی کے ہی ڈرامے کیوں؟ اسماء اعوان نے لائف بوائے کی ایک سچا ساتھ زبردست تحریر تھی۔ میں نے بھی اب لائف بوائے شیمپو ہی کا استعمال شروع کردیا ہے۔ رفعت سراج کے ناول دام دل کی چوتھی کڑی نے بھی اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ ایمن اور چمن دونوں بہنیں اپنے سسرال کے مسائل میں گھری ہوئی ہیں۔ بس فرق ہے تو صرف اتنا کہ چمن کے ساتھ ثمر کا رویہ چمن کے آنسو پونچھ دیتا ہے۔ جبکہ ایمن کا شوہر یاور مکمل طور پر اپنے ماں باپ کی ڈگڈگی پر ناچ رہا ہے۔ اللہ جانے ایمن کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ مجھے تو ایمن کی جان خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔ ناول میں ندا نام کے نئے کریکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ اور اسے پڑھتے ہوئے بے ساختہ تنہائیاں کی مرینہ خان کی یاد آجاتی ہے۔ یا اَن کہی کی شہناز شیخ سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا ناول تیرے عشق نچایا میں اُم فرواب بور کرنے لگی ہیں۔ بینا ناول میں کچھ تو تیزی لاؤ۔ بلال حمید اور مصطفیٰ علی لگتا ہے ایک ہی جگہ پر رک گئے ہیں۔ ماہین اس قسط میں بالکل غائب تھی۔ ملک عمار علی اسے ناول سے باہر تو نہیں لے گئے۔ رحمٰن رحیم سدا سائیں میں اُم مریم جم کے لکھ رہی ہیں۔ اب تمام کردار ینگ ٹو اولڈ کردار نبھانے میں جٹ گئے ہیں اور نئی پود اپنا کردار نبھانے کے لیے آگے آرہی ہیں۔ فوزیہ احسان رانا کا ناولٹ لمحوں نے خطا کی تھی اپنی دوسری قسط پر بھی زبردست رہا۔ پوری امید ہے لمحوں نے خطا کی تھی بھرپور کامیابی سمیٹے گا۔ افسانوں میں دردانہ نوشین خان، کاشی چوہان اور نگہت اعظمی کا پلڑا بھاری رہا۔ جبکہ احمد سجاد بابر، الماس روحی، راحت وفا راجپوت، حنا اصغر، عادل حسین اور سلمیٰ غزل نے بھی خوب صورت تخلیقات پیش کیں۔ اس کے علاوہ تحسین عابدی، نسیم سحر، آسیہ رحمت، عصمت پروین عظیمی اور عائشہ خان کے افسانے سو سو رہے۔ انتخاب خاص میں فرخندہ لودھی کا انتخاب نقشِ پا زبردست رہا۔ تو محمد عظمت اللہ نے بعد از مرگ بھی خوب محظوظ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

کیا۔ دوشیزہ میگزین کے تمام سلسلے حسب روایات دلچسپ ترین رہے۔ لیجیے تبصرہ تو ہوا مکمل امید ہے رضوانہ پیاری آپ کو تبصرہ پسند آئے گا۔ میری صحت کے لیے تمام دوستوں سے دعا کی درخواست ہے۔ تبصرے کے اختتام پر منزہ، دانیال، زین، رخسانہ بھابی کو بہت بہت سلام اور دعائیں۔ رضوانہ پرنس، کاشی چوہان اور دفتر کے تمام اسٹاف کو بہت بہت دعائیں۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

بہت عزیز رضوانہ ہمیں تو آپ کی محبت پر حیرت ہو رہی ہے یعنی آپ کو ہماری سالگرہ کی ڈیٹ یاد ہے اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے ہم سب آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ کے تبصرے کا سب ہی کو انتظار رہتا ہے۔

: ریحانہ مجاہد کراچی سے لکھتی ہیں ڈیئر رضوانہ السلام وعلیکم! مئی کا جگمگ کرتا دوشیزہ کا افسانہ نمبر ملا۔ شدید گرمی میں پیار کا جھونکا محسوس ہوا۔ سب سے پہلے دوشیزہ کی محفل میں شامل ہو گئے۔ وہاں بے شمار خطوط میں اپنا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ناول 'دامِ دل' رفعت سراج کی بے مثال تحریر ہے۔ افسانہ 'ٹھنڈی چھاؤں' ماں سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ احمد سجاد بابر کا افسانہ 'کربِ آگہی' فکر انگیز تھا۔ کاشی چوہان کا افسانہ بھی دل کو چھو گیا۔ تحسین عابدی کا تمنا بھی حقیقت پر مبنی تحریر ہے۔ رنگِ کائنات میں عظمت اللہ کی مزاح سے پُرتحریر بہت پسند آئی۔ دردانہ نوشین خان کا افسانہ 'بارش میں گلابی ٹہنی' ایک اچھوتا افسانہ لگا۔ دوشیزہ گلستان، یہ ہوئی نا بات، کچن کارنر، بیوٹی گائیڈ' نئے لہجے نئی آوازیں، یہ مستقل سلسلے تو رسالے کی جان ہیں۔ سب کو بے حد سلام و دعا۔

✉: اچھی ریحانہ! انشاء اللہ ہم دوشیزہ کی جگمگاہٹ بڑھاتے رہیں گے۔ تم لوگوں کی حوصلہ افزائی ہمیں اپنی دوشیزہ کو مزید سجانے سنوارنے کی تحریک دیتی ہے۔

: افشاں رضا اسلام آباد سے رقم طراز ہیں، ڈیئر رضوانہ باجی، دوشیزہ ہمیں ریگولر مل رہا ہے۔ جس دن پوسٹ مین ڈائجسٹ میرے ہاتھوں میں تھماتا ہے تو بہت خوبصورت سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اب تو میرے شوہر اور بیٹے بھی اِس کے کچھ سلسلے کافی شوق سے پڑھنے لگے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ دوشیزہ اب ہمارے گھر میں کافی اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ تفصیلی تبصرہ اِس لیے نہیں لکھ پا رہی ہوں کہ ماشاء اللہ ہمارے یہاں بہت پیارے سے پوتے کی آمد ہوئی ہے۔ بس اِسی وجہ سے پورا ڈائجسٹ پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا۔

✉: پیاری سی افشاں! دوشیزہ اب تمہارے بیٹوں اور میاں جی کو بھی پسند آنے لگا ہے یہ بات ہمیں مزید خوش کر گئی۔ اور ہاں پوتے کی مبارکباد ہم سب کی طرف سے قبول کرو۔ ویسے تم سے ملنے کے بعد کوئی کہہ نہیں سکتا کہ اتنی ینگ اور پیاری سی لڑکی دادی بھی ہو سکتی ہے۔

: کراچی سے شاہانہ احمد خان لکھتی ہیں۔ پیاری رضوانہ جی اور کاشی صاحب! میری جانب سے اتنا خوب صورت افسانہ نمبر نکالنے پر سب سے پہلے مبارکباد قبول کریں۔ مئی کا ٹائٹل اچھا لگا۔ سچ پوچھیں تو موسم کی مناسبت سے ایسے ٹائٹل ڈائریکٹ دل پر اثر کرتے ہیں۔ بادشاہ گر مزدور سے پڑھنا شروع کیا اور دوشیزہ کی محفل میں آ گئی۔ کتنا پیارا شعر لکھا آپ نے۔ ''روز سوچوں میں بیٹھا اکیلی کب غم ہوں

گے دور'' رضوانہ جی! غم اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے جو انسان کے جیتے جی قطعاً ختم نہیں ہوسکتا۔ محفل میں بہار آئی ہوئی تھی۔ سب کے خطوط پسند آئے۔ خاص کر عقیلہ حق کا لیٹر بہت زبردست رہا۔ بجل علی سے ملاقات کمال رہی۔ مزہ آیا۔ بجل علی میری فیورٹ اداکارہ ہے۔ میں ان کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ لائف بوائے کی کہانی بھی بہت اچھی لگی۔ رفعت سراج کا دام دل کمال جا رہا ہے۔ پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ خاص طور پر مجھے فردوس اور ان کے شوہر کا کردار اچھا لگتا ہے۔ افسانوں میں کاشی چوہان کا 'روح دیکھی ہے کبھی' اپنے نام کی طرح منفرد رہا۔ دردانہ نوشین خان کا افسانہ 'بارش میں گلابی ہنسی' بھی خوبصورت ہے۔ نگہت اعظمی، الماس روحی، احمد سجاد بابر، راحت وفا راجپوت، حنا اصغر اور عادل حسین کے افسانے بہت زبردست تھے۔ عابدہ سبین کا ناولٹ 'کچھ ان کہے سے جذبے' بھی شاندار تھے۔ رحمٰن رحیم سدا سائیں میں اُم مریم اپنے کرداروں کو نئے رنگ میں پینٹ کر گئی ہیں۔ ناول پڑھنے میں اب زیادہ مزہ آ رہا ہے۔ ویل ڈن مریم! خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ بینا عالیہ کا 'تیرے عشق نچایا' خوب ناچ رہا ہے۔ مگر کبھی کبھی بوریت بھی ہونے لگتی ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ امید ہے بینا شاید اس ناول کو اب سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انتخاب خاص اور رنگ کائنات زبردست رہے۔ باقی دیگر مستقل سلسلے میں پسند آئے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔ اس تبصرے کے ساتھ ایک افسانہ بھی روانہ کر رہی ہوں۔ امید ہے جلد ہی حوصلہ افزائی کی رسید دے دی جائے گی۔

✉: شاہانہ! آپ نے تبصرہ خوب کیا۔ نئے لوگ محفل میں جب اس طرح دلجمعی سے لکھتے ہیں تو ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد تمہیں حوصلہ افزائی کی رسید دے دی جائے گی۔

ھ: اسلام آباد سے یہ تبصرہ آیا ہے فرح عالم کا! لکھتی ہے۔ پیاری رضوانہ جی دوشیزہ میں خوش آمدید۔ تبصرہ کافی ماہ بعد لکھ رہی ہوں۔ اس لیے آپ کو ویلکم نہیں کر سکی۔ امید ہے آپ میری غیر حاضری کو درگزر کریں گی۔ ویسے تو دوشیزہ اس وقت انتہائی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہے۔ لیکن آپ کی آمد سے لگتا ہے بہار آ گئی ہے۔ محفل میں آپ کا سادہ سا انداز ہمیں بہت پسند آیا۔ مئی کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ خاص کر ماڈل کے کپڑے بہت پسند آئے مع ماڈل۔ کاشی چوہان کے اداریے کی کیا تعریف کریں۔ کاشی بھائی ہمیشہ ہمیں کچھ نیا پڑھنے کو دیتے ہیں۔ زادِ راہ سے ایمان افروز ہوتے ہوئے محفل میں قدم رکھا۔ قدم رکھتے ہی قانونی مشاورت منہ کھولے کھڑی ہوتی ہے۔ سچ میں بہت ڈر لگتا ہے۔ خیر جی کڑا کر کے ہم نے چھلانگ مار ہی دی۔ شمع حفیظ، رخ چوہدری، عقیلہ حق، عادل حسین، زمر نعیم کے تبصرے زبردست تھے۔ مزہ آیا۔ اک تقریب ملاقات کا اشتہار ہمیں بار بار اشتعال دلاتا ہے۔ ٹکٹ کرا کے کراچی جا...... مگر کیا کریں اگر پیروں میں ذمہ داریوں کی بیڑیاں نہ ہوتی تو اس تقریب کے ٹکٹ ہم سب سے پہلے لیتے۔ محفل کے بعد آج کی ہردلعزیز اور کامیاب اداکارہ بجل علی کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آج کل آپ لوگ کیا لائف بوائے کی کمپین چلا رہے ہیں۔ خیر ہمیں کیا ہمیں تو لائف بوائے نے ایک بہت خوبصورت سی کہانی پڑھنے کو دی۔ مزہ آیا۔ رفعت سراج کا ناولٹ 'دام دل' دوشیزہ کی جان ہے۔ چمن اور ثمر کے کردار بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ دوسری طرف

ایمن کی مظلومیت دل دکھاتی ہے۔ ایمن کے ساس سسر کتنے جلاد ہیں۔ اُف توبہ! ان کی باتیں پڑھ کر جھرجھری سی آجاتی ہے۔ واقعی دنیا اچھے اور بُرے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ اللہ ایمن کے حال پر رحم کریں۔ دوسری ناول 'تیرے عشق نچایا میں' بینا عالیہ نے اُم فروا کو بلال حمید سے نجات دلا کر اس کے گھر واپس بھیج دیا ہے۔ پڑھ کر اُم فروا حواسوں پر چھا جاتی ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اور ماہین بھی اپنی یاد خوب دلاتے ہیں۔ اُم مریم کا ناول مجھے پہلی قسط سے ہی پسند ہے۔ مریم کے قلم میں جادو ہے۔ جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ فوزیہ احسان رانا بھی لمحوں سے خوب خطا کرا رہی ہیں۔ ابھی تو ابتداء ہے۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ جب تک کے لیے تبصرہ اُدھار رہا۔ افسانہ نمبر میں ماشاء اللہ افسانوں کی بھرمار تھی۔ جن میں دردانہ نوشین خان کا 'بارش میں گلابی ٹہنی' کاشی چوہان کا 'روح دیکھی ہے کبھی' احمد سجاد بابر کا 'کربِ آگہی' حنا اصغر کا 'فیصلہ' سلمیٰ غزل کا 'اصل سے سود' اور نگہت اعظمی کی 'آگ کی کہانی' یادگار رہے۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی سج دھج کے ساتھ موجود تھے۔ اب مجھے جون کے شمارے کا انتظار ہے۔ جیسے ہی ملا فوراً تبصرہ روانہ کردوں گی۔ رضوانہ جی آپ کو ایک بار پھر خوش آمدید۔

✉: فرح تمہارا تبصرہ تمہاری ہی طرح خوبصورت رہا۔ ہم تمہیں بالکل کوئی سزا نہیں دیں گے۔ بلکہ اپنی محبت کی قید میں عمر قید سنا کر ہمیشہ کے لیے اپنا بنالیں گے۔ تمہیں جون کے شمارے کا انتظار ہے۔ اور ہمیں تمہارے جون کے تبصرے کا۔

ﷺ: رقیہ یوسف نے ہمیں ڈسکہ سے یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔ پیاری باجی میں رسالے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ لیکن لکھنے لکھانے سے بہت دور ہوں۔ اس بار دل چاہا کہ میں اپنے دوشیزہ کے لیے ایک چھوٹا موٹا خط ہی لکھ ڈالوں۔ یہ بھی محبت کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ سچ پوچھیں تو میں فوزیہ احسان رانا کی محبت میں خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے فوزیہ احسان رانا کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ 'لمحوں نے خطا کی تھی' بھی ایک یادگار تحریر ہے۔ فوزیہ جی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کی محفل بہت مزے کی ہوتی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے۔ میں اتنا ڈوب جاتی ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ اُم مریم، عابدہ سبین کی تحریریں مزے کی تھیں۔ رفعت سراج کا ناول پڑھتے ہوئے بڑا مزہ آتا ہے۔ رفعت بات سے بات خوب نکالتی ہیں۔ یہی تو سینئر اور جونیئر کا فرق ہوتا ہے۔ سچی بات ہے اس مقام تک پہنچنے میں رائٹر جانے کتنا لہو کا پانی بناتا ہے۔ ہم تو بس آدھے گھنٹے میں پڑھ کر فیصلے کر لیتے ہیں۔ لیکن لکھنے والا کس فیز سے گزرتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے۔ اس بار افسانے بہت اچھے تھے۔ 'بارش میں گلابی ٹہنی' 'آگ کی کہانی' 'روح دیکھی ہے کبھی' 'امر' 'تمنا' 'مذاق' 'فیصلہ' 'تمہارا ساتھ چاہیے' 'چمکیلا بگل' 'بہار آئے گی' 'اصل سے سود' 'ضربِ آگہی' سب افسانے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ باقی سب سلسلے پڑھ کر بھی بہت مزہ آیا۔ باجی جی امید ہے آپ میرے خط کو ٹوکری کی زینت نہیں بنائیں گی۔

✉: اچھی رقیہ! لو ہم نے تمہارا لیٹر ردی کی ٹوکری کے حوالے نہیں کیا۔ تمہارا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ امید ہے اگلے ماہ تم ہمیں پھر سے خط روانہ کرو گی۔

ﷺ: حنیفہ بیگم، کراچی سے اپنے تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتی ہیں۔ دوشیزہ کا افسانہ نمبر مہینے

کی ابتدائی تاریخ میں موصول ہو گیا تھا۔ ٹائٹل دیکھ کر اچھا لگا۔ پلیز یہ فولڈنگ ٹائٹل کا سلسلہ بند کر دیں۔ سارے رسالے کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ افسانہ نمبر میں اتنے سارے افسانے دیکھ کر دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ افسانوں کی تعداد تو زیادہ تھی مگر دلچسپ افسانے چند ہی تھے۔ جن میں کاشی چوہان، دردانہ نوشین خان، نگہت اعظمی اور احمد سجاد بابر کے افسانے شاندار رہے۔ اس کے علاوہ افسانے موضوع کے حساب سے تو الگ تھے۔ لیکن بہت دلچسپ نہیں۔ ناولٹ دونوں ہی زبردست تھے اور دوشیزہ کے سلسلے وار ناول بھی ہر ماہ اگلی قسط کا انتظار کرواتے ہیں۔ رفعت سراج میری پسندیدہ رائٹرز میں سے ہیں۔ رفعت سراج کا ناول 'دامِ دل' ہر مہینے انتظار کرواتا ہے۔ رفعت سراج کے دیگر ناولوں کی طرح یہ ناول بھی اپنی مثال آپ ہے۔ رفعت کو ہر طرح کے روداد لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ دامِ دل واقعی شاہ کار ناول ہے۔ سجل علی اس بار سے سوال میں موجود تھی۔ سجل علی کی معصومیت بہت بھلی لگتی ہے۔ سجل بلاشبہ آج کی سب سے کامیاب اداکارہ ہے۔ لولی ووڈ، بولی ووڈ، دوشیزہ گلستان، یہ ہوئی نا بات، نفسیاتی اُلجھنیں وغیرہ بہت اچھے سلسلے ہیں۔ اب اجازت چاہوں گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉: حنیفہ جی! سب سے پہلے تو ہمیں یہ بتائیے۔ اب تک آپ کہاں غائب تھیں۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ رفعت سراج تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

✉: شگفتہ شفیق کراچی سے ہنستی مسکراتی آئی ہیں پیاری رضوانہ السلام وعلیکم! کیسی ہیں آپ، اللہ سے اُمید ہے کہ باخیر ہوں گی۔ مئی کا خوبصورت دوشیزہ بے حد پسند آیا۔ آپ کے دوبارہ دوشیزہ فیملی میں شامل ہونے سے بہت پوزیٹو تبدیلیاں آرہی ہیں۔ افسانوں میں سارے ہی اچھے پیارے تھے پر بارش میں گلابی ٹہنی کا جواب نہیں۔ آگ کی کہانی اور روح دیکھی ہے کبھی بھی بہت اچھے لگے۔ رضوانہ ہم نے ایک اچھی سی کامیابی حاصل کی ہے جو آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتے ہیں ہم کو میٹرو ون ادبی فورم اور انڈس ادبی فورم کے زیرِ اہتمام شاعرانہ کاوشوں پر 20 مئی کو انڈس یونیورسٹی میں گولڈ میڈل اور شیلڈ سے نوازا گیا۔ وہاں ہم نے یہ ہی کہا کہ اللہ کے فضل سے محبت اور حوصلہ افزائی جس کو حاصل ہو اس کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے اور ہم کو تو زندگی میں مشکلات اور پریشانیوں کے ساتھ محبت اور ستائشیں بے تحاشا ملی ہیں۔ جس سے میری صلاحیتیں نکھرتی چلی گئیں۔ میں ہمیشہ آپ سب کی محبتوں کی طلب گار رہوں گی۔

✉: پیاری دوست! تمہاری اتنی بڑی کامیابی پر لفظ مبارکباد چھوٹا لگ رہا ہے۔ اللہ تمہیں مزید شہرت کی بلندیوں پر لے جائے اور ہماری بہت پیاری بہادر اور پازیٹو شگفتہ ہمیشہ ایسے ہی خوش اور سلامت رہیے۔

اچھا ساتھیوں اب ہمیں اجازت دیجیے اور ہاں یاد رہے کہ ہمارا اگلا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ عید کی مناسبت سے آپ کے فیورٹ رائٹرز کے افسانے یقیناً آپ کو عید سے پہلے ہی عید کا مزہ دیں گے۔ سویّاں نہ بھولیے گا۔

دعاؤں کی طالب

رضوانہ پرنس

پُر اعتماد اور صلاحیتوں سے مالا مال اداکارہ

یمنیٰ زیدی

ذیشان فراز

☆وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
♥: یمنیٰ زیدی۔
☆گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
♥: دوست مجھے یمنیٰ، یم، بابا مجھے سمو کہتے ہیں جبکہ امی یمنیٰ ہی کہتی ہیں۔
☆وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
♥: کراچی
☆زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟
♥: اسد۔ (Leo)
☆علم کی کتنی دولت کمائی؟
♥: انٹیریئر ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا ہے۔
☆ کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟
♥: تین بہنیں، میرا نمبر تیسرا ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔
☆اداکاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟
♥: بالکل۔
☆: اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟
♥: اگر مینج کیا جائے تو کچھ مشکل نہیں ہوتا۔
☆: کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟
♥: اپنا گھر۔
☆: اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟
♥: دوسروں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ یہ عادت اپنی پسند ہے۔
☆: اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟
♥: بہت جلد غصے میں آجاتی ہوں۔ یہ عادت اپنی سخت ناپسند ہے۔
☆: کون سا کردار ہے جو آپ ادا کرنا چاہتی ہیں؟
♥: ابھی میں نے کیا ہی کیا ہے؟ میں بہت سارے کردار ادا کرنا چاہتی ہوں
☆: اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟
♥: اپنی گاڑی ہے۔
☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟
♥: صبح صبح دل چاہتا ہے اپنے ہاتھ سے سب کے لیے ناشتا بناؤں
☆ دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟
♥: شام اور صبح کا پہر بہت اچھا لگتا ہے۔

☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟

♥: جن کے لیے آپ بہت کچھ کریں اور وہ ریٹرن میں آپ کو اچھے الفاظ بھی نہ دیں تو دکھ ہوتا ہے۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔

♥: عزت، محبت، صحت، شہرت، دولت۔

☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: پانی! خدا کی بہترین تخلیق ہے۔ خدا کی قدرت پہ پیار آتا ہے۔ سمندر نعمت ہے۔

☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟

اور آسمان مجھے بہت پسند ہے۔

☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟

♥: موت سے ڈر نہیں لگتا۔ بس دعا کرتی ہوں خدا سب کو عزت کی موت دے۔

☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥: سو فیصد۔

☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥: امی کے ہاتھ کا کھانا پسند ہے۔

☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کی قائل ہیں یا تدبیر کے؟

♥: جس حد تک ہر لڑکی کو ہونا چاہیے۔

☆: کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟

♥: غصہ بہت آتا ہے مگر کھانا پینا کیوں چھوڑا جائے اس حالت میں؟ یہ تو نری بے وقوفی ہوئی۔

☆: آپ کی نظر میں خدا کی حسین تخلیق کیا ہے؟

♥: پانی...... دیکھنے میں بھی خوبصورت لگتا ہے اور پینے کا بھی اپنا مزہ ہے اور چاند بہت اچھا لگتا ہے

♥: دونوں کی۔

☆: ویک اینڈ کیسے گزارتی ہیں؟

♥: گھر پر...... گھر والوں کے ساتھ۔

☆: شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟

♥: اچانک آمد ہو گئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔

☆: وجہ شہرت کون سا پروگرام بنا؟

♥: 'خوشی ایک روگ' کے کردار نے پہچان دی۔

☆ سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟

♥: جب کوئی تقریب ہو فیملی یا خاندان میں۔

☆ آپ کی نظر میں بہترین تحفہ کیا ہے؟

♥: میری امی کی نصیحتیں۔

☆ محبت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

♥: ہر شخص کا اپنی محبت کا اظہار مختلف ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ کچھ چیزوں میں پرائیویسی اچھی ہوتی ہے۔

☆ ہمارے معاشرے کی کوئی اچھی اور بری بات؟

♥: ہمارے یہاں قانون کی پابندی نہیں ہے۔ جس دن ہم قانون کی پابندی کرنے لگیں گے اُسی دن سے ہمارا شمار ترقی یافتہ قوموں میں ہوگا۔

☆ بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟

♥: ڈانس، ہلہ گلہ (اگر گھر میں اکیلی ہوتی ہوں تو......)

☆ شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟

♥: دونوں! بالکل۔

☆: کیا آپ اچھے راز داں ہیں؟

♥: سو فیصد۔

☆: عام لوگوں سے ایک اداکار کی زندگی کتنی مختلف ہوتی ہے؟

♥: کچھ لوگ اداکار بن کر دوہری زندگی گزارنے لگتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ عام لوگوں اور اداکار کی زندگی زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔

☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔

☆: "ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا" کس حد تک عمل کرتے ہیں؟

♥: جس حد تک ممکن ہو سکے۔

☆: کس ملک کی شہریت لینا چاہتے ہیں؟

♥: کسی کی نہیں۔ مجھے پاکستان بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بہت محبّ وطن ہوں۔ بس یہی دعا کرتی ہوں کہ ہمارے ملک کے حالات جلد اچھے ہو جائیں۔

☆: زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟

♥: زندگی کبھی بری نہیں لگتی۔ زندگی بہت حسین ہوتی ہے۔

☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟

♥: عادت۔

☆: انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی کس حد تک ہے؟

♥: کچھ خیال نہیں۔ لیکن روزانہ چیک ضرور کرتی ہوں۔

☆: کون سا چینل شوق سے دیکھتی ہیں؟

♥: Discovery اور کوکنگ چینلز شوق سے دیکھتی ہوں۔

☆: کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش مند ہیں؟

♥: مرزا اسد اللہ خان غالب۔

☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟

♥: ڈائلٹ، سیل فون اور گاڑی۔

☆: کون سی ڈش بہت اچھی بنا لیتی ہیں؟

♥: آلو گوبھی اور آلو بینگن بہت پسند ہیں اس لیے بہت اچھا پکاتی ہوں۔ بریانی بھی اچھی پکا لیتی ہوں۔ مگر سبزی کا اپنا ہی مزا ہے۔

☆ کون سا تہوار شوق سے مناتے ہیں؟

♥: دونوں عیدیں اور ویلنٹائن ڈے۔

☆ لباس میں کیا پسند ہے؟

♥: شلوار قمیض۔ ویسے تو ہر طرح کی ڈریسنگ کرتی ہوں۔

☆ اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟

♥: سارے نظام ٹھیک کر دوں گی۔

☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گے؟

♥: اپنے وطن سے پیار کریں اور ہمیشہ محب وطن رہیں۔

☆☆......☆☆☆

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

اے آر وائی ڈیجیٹل اور اے آر وائی زندگی سے اے آر وائی اس دفعہ دکھا رہا ہے سیریل 'میرے درد کی تجھے کیا خبر' اور سوپ 'راجہ اندر'۔ سیریل 'میرے درد کی تجھے کیا خبر' کی کہانی کچھ یوں ہے ذرش جس کے باپ کا انتقال اُس کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ مگر یہ ایک خوشحال گھرانہ ہے۔ ذرش اور ارم کی پسند کرتی ہے۔ عمران اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کے والد ملک سے باہر ہیں۔ ذرش سے ایک غلطی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اُس کے اپنے بھی اُس کی اس غلطی کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔ جس میں اس کا منگیتر عمران (جو اس کا چچازاد بھی ہے) شامل ہے۔ نجمہ بیگم جو اپنے بیٹے اشعر کے لیے ذرش کو اپنی بہو

سیریل 'میرے درد کی تجھے کیا خبر' میں حسن احمد، رُباب ہاشم اور احسن خان

ماں ایک ڈرپوک خاتون ہیں اور بہت احتیاط سے زندگی گزارنے کی قائل ہیں۔ ذرش کی والدہ کی سہیلی نجمہ بیگم بہت محبت کرنے والی خاتون ہیں مگر ذرش انہیں بالکل پسند نہیں کرتی، جبکہ نجمہ بیگم اپنے بیٹے اشعر کا رشتہ ذرش کے لیے دیتی ہیں۔ ذرش سادہ لوح اور محبت کرنے والی لڑکی اور اس کا رشتہ اس کے کزن عمران سے طے ہو چکا ہے۔ ذرش عمران کو بنانا چاہتی تھیں۔ وہ بھی ذرش سے ناراض ہو گئی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ذرش سے ایسی کیا غلطی ہو گئی جس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس سیریل کو تحریر کیا ہے۔ رُخسانہ نگار نے جبکہ ہدایت کار رحمید بھٹی ہیں۔ سیریل کے فنکاروں میں رُباب ہاشم، احسن خان، حسن احمد، فرح شاہ، روبینہ اشرف، عائشہ خان، حسن نازی، منزہ وقاص، شیم ہلالی، حمیرا

زین، احمد زیب اور اکرم عباسی قابل ذکر ہیں۔
'میرے درد کی تجھے کیا خبر' ہر ہفتے کی رات 8 بجے اے آر وائی ڈیجیٹل سے دکھائی جارہی ہے۔
دوسری خوبصورت ڈرامہ سیریز 'بھابی جی گھر پر ہیں' اے آر وائی زندگی سے دکھائی جارہی ہے۔ اس کی کہانی دو پڑوسیوں کی آپس کی تکرار پر مبنی ہے۔

سیریل 'راجہ اِندر' میں راحما علی

اس کے فنکاروں میں سمیہ، ٹنڈو، گوہر، شلپا منڈی اور آصف شیخ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سیریز اے آر وائی زندگی سے پیر سے لے کر جمعہ تک روزانہ رات 8 بجے دکھائی جائے گی۔
سوپ 'بندش' ایک ایسی معصوم لڑکی کی کہانی ہے جو دنیا کی رسم ورواج کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اس سوپ کے فنکاروں میں تسن تاجوانی، مکھی، راہی ٹنڈن اور روحانہ خان قابل ذکر ہیں۔ سوپ 'بندش' پیر سے لے کر جمعہ تک اے آر وائی زندگی سے رات 8:30 بجے دکھایا جائے گا۔ سوپ 'عاشقی' پیار کی ایک کہانی، جہاں ہر خود اپنی منزل کی تلاش میں ہے۔ اس کے ہدایت کار مصطفیٰ سوکی ڈوگن ہیں، جبکہ اسے تحریر کیا ہے فلز نے۔ اس کے فنکاروں میں سرکن، نیل پری، فاطمہ، نسیلن یل ڈن شامل ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک رات 9:30 بجے اے آر وائی زندگی سے دکھایا جائے گا۔
پروگرام 'لیکر کارو کے' یہ موسیقی سے وابستہ شو ہے، جس میں گلوکار مختلف واقعات کے سامنے حالات کا مقابلہ کریں گے۔ اس کے ہوسٹ کریشن ہیں۔ یہ پروگرام ہفتہ اور اتوار کی رات 8 بجے دکھایا جائے گا۔
سیریز 'بھابی جی گھر پر ہیں' سوپ 'بندش' سوپ 'عاشقی' کامیڈی شو 'دی گریٹ فیملی ڈرامہ' 'لیکر کارو کے' یہ تمام پروگرام ARY زندگی سے دکھائے جائیں گے۔
اے آر وائی زندگی سے سوپ 'راجہ اندر' کو عوام بہت پسند کررہے ہیں۔ اس کی کہانی کا ٹریک ذکی صاحب کے خاندان کے گرد گھومتا ہے۔ ان کی بیگم نور جہاں کے 4 بچے ہیں۔ مزاج ان کے بیٹوں کے بہت خراب ہیں اور مزاج میں غرور کی انتہا پائی جاتی ہے۔ جبکہ بیٹیوں کو اُف تک کرنے کی اجازت نہیں۔ اسے تحریر کیا ہے قرۃ العین نے جبکہ ہدایت کار نین

سیریل 'راجہ اِندر' میں ردا اصفہانی اور فائق خان

منیار ہیں یہ خوبصورت سوپ ARY زندگی سے پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ رات 9 بجے دکھایا جارہا ہے۔ اس کے فنکاروں میں ریحام علی، شامین خان، فائق خان، عدنان جیلانی، سلمیٰ ظفر، شہزاد رضا، پروین اکبر اور ناہید شبیر قابل ذکر ہیں۔

☆☆......☆☆

Life Buoy... میرا سپنا، سچ ہوا

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں
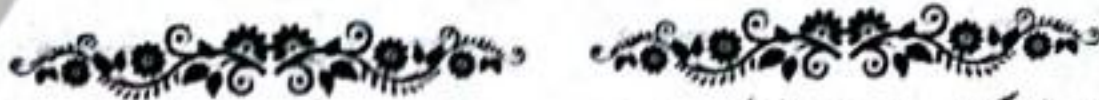
آج میں از مینہ حسین آکسفورڈ یونیورسٹی کی اسکالر شپ تقریب میں بیسٹ ففٹی اسٹوڈنٹس کی Seats پر بیٹھی ہوں۔ چند ہی لمحوں میں، میں آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو جاؤں گی اور اپنے پاکستان کی کسی بھی اہم پوسٹ پر وطن واپسی پر اپلائی کروں گی اور انشاء اللہ کوئی بھی 'اپ گریڈ' آفیسر کا رینک کمرے کے باہر میرا نام نمایاں کرنے کا سبب ہوگا۔

مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے۔ وہ بڑا سارا صحن...... جس میں بادشاہی دادی، پوری روایات کی امین بنی بیٹھی ہوتی تھیں اور میری امی ہمیشہ سے لائف بوائے شیمپو سے میرے بال دھو کر میرے بالوں کے تمام مسائل حل کیا کرتی تھیں۔ لائف بوائے شیمپو ہی کی بدولت میرے بالوں کی چمک اور صحت مندی قائم ہے، جو میری شاندار کامیابی میں بھی معاون ثابت ہوئی۔ وقت نے آواز دی ہے...... مجھے تھوڑا سا اپنے بچپن میں جانے دیں۔

☆......☆
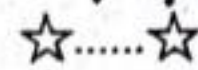
''ارے اناںبی! ہمارے ہاں تو یہ ہوتا تھا کہ اِدھر بچی نے قرآن ختم کیا اور اُدھر اُس کی نشرہ کی تیاری شروع۔ بھیا رے، ایسا بھاری چٹا پٹی کا غرارہ سلتا تھا کہ جس کی مثال نئی نہیں ملتی تھی۔'' بادشاہی دادی نے چاندی کے پاندان کا ڈھکن الٹا اور گیلے کپڑے میں بندھے پان کے ٹکڑے نکال کر کتھا چونا لگانا شروع کیا۔ پان لگا کر طشتری میں رکھے اور سروتے سے چھالیہ کاٹنے لگیں۔

''دادی اماں ہمیں بھی چھالی دیں۔ ہم بھی کھائیں گے۔'' پاس ہی سیپارے کو بند کرتی نوینہ نے، پوری توجہ دادی اماں کے پاندان پر لگادی۔

''ارے بٹیا! سیپارہ پڑھو، قرآن پڑھتے وقت کچھ نہیں کھاتے۔'' اناںبی سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''اے ہاں تو اور کیا۔ بچی تو سیپارہ پڑھ لے۔ نشرہ پہ تجھے نیا پاندان لا کر دوں گی۔'' بادشاہی دادی نے چٹا چٹ کتھا چونا انگلی کی پوروں سے چاٹ کر کہا تھا۔

''دادی بس ایک دانہ۔''

اُس نے کچھ ایسی معصومیت سے کہا کہ دادی کا دل محبت سے جوش مارنے لگا۔

''اے اناںبی دے دو نا، ایک دانہ۔ اللہ تو ذرہ نواز ہے۔ بخشنے والی ذات بھی۔ اللہ رکھے سیانی ہوگی تو خود ہی سمجھ جائے گی۔''

یوں دو دانے نوینہ کو بھی مل گئے اور وہ بھی دادی کے انداز میں چھالیہ سے کٹر کٹر کرنے لگی۔ اناںبی کو غصہ تو آیا تھا، مگر جی مسوس کر رہ گئیں۔ ان کی اچٹتی سی نظر مجھ پر پڑی۔ میں ہمیشہ کی طرح کمرے کے اندر کھڑی تھی۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔

''ہونہہ زبان موٹی ہو جائے گی نا پھر پتا چلے گا۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی دل میں بولتی پھر سے سیپارہ کھول کر سبق یاد کرانے لگیں۔

اس سمے میرا بھی کتنا دل چاہتا تھا کہ کاش میں بھی منہ میں دو دانے چھالیہ کے لے کر نوینہ کی طرح کٹر کٹر کرتی،

اس ذائقے کا مزا اٹھاؤں۔ اپنے سر پر لگی تارا میرا کے تیل اور مکھن کے پیسٹ کو محسوس کر کے میں دل مسوس کر رہ گئی۔ میرے بال ہی نہیں بڑھتے تھے۔ حالانکہ نو سال کی عمر میں تو بچوں کی اِدھر ٹنڈ ہوئی اُدھر بالوں کی گھاس نے سر پر اندھیرا ڈال دیا۔ میں بس اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ گئی۔ مجھے یاد ہے اس تیل اور مکھن سے بھی میری جان لائف بوائے شیمپو ہی نے چھڑائی تھی۔ کیونکہ لائف بوائے شیمپو فقط شیمپو ہی نہیں بلکہ بالوں کے مسائل کا علاج بھی ہے۔

☆......☆

اُس دن پھر سے انا بی کے آنے پر محفل کا سا سماں تھا۔

''اے انا بی۔ بڑی پیاری آواز ہے تمہاری۔ اے ذرا وہ گانا تو سنا دو جو تم نے اس دن سنایا تھا۔ ہمارا بھی زمانہ تھا۔ بڑے بڑے گیت ٹھسے سے گاتے تھے۔ سچی، کوئی بارات، شادی ہمارے گائے بنا بے رونق ہی رہتی تھی۔'' بادشاہی دادی انا بی کو گانے کے لیے اکساتی، اپنے زمانے میں کھو سی گئیں۔

''دبس ذرا چائے پی لوں، پھر سناتی ہوں۔'' نومینہ پڑھ کر جا چکی تھی اور انا بی اب آزاد تھیں۔ وہ مجھے پاس بٹھائے ہوئے تھیں۔ بادشاہی دادی کا موڈ کچھ بہتر تھا۔ اس لیے فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا تھا۔

''آج وہ والا سناؤں گی، جو ہماری حیدر آبادی پڑوسن کے ہاں بیاہ شادی میں گایا جاتا تھا۔'' انا بی بھی ترنگ میں آ گئیں۔

''اے دلہن! جلدی سے باہر آؤ۔''

ساس کی آواز پر لبیک کہتی۔ سفینہ بھی خوشگوار موڈ میں آ کر بیٹھ گئیں اور انا بی نے اپنی لوچ دار آواز میں گانا شروع کیا۔

دھوم گھر گھر مچی

میرے مخدوم کی......

امیر خسرو کا گیت ختم کر کے انا بی ذرا کی ذرا سانس لینے کو رکیں تو بادشاہی متاثر ہو کر بول اُٹھیں۔

''بھیا رے، انا بی! بھئی اب آواز میں اتنا دم ہے تو جوانی میں کیا عالم ہو گا۔'' بڑی بی آواز کے سحر میں کھو سی گئی تھیں۔

انا بی خوشی خوشی تعریف بٹور رہی تھیں۔ ''دنعتیں، گانے، قوالی سب گاتی تھی میں۔ وہ جو عشرت کی ساس تھیں۔ اللہ بخشے، ہر جمعرات کو قوالی سنتی تھیں مجھ سے۔''

''انا بی، اب کی میلاد آپ ہی پڑھنا ہمارے ہاں۔'' سفینہ نے پتے کی بات کی تھی۔

''اور کیا میرے منہ کی بات چھین لی۔ جئے آج کل تو کیسی کیسی میلاد والیاں آ جاتی ہیں۔ دوپٹہ نہ اوڑھیں تو آواز سے مرد لگیں۔'' بادشاہی دادی کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔ ''اے میں تو کہتی ہوں۔ یہ تو نبی کا ذکر، نبی کی تعریف ہے۔ جتنی خوب صورت آواز ہو، اتنا ہی اچھا لگے ہے۔'' دادی نے رسان سے بولتے ہوئے تائیدی نظروں سے بہو کی جانب دیکھا تھا۔

''بالکل، تو بس انا بی آپ ہی ہمارے ہاں اب کے میلاد پڑھیں گی۔ ارے ہاں، آپ ہدیہ کیا لیں گی؟'' سفینہ نے اہم بات پوچھی تھی۔

''اے بی بی آپ جو دیں گی رکھ لوں گی۔ بھلا اس محفل کا دام ہوتا ہے یہ تو آج کل عورتوں نے دھندا بنا لیا ہے۔ اللہ توبہ، توبہ استغفار۔ میں تو بھئی دل سے نبی کا میلاد پڑھتی ہوں۔ کوئی دے دے تو ٹھیک، ورنہ کوئی بات نہیں۔ سرکار کی محبت میں خدا دال دلیے کا آسرا کر دیتا ہے، بہت ہے بھئی۔'' اتنا کہتے کہتے انا بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

☆......☆

''اے دلہن میرا خیال ہے علی شیر کی بات اس ماہ پکی کر دیتے ہیں۔ ذکن (ذکیہ) بھی رات دن تقاضا کر رہی ہے۔ تم کہو کیا کہتی ہو۔'' بیسنی پراٹھوں کے لیے آئے ہوئے بیسن کو چھان پھٹک کر رکھتی، سفینہ کے ہاتھ رُک سے گئے تھے۔

''اماں! ذکن خالہ کی انارکلی ہی ملی، آپ کو علی شیر کے لیے۔ میں اس معاملے میں بالکل کچھ نہیں بولوں گی۔ آپ علی شیر سے بات کیوں نہیں کر رہیں جس نے زندگی گزارنا ہے۔ اس کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔'' سفینہ کو اس موضوع پر ہمیشہ کی طرح اختلاف تھا۔

نوشابہ کو اپنی خوب صورتی پر ہمیشہ سے ناز تھا اور علی شیر ماشاءاللہ اب فوج میں میجر ہو گیا تھا۔ سفینہ نے شادی کے بعد دیور سے بھائیوں کی طرح محبت کی تھی۔ ساس کے جذباتی فیصلوں پر جز بز ہونا فطری بات تھی۔

''اے وہ کیا اعتراض کرے گا۔ میں کہتی ہوں اگر تمہارا کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔ مجھے علی شیر پہ پورا بھروسہ ہے۔ سیدھا بچہ ہے میرا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ علی شیر واقعی سیدھا سا ہے مگر نوشابہ سیدھی نہیں ہے۔ بہت تیز طرار ہے وہ۔ آپ کیسے آنکھوں دیکھی مکھی نگل سکتی ہیں۔''

''اے اپنے باوا کے گھر میں سب ہی تیز ہوتے ہیں۔ کیا تم گونگی تھیں۔''

''اماں، اتنا تیز بھی کوئی نہیں ہوتا۔'' سفینہ کلس کر رہ گئی تھیں۔

''دادی اماں! چاچو کی شادی میں کتنا مزا آئے گا۔'' نوبینہ اور میرے پلّے جو پڑا ہم اپنی دانست میں تالیاں بجاتی، دادی کی گود میں چڑھ گئیں۔ اتنے میں دروازہ بج اٹھا۔

''دلہن دیکھو ذرا کون آ گیا، دن چڑھے۔'' سفینہ دروازہ کھولنے گئی تو سامنے علی شیر بیگ لیے کھڑا تھا۔

''السلام علیکم من اہل القبور۔'' علی شیر شوخی سے کہتا ہوا بیگ ایک طرف رکھتا ماں کے آگے سر جھکائے کھڑا تھا۔ انہوں نے سر پر پیار دیا اور ایک ہلکی سی چپت بھی لگائی۔

''جگ جگ جیو اور پھر بدمعاشی!! کیا تُو نے قبرستان میں پیر رکھا ہے۔ جو مُردوں کو سلام کر رہا ہے۔''

''ارے اماں جان، اتنا سناٹا دیکھ کر بولا تھا۔''

نوبینہ چاچو کی گود میں چڑھ گئی۔ وہ ہر کام میں دو قدم آگے تھی۔ مجھے آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی تھی۔ ''چاچو ہمارے لیے کیا لائے؟''

''ارے بٹیا اِتّی دور سے آیا ہے۔ ذرا چھری تلے دم تو لینے دے چاچا کو۔''

''بھئی اِس بیگ میں بہت بڑی گڑیا ہے تم دونوں لیے، لیکن میں تھوڑی دیر بعد خود نکال کر دوں گا۔'' علی شیر نے دونوں بھتیجیوں کو تسلی دی۔

''تیرے سناٹے بھی ختم کرنے کی سوچ رہی ہوں۔ اب کی رمضان، تجھے بھی بڑی ساری گڑیا سے باندھ دوں گی۔'' بادشاہی بیگم مسکراتے ہوئے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتی بولی تھیں۔

''جی اماں۔ کیا مطلب؟'' وہ ہکلایا۔

''فریش ہو جاؤ۔ مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔'' سفینہ اس کے کپڑے باتھ روم میں ٹانگ آئی تھیں۔

علی شیر نہ سمجھتے ہوئے اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

علی شیر کے جاتے ہی دروازہ پھر سے دھڑا دھڑ بجنے لگا۔

''اے دلہن! دیکھو تو ذرا کون کواڑ توڑے چلا جا رہا ہے۔ بھیا بیل نظر نہیں آتی یا ڈرتے ہیں بیل بجانے سے لوگ۔ اے رکو! کون ہے خدائی فوجدار۔ بھیا رے بہت ہی ظالم ہے۔ جو بھی ہے۔''

سفینہ بیگم دروازے پر جا چکی تھیں۔ واپسی پر اور لائف بوائے شیمپو کی اسکالرشپ اسکیم پروموٹ کرنے والی دو نازک نازک لڑکیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔

''اسلام وعلیکم!'' جھرنے جیسی ایک آواز میں دونوں نے بادشاہی بیگم کو سلام کیا۔

''وعلیکم سلام! ارے یہ تو بتاؤ بھئو۔ کیا تم جنگل بیابانوں سے آ رہی ہو! مار تیرے دروازے کو پیٹ پیٹ کر کان پھاڑ دیے۔''

بڑی بی نے کلس کر بھڑاس نکالی۔ ایسی آوازیں اُن کی سماعت پر بار جو تھیں۔

''سوری! غلطی ہو گئی۔ لیجیے ہم غلطی کا مداوا بھی کر دیتے ہیں۔ نیلم! آنٹی کے لیے الگ سے دو لائف بوائے شیمپو کے ساشے ہماری طرف سے گفٹ کرو۔''

''اوکے میڈم!'' نیلم نے پھرتی سے اپنے بیگ سے دو ساشے بادشاہی بیگم کو پیش کیے۔

''اے بی بی! ہٹاؤ پرے انہیں۔ میں کہاں شیمپو استعمال کروں ہوں۔ اس بڑھاپے میں یہ چاندی چمکا کر کسے دکھاؤں گی۔ اللہ بخشے تمہارے انکل زندہ ہوتے تو اور بات تھی۔''

بادشاہی بیگم دور خلاؤں میں گھورنے لگی تھیں۔

''ارے اماں! رکھ لیں۔ کیوں بچیوں کا دل توڑتی ہیں۔'' سفینہ نے رسانیت سے کہا۔

''آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے ٹھنڈا لے کر آتی ہوں۔'' سفینہ انہیں بٹھا کر شربت بنا کر لے آئی۔

''آنٹی ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا، اور نہ ہی ہمیں گھر میں بیٹھنے کی پرمیشن ہے۔ پلیز آپ اب ہماری بات سن لیں۔''

''اب میں مطمئن ہوں۔ اتنی جھلساتی گرمی میں گھر گھر گھوم رہی ہو۔ اللہ معاف کرے۔ ٹھنڈا پوچھنا تو میرا فرض تھا۔ اب بتاؤ۔ کیا اسکیم ہے۔''

''آپ یہ لائف بوائے شیمپو کی کِٹ لیجیے۔ اس میں دو بڑی بوتلیں لینے پر آپ کوپن بھریں گی اور اس کے ساتھ یہ لائف بوائے شیمپو کے پانچ ساشے فری ہیں۔''

اگر آپ کا نام اسکالرشپ قرعہ اندازی میں آ جاتا ہے تو آپ کے بچے کے تعلیمی اخراجات ہائیر کلاس تک، لائف بوائے شیمپو، یونی لیور کمپنی برداشت کرے گی۔"

"اے بی بی! بات سنو۔ جو کام کرنے آئی ہو وہ کرو۔ شیمپو بیچنے آئی ہو۔ بیچو اور جاؤ۔ یہ کیا اول فول کہہ رہی ہو۔ تم لوگوں کے لائے ہوئے کوپن جیسے جنے کتنے ہم نے بھرے، پہلے کبھی کچھ نکلا؟ کیوں دلہن؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

ساس نے بہو کی تائید چاہی۔ بات تو بادشاہی بیگم نے ٹھیک کی تھی مگر لائف بوائے شیمپو کی پروڈکٹس انٹرنیشنل معیار کی ہوتی ہیں۔

"ارے اماں! وہ اور کمپنی والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ تو یونی لیور والوں کی پروڈکٹ ہے۔" لائف بوائے شیمپو بال لمبے اور گھنے کرتا ہے۔" سفینہ بیگم کے اتنا کہنے پر دونوں لڑکیاں مسکرائیں۔

اُن کی لو دیتی نظریں سفینہ سے کہہ رہی تھیں 'Thanks'۔ سفینہ، نیلم کو بغور دیکھ رہی تھی۔

'کہاں دیکھا ہے اس لڑکی کو' وہ دل میں سوچتی ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔ ذہن میں جھماکے سے ہوئے۔

'خورشید باجی!' ذہن سے بادل چھٹ گئے، اندھیرا، روشنی میں نہا گیا۔

"بیٹا! تم" وہ جھجکی۔ "کیا تم عظمت ماموں کو جانتی ہو۔" سفینہ کو خورشید باجی کے ابا کا نام یاد آ گیا تھا۔ وہ براہِ راست خورشید باجی کا نام لینا نہیں چاہ رہی تھیں۔ یہ نام سن کر نیلم کے منہ سے بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

"کیا ہوا؟" سفینہ اپنی عقل پر ماتم کرنے لگیں۔

"آنٹی میرے دادا کا نام ہے عظمت۔"

"تو تم خورشید باجی کی بھتیجی ہو۔ حشمت بھائی کی بیٹی ہو یا رحمت بھائی کی۔" سفینہ کے منہ سے خاندان کا بائیو ڈیٹا سن کر نیلم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ہے۔

"ارے آپ تو سب کو جانتی ہیں۔"

"ارے بھئی ہم ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ بینک والی گلی میں عظمت ماموں کا گھر تھا اور دو گلی چھوڑ کر ہمارا۔ ہماری امی نے تو عظمت ماموں کو بھائی بنایا ہوا تھا۔ میں اور خورشید باجی تو ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔" سفینہ پچھلی باتیں یاد کرتی۔ نیلم کی آنکھیں نم کر گئی تھیں۔

بادشاہی سے رہا نہ گیا تو بول پڑیں۔

"اے دلہن! یہ کیا انٹرویو شروع کر دیا تم نے۔ غریب نوکری پہ ہیں۔" اتنی ہی دیر میں علی شیر بھی شاور لے کر آ گیا تھا۔ وہ بھی بڑی دلچسپی سے بھاوج کا والہانہ پن دیکھ رہا تھا۔ فون نمبر کے تبادلے ہوئے اور پھر وہ رخصت ہونے لگیں۔

ایکسکیوزمی پلیز ایک لائف بوائے شیمپو کِٹ مجھے بھی دیجیے گا محترمہ!" خاور آنکھوں میں شوخی لیے بولا۔

"شیور" نیلم نے اسکالرشپ اسکیم کِٹ خاور کو پکڑائی اور اُس کے ہاتھ سے پیسے لیے۔

"پلیز یہ کوپن پر کرا دیجیے۔" نیلم نے کوپن پُر کر کے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور بُری طرح جھینپ گئی۔

"ارے اس کوپن کو پُر کر کے کیوں لے جا رہی ہیں آپ۔"

"ہماری ماہِ رمضان میں قرعہ اندازی ہوگی۔ اُس میں یہ کوپن شامل ہوں گے۔ قرعہ اندازی کے ذریعے منتخب لوگوں کو اسکالرشپ دی جائے گی۔" نیلم کی میڈم کائنات نے علی شیر کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"محترمہ! قرعہ اندازی کے بغیر قرعہ نکل آئے تو ......" سفینہ دیور کی شرارت کو سمجھ گئی تھیں۔

"تو پھر جو آپ کہیں وہ آپ کو انعام دے دیا جائے گا۔" بے ساختہ قہقہے چھوٹے تھے۔

☆......☆

"ارے واہ۔ بھئی دلہن کمال کر دیا۔ بڑے مزے کا مٹر پلاؤ بنایا ہے اور کباب کے تو کیا ہی کہنے۔" بادشاہی بیگم کھلے دل سے سفینہ کے ہاتھ کے پکے کھانے کی تعریف کر رہی تھیں۔

"آپ ہی سے سیکھا ہے اماں۔ ورنہ میں تو کچن سے گھبراتی تھی۔" سفینہ نے ساس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"اے ہے۔ میں نے کیا سکھایا؟ بھئی تم تو خود بھرے پُرے کنبے سے آئی تھیں۔ بس تم میری بات مان لیا کرتی تھیں۔ جیسا کہتی تھی ویسا ہی کرتی تھیں، اسی لیے دلہن تم گرہستی میں تاک ہو گئیں۔ آج کی لڑکیوں میں خرابی یہی ہے کہ وہ خود کو ہر فن مولا سمجھتی ہیں اور بڑوں کے تجربے سے فیض نہیں اٹھاتیں۔ اسی لیے خاندان ٹوٹ رہے ہیں۔ گھر بکھر رہے ہیں۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔" بادشاہی بیگم نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالی تھیں۔

"ارے بیٹا! تم کیوں چُپ ہو؟ تم تو جو تھوڑا بہت کہتے سنتے تھے اس سے بھی گئے۔ جنے کون سے کاروبار ہیں، جنہوں نے تم لوگوں کو چُپ لگا دی ہے۔ وہ چھوٹا جس دن سے آیا ہے، کمرے میں چھپا بیٹھا ہے۔"

گل شیر ماں کی باتیں سن کر مسکرائے اور ازمینہ کی پلیٹ میں کباب ڈالتے ہوئے گویا ہوئے۔

"اماں بچپن میں آپ ایک جملہ کہا کرتی تھیں نا۔ ایک چپ سو کو ہرائے۔ وہ آج سمجھ میں آیا ہے۔"

"کیا کھانا اچھا نہیں بنا۔" سفینہ کو لگا، شاید میاں جی انہیں سُنانے کو کہہ رہے ہیں۔

"ارے بابا، اسی لیے تو کچھ بولتا نہیں ہوں۔"

"تھوڑا بولتے ہیں، لیکن جانے کس کو کیا کہہ جاتے ہیں، پتا ہی نہیں چلتا۔ خوامخواہ بندہ مجرم سمجھنے لگتا ہے خود کو۔" سفینہ ٹرے میں کھانا سجا کر علی شیر کے کمرے میں لے جانے لگیں۔

"اے دلہن۔ اُس سے کہو، سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا کرے۔"

"اماں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر فوج کی نوکری میں تو بندہ تھکن اتارنے ہی گھر آتا ہے۔"

"نوکری کوئی بھی ہو، گھر میں تو بس تھکن ہی اتارنے آتا ہے بندہ۔" گل شیر کی بات پر سفینہ بلش ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ شرماتے ہوئے اُن کی نظروں سے دور ہو گئیں۔

گل شیر گہری نظروں سے انہیں جاتا دیکھتے، نیپکن سے ہاتھ پونچھنے لگے تھے۔

☆......☆

"تم سے دور ہو کر بھی تمہارے ہی پاس ہوں۔ سوچا تو یہی تھا کہ آج کل میں ہی اماں اور بھابی سے بات کروں گا تمہارے متعلق مگر...... انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے۔ اماں کسی کی بات سنتی ہی کب ہیں؟ تم فکر مت کرو، اگر ہمارا ملن اِس زمین پہ لکھا ہے تو بہت جلد ہم مل جائیں گے۔ مجھے امید ہے رمضان والی قرعہ اندازی پر یہ معجزہ ہو جائے گا۔ بہر حال انسان خدا سے دعا ہی کر سکتا ہے۔ میرا جو حال ہے۔ وہ میں فی الحال لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"I Miss You" کا کارڈ تکیے کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ سفینہ نے فوری طور پر کارڈ کی پشت پر لکھا ایڈریس حافظے میں فیڈ کر کے کارڈ جوں کا توں واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکیں۔ چونکہ انھوں نے اِس ایڈریس کو پہچان لیا تھا اور ساتھ ہی ایڈریس والی کو بھی۔

"ارے بھئی علی شیر، کتنی دیر لگاؤ گے باتھ روم میں۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" انہوں نے باتھ روم کے دروازے سے ہانک لگائی۔

"بھابی بس پانچ منٹ۔ آپ رکھ کر چلی جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جلدی کھانا کھا لینا۔" اب سفینہ نے دماغ کو الرٹ کر لیا تھا۔ کہ کس طرح آگے کی کارروائی کر کے علی شیر کی خوشیاں اس کے دامن میں ڈالے۔

☆......☆

جیسے جھنا کے چیخ جائے کسی ساز کا تار
جیسے ریشم کی کسی ڈور سے کٹ جائے ہے اُنگلی
ایسے اِک ضرب سی پڑتی ہے کہیں سینے میں
کھینچ کر توڑنی پڑ جاتی ہے، جب تجھ سے نظر
تیرے جانے کی گھڑی سخت گھڑی ہوتی ہے
گلزار کی نظم، رخصت جیسے علی شیر کے سینے میں ہُوک کی طرح اٹک سی گئی تھی۔ ساری محبت آج ختم ہو جانا تھی۔ اُسے نیلم سے پہلی ملاقات یاد آنے لگی، جو اُس کی آزاد زندگی کو کسی ڈور سے باندھ گئی تھی کہ دو دل ایک تال پر دھڑکنے لگے تھے۔

آج منگنی کی تقریب تھی۔ آج اُسے نیلم شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اُس کی معصوم باتیں، سب کچھ۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے چشمِ زدن میں وہ آنچل سے چہرہ چھپائے، بار بار اپنی جھب دکھلا کر، اُسے اُس کی محبت کی ناکامی اور حق کے لیے آواز نہ اٹھانے پر چڑا رہی ہے۔

"علی شیر...... علی شیر...... کہاں کھوئے ہو، بھئی۔" سفینہ اُس کے کمرے میں آ کر اُس کے پاس کھڑی اُسے آوازیں دے رہی تھیں۔

"علی شیر، چہرے پر کیا مردنی چھائی ہوئی ہے۔ آج تمہاری زندگی کا ایک بہت بڑا دن ہے اور تم پلیز بھیا...... جب خود کو قربان کر ہی دیا ہے تو قربانی کو صحیح طرح انجام دو نا۔"

"بھابی، آپ جانتی ہیں۔ میں کس طرح......"

"تم نے ہمیں کچھ بتایا ہے کبھی جو ہم جانیں گے لیکن خیر...... جن کے نصیب میں خوشیاں جتنی لکھ دی جائیں، اُتنی ہی ملتی ہیں۔"

''بھابی کیا بتاتا میں، اماں کی ہر بات فیصلہ ہی ہوتی ہے۔''
''خیر تمہارا برا کوئی نہیں چاہتا۔ اماں بھی تم سے کبھی تمہاری مرضی کے خلاف کچھ کرنے کو نہ کہتیں، لیکن تم اتنے عرصے زبان پر قفل لگائے بیٹھے رہے۔''
''بھابی بس آپ دعا کیجیے گا کہ میں اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہوں اور کسی بھی قسم کے حقوق میں کوتاہی نہ کرپاؤں۔''
''تم بہت اچھے ہو علی شیر۔ تمہارا نصیب اُس سے بھی اچھا ہوگا۔ فیصلے تو اوپر والا کرتا ہے میرے بھائی۔ اب نیچے آجاؤ۔ تمہارے سب سسرالی منگنی کی رسم ادا کرنے کو بے چین ہیں۔ جلدی آجاؤ شاباش۔ بھیا لوگوں کو اپنے بھی بہت کام ہوتے ہیں۔ دیر نہ کرنا۔'' سفینہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔
علی شیر بھابی کو بے بسی سے دیکھتے رہ گئے۔

☆......☆

حیرتِ عشق خیر ہو تیری
کیسے عالم میں لا کے چھوڑ دیا

علی شیر کو لال دوپٹے کی چھاؤں میں اسٹیج تک لایا گیا تھا۔ دل میں کوئی امنگ، کوئی خوشی نہ ہو تو انسان سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی گویا بینائی سے عاری ہو جاتا ہے۔ پُر رونق تقریب میں بھی علی شیر کے دل کی ویرانی سوا تھی۔
''ہاتھ تو آگے کیجیے۔'' اس آواز پر علی شیر نے چونک کر اوپر دیکھا تھا اور جیسے پوری محفل پر سناٹا چھا گیا تھا۔
''نیلم!! تم!!'' علی شیر حیرت سے اِرد گرد دیکھنے لگا۔
''جی ہم ہی ہیں۔'' وہ رسان سے گویا ہوئی اور علی شیر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں، بھائی اور بھابی کو دیکھا تھا۔
''مگر یہ سب......!!'' علی شیر کو جیسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔
''یہ کو پن لیجیے اور سمجھ جائیں۔'' سفینہ نے اُسے ہاتھ میں قرعہ اندازی میں نکلا اسکالر شپ سرٹیفکیٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔
''ارے بچے! یہ سب تیری بھابی کا کمال ہے۔ دیکھ لے، کتنا خیال رکھتی ہیں تیرا۔ تیرے دل کے اندر کی بات بھی ڈھونڈ نکالی دلہن نے۔ مجھے اپنی بہو پر فخر ہے۔ بہو ہو تو ایسی۔'' بادشاہی بیگم فخریہ بولی تھیں۔
''واقعی یار۔ یہ سارا کریڈٹ تمہاری بھابی کو جاتا ہے۔'' گل شیر کو بھی بیوی پہ پیار آرہا تھا۔

''حشمت بھائی! آپ نے نیلم کو ہمارے ایک دستِ سوال پر جھولی میں ڈال دیا۔ ہمارے لیے بڑی بات ہے۔ آپ بے فکر رہیے گا۔ نیلم میری بہن، میری لاڈو بن کر اس گھر میں رہے گی۔''
''ائے ہئے۔ ارے وہ اتا بی نوینہ اور ازمینہ کو لیے بیٹھی تھیں، کہاں رہ گئیں۔'' بادشاہی بیگم کو پوتیوں کی یاد ستائی تو چلائیں۔
''دادی ہم یہاں ہیں۔ چاچو اب چپ نہیں رہنا ''لائف بوائے، سچا ساتھی ہے سب کا'' اس لائف بوائے شیمپو نے مجھے اسکالر شپ دلائی اور اب میری پڑھائی کا سارا خرچہ میرا دوست لائف بوائے شیمپو پورا کرے گا اور آپ کو دی ایک سچا ساتھ نبھانے والی گڑیا چچی۔'' نوینہ لائف بوائے شیمپو کٹ علی شیر کو پکڑاتے ہوئے بولی تھی اور یہ سن کر پوری محفل مسکرانے لگی تھی۔ علی شیر نے نوینہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے چوم لیا۔ اور بولا۔
''لو یُو لائف بوائے شیمپو......تم تو واقعی دل کا بھید جاننے والے سچے ساتھی ہو۔''

☆......☆

برف باری نے سارے منظر سفید کردیے ہیں لیکن میرے دل کی دنیا، بہت روشن اور پُرتپش ہے۔ محبتوں کے الاؤ اس مَن میں دہکنے لگے ہیں۔ انشاءاللہ پاکستان پہنچ کر میں اُس احسان کا قرض چکاؤں گی۔ امی جان نے بادشاہی دادی کے کہنے پر اسکالر شپ پر نوینہ کے بجائے میرا نام لکھوایا تھا اور نیلم چچی نے اسکالر شپ والے تمام پروسیس میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے دادی اماں کے اس خیال کو غلط ثابت کیا تھا کہ جو بات کمپنی والے کہتے ہیں وہ جھوٹ ہوتی ہے۔ یونی لیور پاکستان نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور لائف بوائے شیمپو کو مسیحا بنا کر ہمارے گھر بھیج دیا۔ میرے بالوں کی ساری پرابلمز لائف بوائے شیمپو کے استعمال سے مکمل طور پر ختم ہوگئیں اور لندن جیسے ملک میں بھی میں لائف بوائے شیمپو ہی مکمل اعتماد کے ساتھ معمول کا حصہ بنائے ہوئے ہوں۔ تو پھر کیوں نہ آپ بھی اپنا اعتماد لائف بوائے شیمپو کے نام کردیں۔ کیا پتا کل آپ کا بھی اسکالر شپ کا سپنا، لائف بوائے شیمپو پورا کردے۔

☆......☆......☆

شادی میرے بیٹے کی

نزہت جبیں ضیاء

بیٹے کی شادی کا ارمان تو ہر ماں کو ہوتا ہے۔ اور اس وقت سے ہوتا ہے جب بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا اور مجھ سے تو زیادہ میری بیٹیوں کو اپنے اکلوتے بھائی کی شادی کا ارمان تھا۔ اسی وجہ سے مجھے اپنے بیٹے کی شادی اکتوبر، نومبر میں کرنے کے بجائے مارچ میں کرنی پڑی کیوں کہ میری منجھلی بیٹی صوفیہ کو اچانک ہی اپریل میں ریاض شفٹ ہونا تھا کیوں کہ چھ ماہ قبل میرے داماد مظہر آفس کی طرف سے ریاض جا چکے تھے اور اب اپریل میں آ کر صوفیہ اور بچوں کو لے جانے والے تھے اور منہاج (میرا بیٹا) کی شادی صوفیہ کے بغیر ہونا تو ناممکن تھا۔ یوں اچانک ہی تاریخ طے ہوگئی اور شادیوں کی تیاریوں کا آغاز خوب دھوم دھام سے ہوگیا۔

نکاح 22 مارچ، دلہن کی مایوں 23 مارچ، دولہا کا مایوں 25 مارچ شادی 27 مارچ اور ولیمہ 28 مارچ کو طے پایا۔ بس تو پھر ہماری تیاریاں بڑے زور و شور سے اسٹارٹ ہوگئیں۔ میں اور میری تینوں بیٹیاں طیبہ عبید، صوفیہ مظہر، اور جویریہ ہم تو گھن چکر بن گئے۔ ہم نے پہلے دلہن کی تیاری مکمل کرنے کا سوچا۔ دیگر سوٹ تو لے لیے گئے مگر شادی اور ولیمے کے ڈریسز کے لیے ہم نے کراچی کے تمام بازاروں کی خاک چھانی حتی کے بنارس کالونی اور کٹی پہاڑی کا دیدار بھی کرلیا آخر کار شادی کے لیے ڈل ریڈ اور فان کومبنیشن کا شرارہ لونگ شرٹ کے ساتھ پسند کیا جس پر نگینوں کے بھاری (......) بنے ہوئے تھے اس کے ساتھ ملٹی کلر کی بنارسی کی لائننگ کے ساتھ شرٹ سلوائی اور دوپٹے پر بھی پائپن لگوائی۔ ولیمے کے لیے بنارس کالونی سے پرپل اور گولڈن بنارسی پاجامے کے ساتھ آف وائٹ بنارسی شیفون جارجٹ کا حیدر آبادی کھڑا دوپٹہ کُرتی اور اُسی کا اوپر سے اوڑھانے والا بڑا دوپٹہ لیا۔ کھڑا دوپٹہ جو چھ گز کا ہوتا ہے اس پر بنارسی پرپل کے ساتھ چاروں طرف فُل نگینوں سے پرپل اور گولڈن کام کروایا اور پر سے اوڑھانے والے دوپٹے کو پرپل شیڈ سے ٹائی اینڈ ڈائی کروا کے ڈبل ماتھا پٹی کے ساتھ ویسا بھی ایبک کے ساتھ فُل کام کروایا تھا جبکہ کُرتی کے گلے، شولڈرز، سلیولیس، دامن اور کلیوں کے اسٹائل میں فُل نگینوں کا کام کروایا دلہن کے سینڈلز جیولری، پرسز کے لیے جامع کلاتھ، صائمہ مال، طارق روڈ اور حیدری کے چکر لگے۔

ساتھ ساتھ ہم لوگوں نے اپنی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ بیٹیوں کی الگ پسند تھی۔ تو میری نواسیوں اشنہ اور ہانیہ کو ہر چیز دلہن مامی کے جیسے چاہیے تھی۔

تقریباً ایک ماہ سے گھر میں ڈھولک بجنے لگا تھا اور میری بھتیجیاں، بھانجیاں، بہنیں وغیرہ جمع ہوکر خوب ہلا گلا کررہی تھیں۔ ٹیلر کے اور مارکیٹوں کے چکروں نے مجھے گھن چکر بنا کے رکھ دیا تھا کیوں کہ اصل ذمہ داری تو مجھ پر ہی تھی۔

☆......☆......☆

نماز عصر کے بعد 22 مارچ کو رسمِ نکاح اریبہ (میری بہو) کے گھر پر ہی تھی۔ منہاج نے آج وائٹ کاٹن کا شلوار قمیض پہنا تھا اور اریبہ نے میرون کلر کے ہلکے کام والا سوٹ پہنا تھا۔ دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ نکاح کے بعد ہم نے چھوارے تقسیم کیے۔ پھر میں نے اریبہ کو ہمارے ہاں پہنایا جانے والا کالی موتیوں کا ہار (گولڈ کا) اور اوپر سے وہ دوپٹا پہنایا جو میں نے اپنے نکاح کے بعد اوڑھا تھا۔ اور پھر اریبہ کی والدہ نے ریفریشمنٹ اور چائے سے ہم سب کی تواضع کی مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔ 22 مارچ کو ہم اریبہ کے گھر مہندی لے کر گئے۔ مہندی کا انتظام اریبہ کی بڑی بہن (نوشین) کے گھر کی چھت پر کیا گیا تھا۔ ایک رات پہلے میرے گھر میری بہنیں، ضیاء کی بہن، بھانجیاں، بھتیجیاں، جیٹھانیاں، اور منہاج کے دوست جمع تھے کیوں کہ ہم اریبہ کے بری کے تمام جوڑے ڈمیز پر سیٹ کیے تھے۔ سب کے ساتھ سینڈیلز اور جیولری سیٹس بھی تھے۔ جیولری سیٹس بھی ڈمیز پر لگائے ہوئے تھے اور ان تمام بری کی اشیاء اور کپڑوں کو لے جانے کے لیے الگ گاڑی کا انتظام کیا گیا تھا۔

آج ضیاء نے کاٹن کا شلوار قمیض پہنا تھا۔ میں نے بلو جارجٹ کی ملٹی کلر ستاروں والی ساڑھی پہنی تھی۔ عبید (بڑے داماد) نے جینز پر مہندی کلر کی شرٹ پہنی تھی۔ طیبہ اور صوفیہ نے ساڑھیاں پہنی تھیں طیبہ نے موو اور میرون، صوفیہ نے گرین اور گولڈن بنارسی ساڑیاں میچنگ انڈین جیولری کے ساتھ پہنی تھیں۔ جویریہ نے کاپر، مہندی اور سی گرین کلر کا بنارسی + نیٹ کا ڈیزائنرز سوٹ پہنا تھا۔ جب کہ میری ننھی شہزادیوں اشنہ اور ہانیہ نے سی گرین اور میرون بنارسی غرارے لونگ شرٹس کے ساتھ پہنے تھے۔ ارحم اور صہیب (نواسے) دونوں نے بیگی جینز کے ساتھ ٹی شرٹس پہنی تھیں۔ (الحمدللہ بچے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

نوشین کے گھر کی چھت کو لائٹوں سے سجایا گیا تھا جب کہ اریبہ کی رسم کے لیے جھولے والا چھوٹا سا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ ہمیں گیندے کے کنگن دیے۔ پھر اریبہ کو رسم کے لے لایا گیا اریبہ بنا میک اپ کے سادگی میں یلو مایوں کے جوڑے میں اچھی لگ رہی تھی۔ پہلے میں نے، پھر میری بچیوں نے اور پھر سب نے اریبہ کی رسم کی، جویریہ نے اپنی کزنز کے ساتھ مل کر ڈانڈیاں ڈالیں، اشنہ نے اپنی کزن اور میری بھانجی ماہا کے ساتھ گانے پر ڈانس کیا پھر کھانا کھایا گیا۔ کھانے میں کباب پراٹھا، بریانی، کچوریاں، گلاب جامن اور کولڈ ڈرنکس تھیں۔ ہم تقریباً 12 بجے واپس گھر آگئے۔

☆......☆......☆

25 مارچ کو ہمارے ہاں مایوں مہندی کا فنکشن تھا۔ جو ہم نے جوناگڑھ مسلم گھانچی ہال ملیر میں رکھا تھا۔ ہم مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ ضیاء نے آج آف وائٹ بوسکی کا کرتا شلوار کے ساتھ پہنا تھا اور ضیاء کے جیسے بوسکی کی قمیض اور گھیردار شلوار ہیں ارحم اور صہیب نے پہنی تھیں اور گلے میں چھوٹی ملٹی کلر کی چنریاں بھی تھیں۔ میں نے کریم کلر اور گرین مروڑی اور دھاگے کے کام کا سلک کا ڈیزائنر سوٹ لونگ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ پہنا تھا۔ جب کہ میری

تینوں بیٹیوں اور نواسیوں نے ایک جیسا یلو لانگ فراکیں ملٹی کلر بنارسی پاجاموں کے ساتھ پہنی تھیں فراکوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بنارسی کوٹیاں اور ملٹی کلر سلک کی چنریاں تھیں۔ پھولوں کے زیور پہنے بچیاں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ عبید نے نیوی بلو لائٹ سے کام کا شلوار قمیض پہنا تھا۔

دلہن والے آئے تو ہم نے سب کو ڈیری ملک

آ گئیں اور لڈی اسٹارٹ کر دی جویریہ نے کزنز کے ساتھ مل کر لڈی کھیلی اور اشنہ اور ہانہ نے ایک گانے پر ڈانس کیا۔ یہ ہنگامہ تھا تو اریبہ کی والدہ اور دیگر رشتہ داروں نے منہاج کا رسم کیا۔ پھر کھانا اسٹارٹ ہو گیا اور آج ہم نے کھانے میں حلیم، قیمہ پراٹھا، دہی بڑے، آلو کی ترکاری، سلاد اور مختلف چٹنیاں اور میٹھے میں گلاب جامن الحمد اللہ کھانا بہت

نزہت جبیں ضیاء اپنے شوہر ضیاء بیٹے منہاج اور بہو اریبہ کے ہمراہ خوشگوار موڈ میں

چاکلیٹ اور پھولوں کی کلیاں پیش کیں۔ منہاج نے آج لائٹ گرین کرتا اور وائٹ شلوار پہنی تھی۔ کرتے پر لائٹ اور ڈارک گرین ایمبرائڈی تھی اسی کی مناسبت سے لائٹ اور ڈارک گرین چنری گلے میں ڈالی تھی۔ منہاج بہت فریش لگ رہا تھا بہنوں کے ساتھ جب منہاج رسم کے لیے ہال میں داخل ہو تو اس کے دوستوں نے خوب ہنگامہ کیا ڈانس بھنگڑے اسٹارٹ کر دیے ساتھ میں منہاج کو بھی کھینچ لیا اور جب عبید اور ضیاء کو بھی گھسیٹ لائے تو ہال میں خوب ہنگامہ مچ گیا۔ اب بھلا بچیاں کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ جویریہ اور طیبہ بھی میدان میں

لذیذ تھا۔

24 کو گیپ تھا۔ اس دن سب نے پارلر کا رخ کیا مہندی تو سب کو ہی لگوانی تھی۔ اس کے علاوہ کسی نے ہیئر کٹنگ کروانی تھی تو کسی نے ہیئر ڈائی کروانے تھے۔ سارا دن اسی بھگدڑ اور پارلروں کے چکروں میں گذر گیا۔ اُسی رات کو گھر میں بچوں نے رت جگے کا پروگرام رکھا تھا۔ ہماری فیملی کمبائنڈ ہے۔ ضیاء کے دو بڑے بھائی بھی ساتھ رہتے ہیں۔ گراؤنڈ، فرسٹ اور ہم سکینڈ فلور پر رہتے ہیں۔ اس لیے شادی شدہ بچیاں بھی آ جاتی ہیں تو خوب ہنگامے ہوتے ہیں۔

اسی رات میں نے اور میری چھوٹی بہن نے گُلگلے بنائے۔ جس پر میرے بہنوئی ڈاکٹر عبداللہ نے ہم دونوں کو 5،5 سو پے دیے۔ پھر تمام لڑکیوں نے اُدھم مچایا اور عبداللہ کی جیب خالی کروائی۔ بچوں نے ابٹن کھیلنا اسٹارٹ کیا تو چھوٹا سا برآمدہ بھینسوں کا باڑا بن گیا۔ میں بھی اس عتاب سے بچ نہ پائی۔ فجر تک یہ ہنگامہ چلتا رہا اس کے بعد ہم لوگ سونے کے لیے لیٹے۔

☆......☆......☆

27 مارچ کو صبح ہی سے خوب تیاریاں ہو رہی تھیں کیوں کہ آج میرے شہزادے کی بارات تھی۔ جتنی تیاریاں کی جاتیں کم تھیں، ویسے بھی میرا بیٹا الحمد اللہ ہمارا فر بردار بیٹا، بہنوں کا پیارا بھائی بھانجیوں اور بھانجوں کا لاڈلا ماموں جانی، رشتے داروں اور دوستوں کا ہی نہیں محلے والوں کا بھی چہیتا ہے۔ (اللہ پاک میرے بچوں کو شادو باد رکھے)

آج بارات میں ضیاء نے لائٹ براؤن کاٹن شلوار قمیض پہنا تھا اور اسی کلر کی واسکٹ تھی۔

عبید نے گرے اور بلیک شیروانی بلیک پاجامے کے ساتھ پہنی تھی اور ہمیشہ کی طرح اچھے لگ رہے تھے۔ مظہر کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کاپر مہندی اور وائٹ کومبنیشن والی نیٹ اور بروشیاء کی ڈیزائنر ساڑھی پہنی تھی اور کاپر اسٹون کی جیولری تھی۔ طیبہ نے اپنے ولیمے کا ڈارک اور لائٹ پرپل شیڈ کا ڈبل شرارہ پہنا تھا جب کہ صوفیہ نے اپنی شادی کا فان اور ریڈ بھاری کام کا بنارسی شرارہ پہنا تھا۔ جویریہ نے انڈین شاکنگ اور گرین نیٹ کا لہنگا جس پر بنارسی لائننگ تھی بنارسی چولی کے ساتھ پہنی تھی۔ تینوں بیٹیوں نے انڈین نگینوں کی جڑاؤ جیولری، ماتھا پٹی کے ساتھ پہنی تھی۔ بھاری جیولری اور پارلر کے میک اپ میں اچھی لگ رہی تھیں جب

کہ میری دونوں نواسیوں نے سیم جویریہ کے جیسے لہنگے مختلف کلرز میں پہنے تھے۔ دونوں بہت حسین لگ رہی تھیں۔ میرے ننھے شہزادے ارحم اور صہیب نے اپنے ماموں جانی کے جیسی شیروانی، پاجامے اور گولڈن کھسے پہنے تھے اور واقعی شہزادے لگ رہے تھے۔

منہاج جب تیار ہوا تو اُدھر ہر زبان پر لفظ ماشاء اللہ تھا میرا بیٹا دنیا کا سب سے حسین دولہا لگ رہا تھا۔ ڈارک مہندی کلر کی سلک شیروانی جس پر سلور دبکے اور نگینوں سے گلے، شولڈر اور سیلوس پر پیچ بنے ہوئے تھے۔ آف وائٹ پاجامہ، میچنگ کھسہ سر پر آف وائٹ اور بنارسی پگڑی وہ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے نظر کی دعا پڑھ کر دم کیا پھر منہاج کے دونوں تایا، ضیاء اور عبید نے مل کر منہاج کو تیار کیا۔ آج مظہر (دوسرے داماد) کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ طیبہ اور صوفیہ نے منہاج کو سرمہ لگایا۔ جب سے شادی کے پروگرام اسٹارٹ ہوئے تھے تو میں برابر کچھ نہ کچھ صدقات دے رہی تھی۔

آج بھی گھر سے نکلنے سے پہلے مین نے کچھ صدقات دیے تھے ہم جیسے ہی گھر سے باہر نکلے منہاج کے دوستوں نے ڈھول والوں کو بلا رکھا تھا۔ پھر تو ڈھول بجنے لگا اور منہاج کے سارے دوستوں نے منہاج کو درمیان میں رکھ کر بھنگڑا اسٹارٹ کر دیا۔ جن میں سعادت، اطہر، منہد، نوروز، فرحان شامل تھے۔ چاروں طرف سے منہاج پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ منہاج کے ان دوستوں کے لیے جن لوگوں نے کبھی بھی مجھے اور ضیاء کو یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ کہ منہاج ہمارا اکلوتا بیٹا ہے میرے ان تمام بیٹوں کے لیے دعا کیجیے گا اللہ پاک ان سب کو سلامت رکھے۔ آمین پھر ہم بارات لے کر روانہ ہو

گئے منہاج کے ساتھ گاڑی میں بڑے تایا ابوضیاء اور عبیدارحم اور صہیب بیٹھے تھے۔

جب ہم ہال میں پہنچے تو وہاں بھی منہاج کے دوستوں نے بھنگڑے ڈالے کیوں کہ ڈھول والوں کو ساتھ لے کر گئے تھے اسی طرح آگے آگے دوستوں کا بھنگڑا ہوتا رہا اور پیچھے پیچھے منہاج اور ہم ہال مین داخل ہوئے۔ اریبہ کے گھر والوں نے ہمیں بو کے دیے۔ آج اریبہ بہت پیاری لگ رہی تھی بھاری میرون شرارے میں، بھاری میک اپ، اور جیولری

کھانے کے بعد اریبہ کی والدہ اور چھوٹا بھائی احتشام اسٹیج پر آئے اور اریبہ کی والدہ نے رسم کی گھڑی اور سلامی دی۔ پھر رخصتی کا مرحلہ آ گیا۔ قرآن پاک کے سائے میں اریبہ گھر سے رخصت ہو کر گاڑی میں آ بیٹھی، ساتھ میں، میں اور جویریہ بیٹھے منہاج کے سارے دوست بائیکوں پر ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔

جب ہماری گاڑی لیاقت مارکیٹ پہنچی تو سب لڑکوں نے بائیکس سے اتر کر ہماری گاڑی رکوائی ٹریفک رکوائی اور بیچ روڈ پر ڈانس کیا انہیں بھنگڑا ڈالتا دیکھ کر

بارات جانے سے قبل دولہا کا اپنی فیملی کے ہمراہ گروپ فوٹو

تھی۔ ماشاء اللہ فوٹو سیشن ہوا، رسمیں ہوئی اریبہ کی کزنز اور بہنوں نوشین اور افشین نے منہاج کا ناگرہ اتروا کر بھاری رقم کا مطالبہ کر ڈالا دونوں جانب سے سوال جواب ہوئے آخر کار منہاج نے انولپ دے کر ناگرہ واپس لیا۔

پھر کھانا اسٹارٹ ہوا کھانے میں چکن کڑھائی، بریانی، بروسٹ، سلاد اور ربڑی کھیر تھی۔ آخر میں کولڈ ڈرنکس پیش کی گئی تھی۔ کھانا بہت اچھا تھا۔

وہاں پر موجود نوجوان بھی بھنگڑے میں شامل ہو گئے اور باقی لوگ محفوظ ہونے لگے۔ منہاج کے دوستوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا اس خوشی کو کس طرح سیلیبریٹ کریں۔ ضیاء کی آواز پر سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔

جب ہم گھر پہنچے تو گھر کی تمام لڑکیاں بھابی کی منتظر کھڑی تھیں۔ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے منہاج اور اریبہ کے اوپر سے بکروں کا صدقہ دیا گیا۔ پھر

طیبہ، صوفیہ اور جویریہ نے دروازہ روک کر منہاج کی جیب ہلکی کی۔ کھیر کھلانے کی رسم ہوئی۔ تصاویر اور مووی سیشن ہوا پھر منہاج کے دوست سعادت، فرحان، نوروز، نے اریبہ کا گھٹنا پکڑنے کی رسم اور منہاج سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا منہاج نے اس بار ضیاء کی مدد طلب کی کیوں کہ گاڑی روکنے اور دروازہ کھولنے اور ناگرہ چھپانے پر منہاج نے اپنی جیب خالی کر دی تھی اس بار ضیاء کی جیب ہلکی ہوئی۔

☆......☆☆

دوسرے دن ولیمہ تھا۔ صبح سے ہنگامہ تھا۔ کسی کا دوپٹہ نہیں مل رہا تو کسی کی جیولری غائب تھی۔ اس پر ضیاء کا شور وقت سے پہلے ہال میں پہنچنا ہے اور سب سے زیادہ ٹینشن تو مجھے تیار ہو کر بیوٹی پارلر جانا تھا۔ جہاں اریبہ تیار ہو رہی تھی کیوں کہ اریبہ کو آج چھ گز والا دوپٹہ سیٹ کرنا تھا جو بیوٹی پارلر والوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ مجھے ہی کرنا تھا۔

میں نے آج ریڈ بلیو، اور آف وائٹ کومبنیشن کی ڈیزائنر جارجٹ کی بنارسی ساڑھی آنچل والی انڈین ساڑھی پہنی تھی۔ ساتھ کندن کا انڈین جیولری سیٹ تھا۔ ضیاء نے ڈارک براؤن اور لائیننگ والا تھری پیس سوٹ پہنا تھا۔ جس میں فان شرٹ اور میچنگ ٹائی تھی۔ عبید نے ڈارک براؤن سوٹ پہنا تھا۔ طیبہ اور صوفیہ، جویریہ اشنہ اور ہانیہ ان سب نے ایک جیسے مختلف کلر کے کپڑے پہنے تھے۔ طیبہ نے ریڈ، صوفیہ نے مرجنڈا، جویریہ نے فیروزی جارجٹ کے فل نگینوں کے کام کے کوٹ پہنے تھے جس کے اندر سلور بنارسی میکسیاں تھیں۔ تینوں نے بیوٹی پارلر سے میک اپ کروایا تھا۔ بھاری نگینوں کی سلور جوبلی سائیڈ جھومر کے ساتھ تھی، جب کہ اشنہ اور ہانیہ نے شاکنگ پنک کام کے کوٹ کے ساتھ سی گرین بنارسی میکسیاں پہنی تھیں۔ اشنہ نے بھی جھومر لگایا ہوا تھا جب کہ ہانیہ نے بھی جھومر لگایا ہوا تھا۔ ہیئر کیچ کے ساتھ اسٹیچ تھا۔

ارحم اور صہیب نے بھی سوٹ پہنے تھے اور چھوٹی چھوٹی ٹائیاں بھی لگائی ہوئی تھیں۔

اریبہ اور منہاج انٹر ہوئے تو ہر آنکھ متوجہ ہوگئی اور ہر کوئی بے ساختہ ''ماشاءاللہ'' کہہ اٹھا۔ اریبہ نے آف وائٹ کرتی کے ساتھ پرپل بنارسی پاجامہ، کھڑا دوپٹہ اور اوپر سے الگ دوپٹہ سیٹ کیا ہوا تھا۔ بھاری کام نفاست سے کیے گئے میک میک اپ اور جیولری میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی جب کہ منہاج بھی اس میچنگ کا آف وائٹ تھری پیس میں تھا۔ جس کے اندر ہر پل شرٹ اور میچنگ ٹائی تھی۔ یوں تو میں نے اپنے لکھنے والوں سے کچھ کو مدعو کیا تھا جن میں سے ہمارے کاشی بھائی بھی شامل تھے مگر کاشی اپنے ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکے تھے اور بعد میں اس کی بھی وضاحت کر دی تھی (اوکے کاشی بھائی) اس دوران مووی، اور فوٹوز کا سلسلہ چلتا رہا پھر کھانا اسٹارٹ ہوا، کھانے میں بریانی، چکن قورمہ، چکن چلی، چکن تکہ، چائنیز رائس، مرچوں کا سالن، بگھارے بینگن، رائتہ، سلاد اور چٹنیاں تھیں۔ میٹھے میں لب شیریں اور آخر میں کولڈ ڈرنکس بھی تھیں۔

پھر ہم سب نے رسمیں کیں میں نے اریبہ کو گولڈ کی رنگ دی۔ ضیاء نے گولڈ پلیٹڈ راچز کا سیٹ منہاج اور اریبہ کو دیا۔ طیبہ اور صوفیہ نے گولڈ کے سیٹس، جویریہ نے گولڈ رنگ اور آخر میں اشنہ نے اپنی دلہن مامی کو گولڈ کی نوز پن گفٹ کی۔

آخر کار ان یادگار اور خوبصورت تقاریب کا اختتام ہوا۔

دعا کیجیے گا ہمارا گھر اسی طرح شاد و باد رہے۔ (آمین)

☆☆......☆☆

دامِ دل

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کر دیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی پانچویں کڑی

ندا کو جتنی بھی آیتیں زبانی یاد تھیں اس نے ثمر کے آفس کے اندر داخل ہونے تک پڑھ ڈالی تھیں۔
اندر داخل ہوئی تو ایک بڑے ڈیشنگ، اسمیشنگ، ہینڈسم سے باس کو دیکھ کر اپنی فطری بے ساختگی کی وجہ سے چند سیکنڈ تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مگر ثمر کی بے تاثر، بے مروّت نگاہوں نے
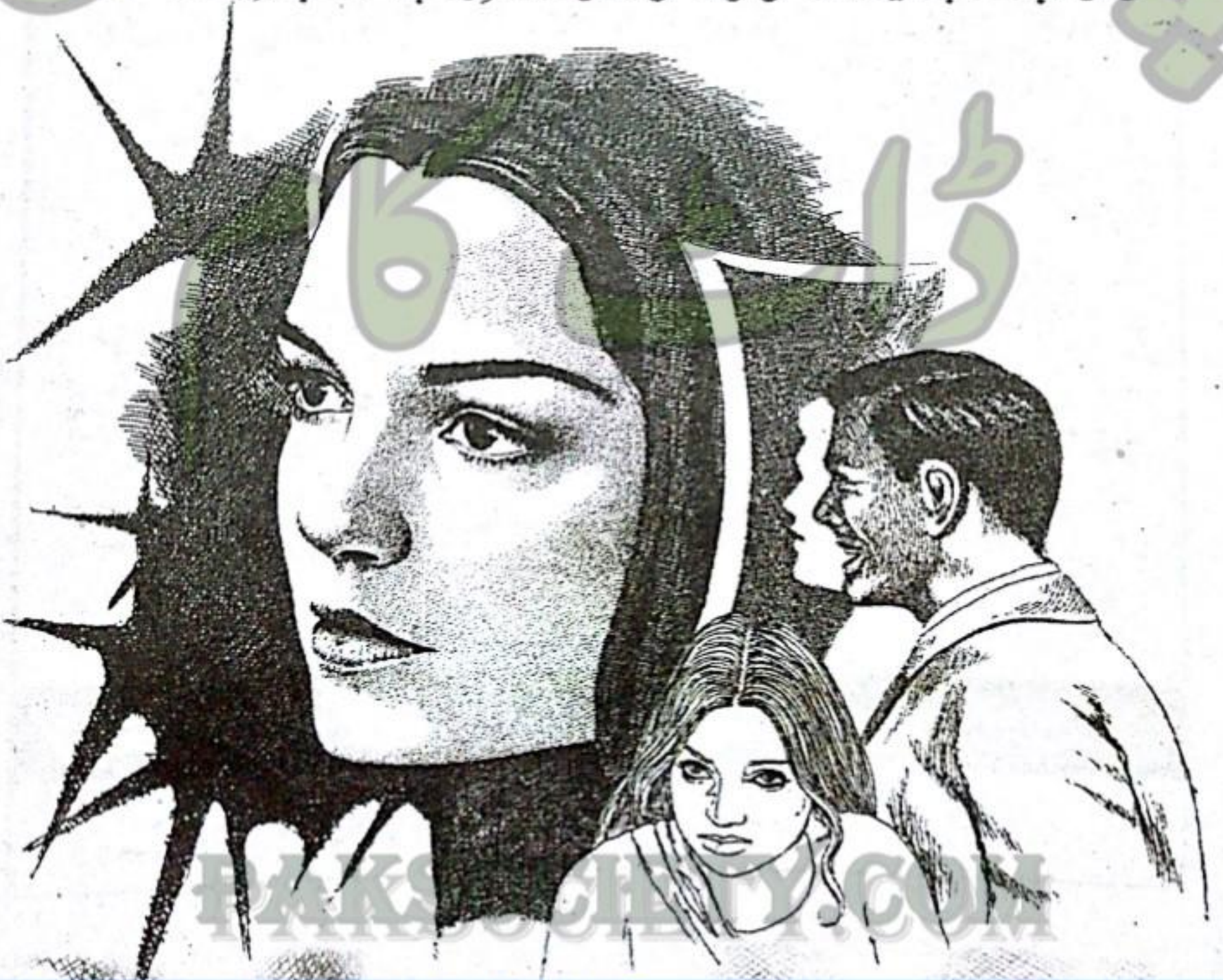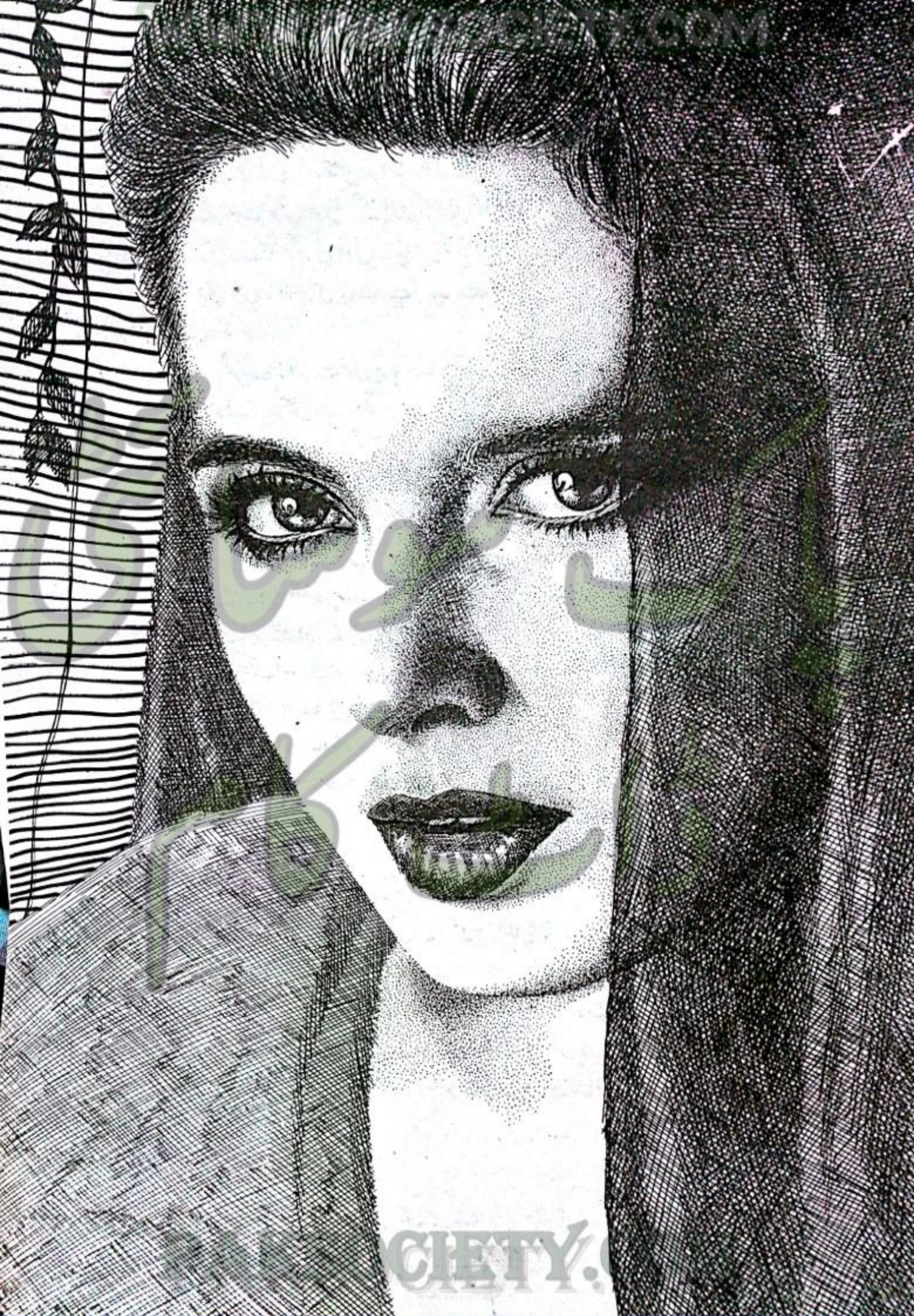
اسے فوراً جائے میں ڈال دیا۔

''اسلام علیکم سر! سروہ پلیز آپ اس مرتبہ میری ایکسکیوز ایکسیپٹ کرلیں۔ آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ سر ایکچوئیلی میں فرسٹ ٹائم جاب کررہی ہوں، نان ایکسپیرینسڈ بندے سے بھول چوک تو ہو جاتی ہے ناں...... لیکن سر انشاء اللہ میں ثابت کروں گی کہ میں ڈیزرو کرتی ہوں۔ آپ میرے کام سے بہت خوش ہوں گے کیوں کہ میں کام چور نہیں ہوں بہت ہارڈ ورکر ہوں...... اور سر بہت ایمانداری سے کام کرتی ہوں۔ چاہیں تو آپ ابھی میرے نانا جان کو فون کر کے پوچھ لیں۔ وہ بزرگ آدمی ہیں۔ ظاہری بات ہے آپ سے جھوٹ تو نہیں بولیں گے۔ دیکھیں ناں جو انسان قبر میں پاؤں لٹکا کر......''

''اسٹاپ!''...... ثمر نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا تھا۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ ندا تو بُری طرح دہل کر رہ گئی بلکہ مارے خوف کے ٹیبل سے دو قدم دور ہٹ گئی۔

''شرم کیجیے...... اپنے نانا کے پاؤں قبر میں لٹکوا رہی ہیں۔''

''میں کہاں لٹکوا رہی ہوں سر۔ لٹکے ہوئے ہیں۔ جو انسان بہت بوڑھا ہو جاتا ہے۔ پھر ایسے ہی تو بولتے ہیں۔'' ثمر نے حیرت چھپاتے ہوئے خشونت بھری نظروں سے دیکھا۔

''ایکچوئیلی...... سر اس وقت میں آپ سے اتنی خوفزدہ ہوں کہ منہ سے کچھ کا کچھ نکل رہا ہے۔''

''آپ مجھ سے نہیں اپنی غلطیوں اور بددیانتی کی وجہ سے خوفزدہ ہیں۔ نہ میرے سر پر سینگ ہیں نا ہاتھی کی طرح دو دانت باہر لٹکے ہوئے ہیں۔''

ثمر نے اسی طرح خشک اور بے مہر انداز میں ٹوکا۔ ابھی تک اس نے ندا کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''آپ کتنا اچھا اینالائز کرتے ہیں سر۔ آپ کو تو پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔''

''آپ ہوتی کون ہیں میرے بارے میں فیصلے کرنے والی کہ مجھے یہ ہونا چاہیے تھا یا وہ ہونا چاہیے تھا۔'' ثمر نے برداشت کی آخری حد بہر حال پار کر ہی لی۔ ندا تو اس کی گرج دار آواز سن کر تھر تھر کانپنے لگی۔ آنکھوں کے کناروں سے یوں تواتر سے آنسو اُبلے گویا اشارے کے منتظر تھے۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کے آنسو دیکھ کر ثمر ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ پہلی غلطی تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ بے چاری کی نئی نئی جاب ہے۔ کچھ مارجن تو رکھنا پڑتا ہے۔

''آپ جائیے میں احمد صاحب سے بات کرتا ہوں۔ انھوں نے آپ کا انٹرویو کیا تھا۔ وہی آپ کو رولز اینڈ ریگولیشن سمجھائیں گے۔ میرے پاس تو رنگروٹ کو ٹریننگ دینے کا ٹائم نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ کی طرف توجہ کی اور تازہ میلز پڑھنے کے لیے اپنا ذہن بنانے لگا۔ ندا اسی طرح خاموشی سے کھڑی اپنے آنسو ہتھیلیوں سے صاف کر رہی تھی۔ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ثمر کی جان جل کر خاک ہونے لگی۔

''آپ جاتی کیوں نہیں۔ اب کس خوشی میں میرے سر پر سوار ہیں۔'' وہ برہمی سے گویا ہوا۔

''ریئلی میں جاؤں سر۔ میں نے سوچا آپ ایک مرتبہ پھر مجھے جانے کو بولیں۔ کیا پتا غلطی سے آپ کے منہ سے نکل گیا ہو۔''

ثمر کا جی چاہا لیپ ٹاپ اٹھا کر اپنے سر پر دے مارے۔

''سب کو اپنی طرح سمجھا ہوا ہے۔ جاتی ہیں یا میں اپنا روم چھوڑ دوں؟''

ثمر کے دماغ میں گویا ہنڈیا پکنے لگی۔

ندا تو یوں بھاگی جیسے نیا نیا پیدا ہونے والا بلونگڑا آہٹ سن کر دوڑ لگاتا ہے۔

ثمر نے اس کے جانے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ جس باس کی ازدواجی زندگی مسائل کا شکار ہوتی ہے۔ اس کے کولیگز کو تو ویسے بھی اپنے اپنے گھر میں ہر مہینے آیتِ کریمہ کا ختم کرانا چاہیے۔

☆☆..........☆☆

ایمن نڈھال سی صوفے پر گرے پڑے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ خیالات کی یورش کے بعد اگلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب ذہن کام کرنا بالکل بند کر دیتا ہے۔ اندر اور باہر ایک سناٹا براجمان ہو جاتا ہے۔ سکوت کا یہ دورانیہ مادی حواس کو گویا زنجیریں پہنا کر بٹھا دیتا ہے۔ ماضی، حال، مستقبل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ سکوت اور خاموشی اس ماورائی جہان تک رسائی دیتے ہیں جہاں ذات رشتوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر ہوا کی طرح ہلکی محسوس ہوتی ہے۔

جانے کتنی دیر وہ اس کیفیت میں رہی۔ ماہ وش کی خوشی سے لبریز بلند آواز نے فوراً ہی اسے آب و گِل کی سرزمین پر پوری قوت سے لا پٹخا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ ماہ وش اور ماہ پارہ ہاتھ میں گڑیاں اور دوسرے کھلونے تھامے خوشی سے بے حال ماں کے قریب کھڑی تھیں۔ مشکور احمد ذرا فاصلے پر خوشی سے شور مچاتی نواسیوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

''مما...... یہ دیکھیں...... یہ نانا جان نے دلائے ہیں۔ اتنے سارے Toys۔''

ماہ وش کھلونے ماں کے سامنے رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اور مما...... نانا جان نے ہمیں بہت ساری آئس کریم بھی کھلائی تھی۔'' ماہ پارہ نے بھی پُر جوش انداز میں حصہ لیا۔

''مما...... اب ہم ہمیشہ نانو کے گھر رہیں گے۔ دادی جان والے گھر نہیں جائیں گے۔'' ماہ وش نے بڑی معصومیت سے مستقبل کا پلان ماں سے شیئر کیا۔

''اور کیا مما...... نانو کے گھر میں بہت مزہ آتا ہے۔ ہم بہت سارے کارٹون بھی دیکھتے ہیں اور نانا جان ہمیں باہر بھی لے جاتے ہیں۔ Toys دلاتے ہیں، آئس کریم کھلاتے ہیں۔'' ماہ پارہ نے بہن کی تائید کے ضمن میں کہا۔

''سوئٹ کارن بھی دلاتے ہیں۔'' ماہ وش نے بہن کو یاد دلایا۔

''جی مما...... اتنے مزے کے اور اسپائسی ہوتے ہیں۔'' ماہ پارہ کو سوئٹ کارن کے مزے یاد آ گئے۔

ایمن نے بچیوں کا دل رکھنے کے لیے جبری مسکراہٹ کا اہتمام کیا اور مشکور احمد کی طرف دیکھا جو

بچیوں کو خوش دیکھ کر پھولے نہ سما رہے تھے۔
مشکور احمد کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اور چہرے سے تفکرات جھلکنے لگے۔ وہ صوفے پر بہت محتاط انداز میں بیٹھ گئے۔
''اللہ سے دعا کرو! اللہ انھیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دے۔ ان کے نصیب اچھے کرے۔ ان کے ہاتھوں سے بھلائی کے کام لے۔ دنیا کو ان سے راحت وفیض پہنچے۔ ان کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ آمین۔''
''ثم آمین۔'' باپ کی خوبصورت دعا اور آمین کے بعد ایمن نے برجستہ اور بے ساختہ انداز میں ثم آمین کہا تھا۔
''نانا جان ہم لوگ مما اور نانو کو بھی آئس کریم کھلانے لے کر جائیں گے۔ ٹھیک ہے؟''
ماہ پارہ نے ماں کے چہرے پر بکھری اداسی کا فوری حل سوچ لیا تھا کہ شاید ماں آئس کریم نہ ملنے کی وجہ سے اتنی اداس نظر آ رہی تھی۔
ماں کی اداسی دور کرنے کے لیے ایک خوبصورت وعدہ بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنی بات یا وعدے کا تاثر دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ایمن زبردستی بیٹی کا دل رکھنے کے لیے مسکرائی تو ماہ پارہ خوش ہوگئی۔
مشکور احمد دونوں بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے نئے سرے سے کسی خیال کی گہرائی میں اتر گئے تھے۔ ایمن نے پھر نڈھال انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔ دونوں بچیوں کو نئے کھلونے کششِ ثقل کی طرح اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

☆☆......☆☆

''بیٹا وقت پڑنے پر تو گدھے کو بھی باپ بنالیتے ہیں۔ تم ہاتھ پیر جوڑ کر کسی طرح لے آؤ۔'' فردوس بپھرے ہوئے یاور کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے چمکار رہی تھی۔
''میں کیوں جاؤں؟ کیا ضرورت ہے مجھے؟ مجھے ایسی خود سر ہٹ دھرم بیوی نہیں چاہیے۔ اسے شرم نہیں آئی رات کے اندھیرے میں دو بچیوں کو لے کر بغیر بتائے گھر سے نکل گئی۔'' یاور جیسے پھٹ پڑا تھا۔
''ارے بھئی...... اس کی یہ اکڑ بے معنی نہیں ہے۔ وہ کسی بات پر ہی اتنی اکڑ دکھا رہی ہے اور اب سمجھ بھی آ رہی ہے کہ وہ الٹراساؤنڈ کرانے پر کیوں رضامند نہیں ہو رہی تھی۔'' حامد حسین نے کرتے کی جیب ٹٹول کر سگریٹ کی ڈبیہ برآمد کی اور بہت سکون سے گویا ہوئے۔
پان کھانے والے گلوری دیکھ کر اور سگریٹ پینے والے سگریٹ دیکھ کر پیشگی خوش مزاج ہو جاتے ہیں اس لیے حامد حسین کے رگ و ریشے میں اتری دائمی کڑواہٹ وقتی طور پر معدوم ہوگئی تھی۔ سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی لائٹر کی کھٹ کھٹ ماحول میں گونجی اور دھواں پھیلنے لگا...... تیلی دکھانا، دھواں پھیلانا تو ویسے ہی سرشت میں تھا۔
''کیوں رضامند نہیں ہو رہی تھی؟ مجھے تو سمجھ نہیں آئی۔ سمجھائیں مجھے......''

''چپکے چپکے بالا ہی بالا وہ الٹرا ساؤنڈ کرا چکی ہے اور اسے پتا چل گیا ہے کہ اس مرتبہ وہ بیٹا پیدا کرنے جا رہی ہے۔ اب لے گی گن گن کے بدلے۔ خوب ناک میں تنکا چلائے گی۔'' فردوس نے آنکھیں مٹکا کر انگوٹھا بھی چلایا۔

یاور فردوس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ تو اس کے دماغ میں آیا ہی نہیں ایسا کچھ بھی ہوسکتا ہے۔

''کیا کہہ رہی ہیں امی؟'' بس اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

''اور ہاں یہ بھی بتادوں لگے ہاتھ۔'' حامد حسین بولتے بولتے رکے اور دو تین کش ایک ساتھ کھینچے کیوں کہ اب جملہ نہیں پیراگراف پڑھنا تھا۔

اُن کے وقفے سے یاور کی بے تابیِ تجسس کے سمندر کے کناروں سے اُبلنے لگی کہ والدِ محترم نہ جانے کون سی J.I.T رپورٹ پڑھ کر سنانے والے ہیں۔

''اس کی اپنی اوپر کی فیکٹری کام نہیں کرتی۔ یہ پٹیاں اسے اس کی ماں نے پڑھائی ہیں۔ تمہاری ماں نے کئی بار سنا ہے ٹیلی فون پر رو رو کر اپنی ماں کو جھوٹی سچی کہانیاں سناتی ہے۔'' حامد حسین یوں وثوق سے کہہ رہے تھے جیسے کوئی ایماندار گواہ کورٹ میں شہادت دے رہا ہو۔

یاور نے سر جھکا لیا...... جیسے تانے بانے سلجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''لیکن پاپا...... وہ تو کبھی اکیلی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی۔'' یاور نے ایمن کی پچھلی کارکردگی کو ذہن میں رکھ کر باپ کے اندیشوں کو بے معنی قرار دینے کی کوشش کی۔

''ہوناں کل کے بچے...... ارے اپنی ماں کے گھر تو آتی جاتی ہے ناں۔ یہ کام وہیں ہوئے ہیں۔'' فردوس نے بھی عینی شاہد کی اسپرٹ کے ساتھ شوہر سے اتفاق کیا۔

''مگر یاور ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔ بیٹے کی نوید نے بھی اس کی جذباتی حالت میں کوئی تغیر برپا نہیں کیا تھا۔

''لیکن امی...... اسے تو یہ خوش خبری مجھ سے فوراً شیئر کرنا چاہیے تھی۔ اسے پتا ہے کہ ہم سب اس گڈ نیوز کا کتنی شدّت سے انتظار کر رہے ہیں۔'' یاور نے ایک طرح تمام شہادتیں مسترد کردی تھیں۔

''ستا رہی ہے ہمیں۔ ماں کے کہنے پر بدلے لے رہی ہے۔ خود تو مٹی کا مادھو ہے یا پھر اس کی ایک نمبر کی چالاک بہن چمن اس کو Tips دیتی ہوگی۔ کم بخت خود تو اجاڑ ویران ہے۔ بہن کو بھی ویران کرے گی۔''

''ہوں۔'' جتنی دیر ماں نے گل افشانی کی یاور اپنے ذہن کے گھوڑے دوڑانے میں لگا رہا۔

''ہوں۔ کیا؟'' فردوس نے کڑے تیور سے بیٹے کو گھورا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں پتا لگا لوں گا۔''

''یہی تو کہہ رہے ہیں کہ دوڑو...... رام کرو اسے۔ ارے بیٹا پیدا کرتے ہی اگر خلع کا مطالبہ کردیا تو سمجھو ہم تو کہیں کے نہ رہے۔ ہمارے آنگن کا درخت پرائے آنگن میں...... نہ بابا نہ...... ارے جلدی کرو......''

''یہ کیا منہ ہی منہ میں منتر پڑھ رہے ہو؟ مؤکلوں کے بس کی بات نہیں تمھیں خود جانا پڑے گا۔''

فردوس نے ڈپٹ کر سیدھے سادے بیٹے کو مزید ہراساں کیا۔
''جاتا ہوں امی......'' وہ تھکے تھکے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔
''ارے زمین پر بیٹھ کر اس کی جوتیاں سر پر رکھ لینا......بس ایک بار اسے اس گھر میں واپس لے آؤ۔اس کے بعد ہم جانیں ہمارا کام۔'' فردوس نے بڑے گھمنڈ سے گردن اکڑا کر کہا تھا۔
حامد حسین کش لگانے میں مصروف تھے مگر انھوں نے انگوٹھا بیگم کے سامنے کر کے ویلڈن! کا اشارہ کرنے کی فرصت نکال ہی لی تھی۔

☆☆......☆☆

بانو آپا کسی یارِ دیرینہ مہر النساء سے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔
''مہر النساء کیا بتاؤں۔ارے بہت پہنچی ہوئی ہے۔جب اپنی ماں کے گھر جاتی ہے کچھ نہ کچھ لے کر آتی ہے۔لگتا ہے اس کی ماں نے کوئی بڑا عامل کامل پکڑا ہوا ہے۔میرے کسی تعویذ، جھاڑ پھونک کا بیٹے پر اثر نہیں ہوتا۔تم دیکھو تو دیکھتی رہ جاؤ۔ایسا اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے کہ کیا بتائیے۔جیسے شمع کے گرد پروانہ......''
اتنا کہہ کر وہ مہر النساء کی سننے لگیں جو مختلف ٹونے ٹوٹکے بتا کر سہیلی کی اشک شوئی کرنے کے درپے ہو گئیں۔سہیلی کے گھسے پٹے تجربات اور مشورے سن کر فوراً ہی بے زار ہو گئیں۔
بے پتوں کی مولی۔نخرے ایسے جیسے تخت کا وارث دے کر تاج لگا کر بیٹھی ہو۔چلتی ایسے ہے جسے بیس گز کپڑے کی پوشاک پہنی ہو۔جیسے دس کنیزوں نے سنبھالا ہوا ہو......آ کر دیکھو تو سہی کسی دن۔''
''میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم اسے طلاق لے کر دوسری شادی کرو......مگر کیا اولاد کی خاطر مرد دوسری شادی کرتے نہیں ہیں۔''
اسی دوران ثمر نے تھکے تھکے انداز میں لاؤنج میں قدم رکھا تھا اور ماں کا آخری جملہ سن لیا تھا۔چند لمحے تو ششدر سا ماں کی طرف دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر آگے بڑھا اور بریف کیس سینٹرل ٹیبل پر رکھ کے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔
بانو آپا اچانک سامنے ثمر کو پا کر اچھی خاصی حواس باختہ ہو گئی تھیں۔
''مہر النساء میں پھر بات کرتی ہوں......اچھا خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنا موبائل ایک طرف رکھ دیا اور کن انکھیوں سے ثمر کی طرف دیکھا۔ثمر نے بند آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔
''امی جان یہ کیا عجیب سی باتیں کرتی ہیں۔دوسری تیسری شادی۔کیا شادی کرنا کوئی مذاق ہے؟ بس ایک بار ہو گئی تو ہو گئی۔'' اس نے بڑی ناگواری کی کیفیت سے بات کی تھی۔
''ارے واہ......اپنے خاندان کا نام ونشان مٹا دیں۔سر سلامت تو پگڑیاں بہت۔تمھیں عورتوں کی کمی ہے۔ایک سے ایک کنواری مل سکتی ہے۔بچوں والے مرد کو مسئلے ہو سکتے ہیں۔بے اولاد تو سمجھو کنوارہ کا کنوارہ۔''
''امی جان......امی جان......پلیز......شادی ایک سوشل کونٹریکٹ ہوتا ہے۔ایک معاہدہ......نکاح نامے پر کہاں لکھا ہوتا ہے کہ اگر اولاد نہ ہوئی تو جب مرضی یہ معاہدہ توڑ دیا جائے؟'' ثمر نے تھکاوٹ

کے باوجود وکیلوں کی طرح جرح کی......

''ارے معاہدے فائدے کے لیے ہوتے ہیں، نقصان کے لیے نہیں۔ اور پھر ہم کون سا اسے طلاق دلوانے کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تم دوسرا نکاح کرلو۔ تاکہ اس گھر میں تمہارے بچوں کی رونق ہو۔ ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔'' بانو آپا برجستہ بولیں۔

''چھوڑیں امی جان...... اگر مقدر میں اولاد ہے اور ضرور ہے تو پھر چمن سے بھی مل سکتی ہے۔ اگر نہیں ہے تو دس نکاح کر کے بھی نہیں مل سکتی۔ بس اب آپ آئندہ مجھ سے یہ دوسری تیسری چوتھی شادی کی بات نہ کریں۔''

ثمر بے زاری سے کہہ کر اٹھا۔ اپنا بریف کیس اٹھایا اور بیڈروم کی طرف چل پڑا۔ ابھی روٹھی بیوی کو منانے کا کڑا مرحلہ باقی تھا۔ بہت سخت بولا تھا۔ دل پر بہت بوجھ تھا۔ بانو آپا گویا انگاروں پہ جا بیٹھی تھیں۔ بیٹا کیسا ٹکا سا جواب دے کر چلا گیا تھا۔

☆☆......☆☆

چمن کو گاڑی کی آواز سے پتا چل گیا تھا کہ ثمر آچکا ہے۔ مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ ماں سے کچھ کہے سنے بغیر وہ بیڈروم میں نہیں آسکتا۔ جو اس کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھ جاتی تھیں۔ پھر اس کے آنے تک ہلتی نہیں تھیں۔ مبادا ان سے پہلے چمن اسے جالے اور وہ جو کہنے کے لیے تڑپ رہی ہیں وہ دل کی دل میں رہ جائے۔

ایک سرد جنگ جو کسی بھی وقت اچانک شروع ہوتی تھی وہ اسی طرح اچانک ختم بھی ہوجاتی تھی۔ ایک چھوٹا سا جملہ روٹھے ہوؤں کو منانے کے لیے پُل بن جاتا تھا۔ مثلاً آج بہت تھک گیا ہوں...... جواب میں چمن کہتی...... سردبادوں......؟

اور پھر ظالم سماج کی ریشہ دوانیاں لب بستہ کھڑی رہ جاتیں۔ ہونٹوں پر گلاب کھلتے۔ صبح روشن اور آراستہ ہوکر استقبال کرتی۔ اس روز ناشتے پر کوئی خاص چیز بھی ضرور بنتی۔ بانو آپا تسبیح ہاتھ میں پکڑے جاسوسی نظروں سے بہو کے سوکھے گیلے بالوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتیں جو کچن میں کام کرنے کی وجہ سے بڑے سے کیچر میں مقید ہی ملتے۔ اگر چمن کی فریش نیس کا پکا یقین مل جاتا تو دل ہی کڑھنے لگتیں۔

''ہونہہ، کیکر پر انگور چڑھے ہیں بھی...... فضول میں صابن، پانی، شیمپو کا خرچہ...... نان نفقہ بھی تب ہی برداشت ہوتا ہے جب نسلیں پروان چڑھیں۔''

''لگتا ہے آج کام زیادہ تھا۔'' ثمر نے کوٹ اتارا تو چمن نے جھٹ ہاتھوں میں لے لیا۔ جیسے کوٹ نہیں اس کی تھکن ہاتھوں میں سمیٹ رہی ہو۔

''ہوں۔ اب تو درد کی شدت سے چکر آرہے ہیں۔ ایسا کرو ڈسپرین دے دو۔''

''خالی پیٹ ڈسپرین کھائیں گے۔ ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔'' چمن کی طرف سے لاڈ دلار شروع ہوگئے۔

''کچھ کھانے کی ہمت نہیں۔'' ثمر نے ٹائی کے پھندے سے گردن چھڑائی اور چمن کی طرف بڑھا کر گرنے کے انداز میں بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

چمن نے کوٹ ہینگر کیا ٹائی ٹھکانے پر پہنچائی اور ثمر کے قریب بیٹھ کر اس کی شرٹ کے اوپری بٹن کھولتے ہوئے بولی۔

''اُف اتنی تھکن ہے کہ اوپر کا بٹن تک نہیں کھولا۔'' اس کے انداز میں دلار تھا۔ بٹن کھول کر وہ سر دبانے لگی۔ چند سیکنڈ ثمر آنکھیں بند کیے ایک ہی زاویے سے لیٹا رہا۔ پھر اس کے گرم ہاتھوں نے چمن کے ہاتھ تھام لیے۔ حواس مادی گرفت سے آزاد ہونے لگے۔

پھر بہشت شیطان کی مداخلت سے پہلے کا منظر دکھانے لگی...... آدم اور حوا...... شیطان، ہابیل قابیل...... ایک ازلی کہانی، قیامت تک کی کہانی۔

☆☆............☆☆

دھوپ چھاؤں سی زندگی میں پھر ایک خوشگوار صبح نے سواگت کیا تھا۔ ثمر بہت فریش نظر آ رہا تھا۔ ساری تھکاوٹ، سر درد ایک چاہنے والی بیوی نے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیا تھا۔

ناشتا لگا کر وہ ثمر کو تیاری میں مدد دینے کی غرض سے بیڈروم میں آ گئی تھی۔ ثمر تقریباً تیار تھا بس کوٹ پہننا باقی تھا۔ کوٹ بھی چمن پہناتی تھی پھر برش اور اسپرے بھی خود ہی کرتی تھی۔

''کبھی کبھی مجھے اپنی قسمت پر بہت رشک آتا ہے۔ ابھی تک میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکی مگر آپ...... آج بھی وہی ہیں جو شادی کے شروع دنوں میں تھے۔ کوئی چینج نہیں۔''

وہ کوٹ پہناتے ہوئے محبت سے معمور لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''بھئی دے نہیں سکیں...... مگر دینے کے چانس تو ہیں۔'' ثمر نے اس کی پیشانی پر جھولتی لٹ پر شرارت سے پھونک ماری۔

''ہم جوان ہیں۔ بوڑھے تو نہیں ہوئے...... تم اپنے ٹیسٹ کرا چکی ہو۔ تمام رپورٹس پوزیٹو ہیں۔ میں تو ہمیشہ بہت پُرامید رہتا ہوں۔'' لفظ ٹیسٹ سن کر چمن کو عجیب سی تحریک ہوئی۔ وہ کچھ بولنے ہی والی تھی کہ اس نے خود کو روک لیا۔ اتنی حسین صبح وہ کسی بدمزگی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

''پُرامید ہونا تو ذہنی صحت مندی کی علامت ہے۔'' اس نے یونہی کہہ دیا جیسے سر پر پڑا کوئی قرضہ چکا رہی ہو۔

''بھئی میں ذہنی طور پر ہی نہیں جسمانی طور پر بھی بالکل صحت مند اور فٹ ہوں۔'' ثمر نے شرارت سے اس کے رخسار پر اپنا استحقاق ثبت کیا۔

''کیوں خود کو اپنی نظر لگاتے ہیں؟'' اس نے کوٹ پر برش کرتے ہوئے شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ثمر کی نگاہوں کا والہانہ پن آج بھی اسے نظریں جھکانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

وہ اسپرے اٹھا کر کیپ ہٹانے لگی ہی تھی کہ ثمر ایک دم چونک کر بولا جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ ساتھ ہی اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا۔

''اوہ...... میں تو بھول ہی گیا۔'' یار وہ میرا دوست شکیل ہے ناں جو دو سال سے یورپ میں تھا۔ واپس آ گیا ہے۔ کل اس نے فون کیا تھا۔ اس کے ٹوئنس کی برتھ ڈے ہے۔ آج شام میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ تم تیار رہنا۔ امی جان کے لیے کچھ بنا لینا ہم تو ڈنر وہیں کریں گے۔''

ثمر پر اب ایک دم عجلت سوار ہو گئی جیسے شام سر پر ہی آ کھڑی ہوئی ہو۔ جلدی جلدی اپنا والٹ، موبائل، Key Ring اٹھانے لگا۔

''Twins کی برتھ ڈے...... ماشاء اللہ...... دونوں بیٹے ہیں؟'' چمن بھی ایک خوشگوار تقریب میں شرکت کے خیال سے کھل اٹھی۔

''ہوں دونوں بیٹے ہیں۔''

دونوں میاں بیوی نے پلان کیا تھا کہ شادی کے تین سال تک Baby پیدا نہیں کریں گے۔ اللہ میاں نے ایک سال کے اندر اندر Twins دے دیے کہ کرو پلاننگ بچو!''

چمن بھی یہ سن کر ہنس پڑی تھی۔

''بچوں کے لیے گفٹ بھی تو لینا ہو گا۔''

''ہاں ہاں...... میں جلدی آ جاؤں گا...... بس یار لیٹ ہو گیا جلدی سے ناشتا دو۔'' وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا، چمن پیچھے پیچھے تھی۔

☆☆......☆☆

ثمر کے جانے کے بعد چمن ضروری کام نمٹا کر سو گئی تھی۔ رات دیر سے سوئی تھی اور پھر آج برتھ ڈے کے فنکشن میں بھی جانا تھا۔ اس کے گھنے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ بانو آپا نے آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔

دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر انھوں نے دروازہ بند نہیں کیا بلکہ سیدھی چمن کے سر پر جا کر کھڑی ہو گئیں۔ چند لمحے اس کی طرف غور سے دیکھتی رہیں تاکہ اچھی طرح تسلی ہو جائے کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ خوب اطمینان کرنے کے بعد انھوں نے اپنی بند مٹھی کھولی جس میں بہت چھوٹی سی قینچی دبی ہوئی تھی۔ انھوں نے کمال ہوشیاری سے چھوٹی سے بالوں کی لٹ درمیان سے کاٹ لی تاکہ چمن کو فوراً ہی اندازہ نہ ہو سکے کہ اس کے کچھ بال بے ترتیب کٹے ہوئے ہیں۔ بال اور قینچی مٹھی میں دبا کر دل تو چاہا تھا کہ فوراً پھوٹ لیں۔ مگر جتنی احتیاط کی ضرورت آمد کے وقت تھی اس سے دوگنی احتیاط رفت کے وقت درکار تھی۔

بلخ کے انداز میں پنجے گاڑ گاڑ کر چلتی ہوئی باہر نکل گئیں اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا مگر پورا نہیں کیونکہ پورا بند کیے جانے کی صورت میں کھٹکا پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

☆☆......☆☆

وہ کافی دنوں بعد کسی ڈنر میں جا رہے تھے۔ اس لیے چمن نے بہت اہتمام کیا تھا۔ گرے شیفون کی ساڑی جس پر سلور بنارسی چھینٹا پڑا تھا اور چھوٹے چھوٹے اسٹون ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے اور روشنی میں آنکھ مچولی کھیلتے محسوس ہو رہے تھے۔ سادگی میں پرکاری تھی، لباس نہ شوخ تھا نہ سادہ، میک اپ بھی اسی مناسبت سے تھا۔ سفید زرقون کا پورا سیٹ پہنا تھا جس میں ننھی منی سی بندیا بھی شامل تھی۔ گرے ساڑی کی مناسبت سے لپ اسٹک ڈارک میرون لگائی تھی۔

ثمر کی نظر پڑی تو دیکھتا ہی رہ گیا...... شاید اس لیے کہ اس نے کافی عرصے بعد چمن کو اتنے اہتمام

سے تیار ہوا دیکھا تھا۔

''واللہ...... پانچ سال شادی کو ہو گئے مگر تمھیں ابھی تک عقل نہیں آئی۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔ چمن ایک دم ڈر گئی۔

''کیا ہوا......؟ یہ...... یہ ساڑی ٹھیک نہیں؟'' وہ الجھ کر پوچھنے لگی۔

''بھئی غضب ڈھا رہی ہو۔ ڈیڑھ گھنٹہ ڈرائیو تین گھنٹے تقریب میں گزر جائیں گے۔ ساڑھے چار گھنٹوں کی دوری آگئی ہے ہمارے درمیان۔'' اس پر ثمر کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔ چمن نو بیاہتا کی طرح شرما کر رہ گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ شادی کتنی پرانی ہو جائے...... شوہر کا ایک رومانٹک جملہ جست لگا کر وقت کو بہت پیچھے دھکیل دیتا ہے۔

''اچھا جلدی کریں...... زیادہ بنانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ طرح دے کر آگے بڑھ گئی۔

''تعریف اس خدا کی جس نے تمھیں بنا کر ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔'' ثمر نے اپنا سیل فون اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے بڑی ادا سے مسکرا کر چمن کی طرف دیکھا۔ جس کی خم کھاتی کمر میں زندگی ہچکولے لے رہی تھی۔

☆☆......☆☆

''اے بیٹا جا رہے ہو تو پلے کر ہی آنا۔ منہ کی کھا کر مت آنا۔'' فردوس نے یاور کو تیاری کے دوران جا لیا...... یاور نے وائٹ شلوار قمیض پہنا ہوا تھا۔ بہت نکھرا نکھرا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بالوں میں برش چلاتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔

''دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے...... یہ تو وہاں پہنچ کر ہی اندازہ ہو گا کہ کیا سچویشن چل رہی ہے۔''

''آگ لگے پچویشن کو...... جی میں ٹھان کر نکلو کہ بس اسے لے کر ہی آنا ہے۔ ایک بار آ جائے۔ پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔'' فردوس کے انداز میں خود اعتمادی سے زیادہ رعونت تھی۔ یاور نے ایک گہری نگاہ ماں پر دوڑائی تھی۔

''ہلکا ہاتھ رکھیے گا۔ اس بار تو جا رہا ہوں۔ دوبارہ چلی گئی تو سمجھ لیں ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔'' یاور نے بھی اپنی طرف سے پیش بندی کی۔

ارے بس ایک بار پوتا مل جائے...... خدانخواستہ پھر تیسری نیک بخت کا منہ دکھایا تو بھلے ہمیشہ کے لیے چلی جائے...... پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان...... آج تمہاری دوسری شادی کا اعلان کروں تو رشتوں کی قطار لگ جائے۔ خوبصورت اکلوتے بیٹے کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں جس کے پاس اپنی چھت بھی ہو۔ بھلے دو دفعہ شادی کر چکا ہو یا چار دفعہ...... ارے آج کل لڑکے ملتے ہی کہاں ہیں۔'' فردوس تکبر سے گردن اکڑاتی باہر نکل گئیں آخری الفاظ بڑبڑاہٹ کی صورت میں ادا ہوئے تھے۔

☆☆......☆☆

ثمر کے دوست شکیل کے گھر میں رنگ و نور کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ بظاہر بچوں کی برتھ ڈے تھی مگر یوں لگتا تھا آج سب اپنے اپنے ارمان نکالنے پر تل گئے تھے۔ جڑواں بچوں کی برتھ ڈے بھرپور انداز میں انجوائے کر رہے تھے۔ کافی سارے مہمان تو میزبان خصوصی یعنی شکیل کے دونوں بچوں کے ساتھ بیلون پھلا پھلا کر کارپٹ پر ڈھیر لگا چکے تھے۔ کوئی بیلون پھٹتا تو ایک شور غوغا مچتا...... حقیقت تو یہ تھی کہ آج بڑے بھی بچے بنے ہوئے تھے۔ بچوں کی ماں نے اپنی ساری تیاری میں بہت اہتمام کیا تھا۔ سی گرین ساڑی اور ہم رنگ جیولری کے ساتھ اتنی مسرور و شاداں و فرحاں نظر آ رہی تھی گویا خود کو کسی ریاست کی ملکہ تصور کر رہی ہو۔

دونوں بچوں نے سلور گرے کلر کی شیروانیاں اور سیاہ پائجامے زیب تن کیے تھے۔ میچنگ کے کھسے اور تاج پہن کر بالکل شہزادے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ مہمانوں کے رش کے دوران میاں بیوی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تو بہت معنی خیز اپنائیت بھری مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے۔

چمن ایک طرف بیٹھی گویا عمیق مشاہدے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رشک کی کیفیت بہت واضح تھی۔ بڑے دل اور کھلے ذہن کی تھی۔ بچوں پر نظر پڑتی تو ماشاءاللہ ضرور کہتی۔ آج کی تقریب اسے ایک انجان سے خالی پن کا احساس دلا رہی تھی۔ جسے کوئی نام دینے کے لیے شاید الفاظ ہی دریافت نہیں ہوئے تھے۔

یوں ہی ایک خیال القاء ہوا...... جس میں شدت اور جم جانے کی بہت توانائی تھی۔ دل سکڑا...... سمٹا...... سمٹ کر پوری قوت سے پھیلا...... اس کے مقدر میں یہ خوشیاں نہیں ہیں...... نوشتہ نہیں وہم تھا...... مگر یقین کی طاقت سے لبریز تھا...... وہ اپنے ہی خیال سے خوف کھا گئی۔

''یہ میں کیا اول فول سوچ رہی ہوں...... لاحول ولاقوۃ......''

یہ اُمید کیوں انگلی چھڑا کر بھاگ گئی......؟

یہ میرے دائیں بائیں بیٹھے فرشتے کیا کر رہے ہیں؟

دیکھتے نہیں اُمید سرپٹ دوڑ رہی ہے...... ارے اسے پکڑو۔ کہیں گم نہ ہو جائے۔ جانے اس کے چہرے پر کیسی فلم چل پڑی تھی کہ ثمر جو اپنے کسی دوست سے دلچسپ لطیفہ سن کر ہنس رہا تھا۔ چمن پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ ہنسی ایک دم غائب ہوگئی۔ ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر تیز تیز چلتا چمن کے پاس آیا۔

''کیا ہوا چمن...... طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

چمن کی روح مڈغاسکر کے غاروں سے راہ ڈھونڈتی ماحول میں واپس آئی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ثمر کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' ثمر پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

''اوہ...... نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں...... پلیز آپ انجوائے کیجیے۔''

''Really are you ok?'' ثمر کو اس کے جواب سے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

''جی...... میں بالکل ٹھیک ہوں...... پتا نہیں آپ کو کیوں لگ رہا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ پلیز آپ انجوائے کیجیے۔''

''ارے ذرا سا صبر کر لو یار...... ایک منٹ بیگم سے بات نہ ہو تو تمہاری حالت غیر ہونے لگتی ہے...... یار...... بیگم ہے ساتھ گھر ہی جائے گی، گرل فرینڈ تو نہیں جو راستے میں اُتر جائے گی۔'' شکیل کی بیلون پھلاتے ہوئے دونوں پر نظر پڑی تو اس نے فوراً جملہ چُست کر دیا۔ بے اختیار قہقہے بلند ہوئے تھے۔

بیلون پھلا کر کچھ Indoor گیمز ہوئے جن میں بچوں، بڑوں سب نے حصہ لیا۔ ایک بہت خوبصورت چینی گڑیا کے لیے قرعہ اندازی ہوئی۔ جس میں حصہ لینے کا طریقہ کار یہ تھا کہ سب مہمان اپنی پسند کا ایک انگلش حرف تہجی لکھ کر ایک جار میں ڈالیں گے ساتھ میں اپنا نام بھی لکھیں گے۔ گڑیا کے پاؤں پر ایک حرف تہجی پہلے ہی لکھ کر میزبان نے اسے اس کے شوز پہنا دیے تھے۔

اس گیم میں سب بچوں بڑوں نے حصہ لیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ اگر کئی مہمانوں نے وہ حرف لکھا جو گڑیا کے پاؤں پر لکھا ہوا ہے تو پھر ایک قرعہ اندازی ہوگی اور ایک پرچی اٹھائی جائے گی جس کا نام نکلے گا گڑیا اس کی۔

سب مہمانوں نے اس گیم کو بہت انجوائے کیا۔ پرچیاں ڈالی گئیں پھر کھولی گئیں۔ نوٹوں کی طرح سیدھی کر کے یکجا کی گئیں۔ پھر گڑیا کے پاؤں سے جوتا اُتارا گیا۔ گڑیا کے پاؤں پر ''O'' لکھا ہوا تھا۔ ''O'' لکھنے والوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر نعرے لگانا شروع کر دیے۔ O لکھنے والوں میں چمن بھی شامل تھی۔ میزبان نے کراؤڈ کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یاد دلایا کہ ابھی ''او'' لکھنے والوں کی پرچیاں الگ کی جائیں گی، اور ایک اور قرعہ اندازی ہوگی۔ اس کھیل میں Foul کھیلنے کی ذرا برابر گنجائش نہیں تھی کیوں کہ تمام مہمان حرف لکھ کر میزبان کے حوالے کر چکے تھے۔ بہت ہی غیر متنازعہ کھیل تھا۔ سب پُرسکون ہو کر بیٹھ گئے۔ جار میں اب ''او'' لکھنے والوں کی پرچیاں ڈالی گئیں۔ اور سب سے

چھوٹے ایک مہمان بچے کو بلا کر پرچی نکلوائی گئی۔ میزبان نے پرچی کھول کر سب کے سامنے لہرائی۔ اس پر چمن کا نام لکھا ہوا تھا...... ایک مرتبہ پھر فلک شگاف شور وغوغا شروع ہوا......

چمن گھبرا کر شرما کر سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شکیل کی بیوی ربیعہ نے بڑی سی جائنٹ گڑیا اٹھا کر چمن کو پیش کی۔ زبردست تالیاں بجنے لگیں۔

''اللہ میاں تو ٹائم لے رہے ہیں۔ فی الحال اس سے دل بہلاؤ...... زیادہ وزنی نہیں ہے مشکل سے بارہ پونڈ کی ہوگی۔'' شکیل نے چمن کو گڑیا تھماتے ہوئے ثمر کو مخاطب کیا۔

''اچھی خاصی Healthy ہے...... بارہ پونڈ بہت ہوتا ہے۔''

''بھابی آپ پریشان نہ ہوں...... آپ بارہ پونڈ کی گڑیا کے لیے تیاری نہ کیجیے گا۔ سات پونڈ کا بھی Healthy Baby ہوتا ہے۔'' ایک دوست کی بیوی نے گرہ لگائی۔ زبردست قہقہوں کے بیچ چمن کے دل پر سناٹے اترنے لگے۔

''اسے یوں لگا سب اس کی محرومی پر ہنس رہے ہوں...... وہ دل کا درد چھپا چھپا کر مسکرانے کی اداکاری کر رہی تھی۔ البتہ ثمر بہت انجوائے کر رہا تھا۔ اب کیک کٹنے کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ دونوں بچے درمیان میں کھڑے تھے اور ان کے ماں باپ دائیں بائیں۔ سنہری دستے کی تلوار کی شیپ کی چھری سے کیک کاٹا گیا زبردست تالیوں اور ہیپی برتھ ڈے کی آوازوں نے ماحول میں خوشیوں کے ایسے رنگ بکھیرے کہ لگا خوشیاں اسی گھر کے لیے تخلیق ہوئی ہیں۔ جس کے پاس سہولتوں سے مزین گھر ہو۔ آرام دہ سواری ہو، اتفاق وامن ہو۔ دل پسند خوراک ہو۔ اور ایک مرتبہ کی کوشش سے دوہری خوشیاں مل گئی ہوں...... اسے کیا خبر اداسی وغم کس بلا کا نام ہوتا ہے۔ چمن خاموش بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ پھر اسے یکدم خیال آیا کہ وہ بھی تو کم خوش نصیب نہیں۔ ثمر جیسا شریکِ سفر جو نااُمید ہونا جانتا ہی نہیں...... محبت اس کا مقدر ہے۔ اداسی اس نے گرہ سے خریدی ہے۔ ورنہ خوش ہونے کا موقع تو قدرت نے اسے بھی دیا ہے۔ دوسروں کی خوشیوں کو منانا بھی تو بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خوشی تو ایک کیفیت کا نام ہے۔ اور کیفیت کسی فارمولے کی محتاج نہیں ہوتی۔

اب وہ خود کو سمجھانے لگی...... انسان خود کو کتنی مشکلوں میں ڈال دیتا ہے۔ خود کو سمجھا سمجھا کر جینا بھی کوئی جینا ہے؟ اس نے اب بڑی حقیقت پسندی سے سوچا۔ کھانا لگ چکا تھا۔ ایک بھرپور ڈنر تھا، جس میں انواع واقسام کے کھانے بٹیریں، میرپور خاص کے چڑے تک شامل تھے۔

''چڑیاں کتنی اداس ہوں گی۔'' چمن نے پلیٹ میں سلاد نکالتے ہوئے ثمر سے شرارتاً کہا۔

''چڑیاں تمہاری طرح نہیں ہوتیں...... انھوں نے بدین جاکر نئے بوائے فرینڈ بنا لیے ہوں گے۔'' ثمر نے برجستہ کہا تھا۔ آس پاس کھڑے دوستوں نے سن کر زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

ثمر کے اس جملے نے البتہ چمن کو بہت اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ وہ اس کے مزاج کی ہر ہر لہر کو گنتا رہا ہے۔

☆☆......☆☆

''اسلام علیکم بابا!'' مہ وش ومہ پارہ باپ کو دیکھ کر خوشی سے کھل اُٹھی تھیں اور بے ساختہ اس کی

ٹانگوں سے لپٹ گئی تھیں۔ یاور جگر کے ٹکڑوں کی بے ساختگی دیکھ کر ماں باپ کے پڑھائے سارے سبق آن واحد میں بھول گیا تھا۔ اس نے چھوٹی کو ایک دم گود میں لے لیا اور اس کے گال پر پیار کیا......

''پاپا کو بتایا بھی نہیں...... چپکے سے نانو کے گھر آ گئیں؟'' یاور نے محبت سے بچی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

ایمن بچیوں کے شور سے سب کچھ جان چکی تھی۔ حیران حیران سی لاؤنج میں کھنچی چلی آ رہی تھی۔ یاور نے ایک چور مگر جانچتی نظر سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اسلام علیکم! وہ زیرلب بولی تھی۔ ناراض تھی، دل میں بہت رنجشیں و کدورتیں تھیں مگر کوئی چل کر آیا تھا...... اس ایک بندھن کا احساس دلانے جسے وہ اپنی دانست میں توڑ کر آ گئی تھی۔ یاور نے ماہ پارہ کو گود سے اتار دیا اور ایمن کی طرف دیکھ کر بہت آہستگی سے پوچھا۔

''کیسی ہو...... حساب چکا کر دل میں کچھ ٹھنڈک سی تو محسوس ہوئی ہوگی...... غصہ بھی اتر گیا ہوگا۔ اب تو آرام سے بات ہو سکتی ہے ناں؟''

''ایمن کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں...... جلدی سے بیٹھ گئی۔ اعصاب اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ ذرا سا دباؤ پڑتا تو چکر آنے لگتے۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ہم آرام سے بات کریں۔ غصے میں تو اندر کا زہر نکالا جاتا ہے۔ بات تو آرام ہی سے ہوتی ہے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ بچیاں حیران حیران سی ٹکر ٹکر ماں باپ کی صورتیں تک رہی تھیں۔ ایمن کو ایک دم ان کی موجودگی کا احساس ہوا۔

''بیٹا نانو کو بتاؤ کہ پاپا آئے ہیں۔'' اس نے بچیوں کو ٹہلایا۔

''میں بتاؤں گی۔'' مہ وش دوڑی۔

''نہیں...... میں بتاؤں گی......'' اب ایک نیا مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر ایمن کی توجہ ساری کی ساری یاور کی طرف تھی۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ وہ کیوں آیا ہے؟ اگر وہ لینے آیا ہے تو وہ انکار کر دے گی۔ اگرچہ اسے سامنے پا کر رفاقتوں کے سارے کھٹے میٹھے موسم یاد آ رہے تھے۔ نگاہوں کے سارے رنگ، محبتوں کا احساس دلاتی، غضب کی آگ برساتی نگاہیں تو زندگی کا سب سے آسان نصاب تھیں جو پل پل یاد رہتا تھا۔

''اس طرح چھوڑ کر آ گئیں جیسے ہمارا تمہارا کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔'' یاور نے غصے کی انتہا کو کمال مہارت سے شکوے میں بدل دیا۔

''یونہی لگ رہا تھا کہ ہمارا اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ تعلق محسوس ہوتا تو وہاں سے آنا اتنا آسان نہ ہوتا۔'' ایمن نے انگلیوں کی پوروں میں آنسو جذب کرتے ہوئے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ جواب فطری تھا اس لیے اسے الفاظ ترتیب دینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

''غصہ بھی اسی پر نکلتا ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں۔ محلے والوں پر تو نہیں برستے۔'' یاور نے حسب استطاعت اظہارِ محبت کرنے کی کوشش کی۔ کیوں کہ ماں کی پڑھائی پٹیوں میں یہ گلابی رنگ کی پٹی شامل نہیں تھی۔ اُدھر ویسے ہی گلابی رنگ کا قحط تھا۔ صرف لال سرخ رنگ کا غلبہ دکھائی دیتا تھا۔

''اچھا چلو...... اپنی چیزیں سمیٹو...... میں تمہیں لینے آیا ہوں...... باقی باتیں گھر جا کر کریں گے۔''

''وہ میرا گھر نہیں ہے یاور...... وہ گھر اس کا ہوگا جو آپ کی ماں کو پوتا دے...... مجھ سے اس حال میں دن رات کی اذیت برداشت نہیں ہوتی۔ آپ میری طرف سے چار شادیاں کرلیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

''پاگل ہوئی ہو؟ اتنا آسان ہے یہ؟ تم میرے تیسرے بچے کی ماں بننے جارہی ہو۔ Aviod کیا کرو...... امی اور ابا جان کی عمر ہی ایسی ہے۔ اس عمر میں لوگ ٹیمپرامنٹ کھو دیتے ہیں۔ چڑچڑے ہوجاتے ہیں۔ بڑے ہیں کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگیا۔''

''کچھ کہہ دیں تو برداشت ہوجائے۔ وہ تو کچھ نہیں چھوڑتے۔'' ایمن نے تڑپ کر یاور کی بات کاٹ دی تھی۔ اذیت دہندہ کے لیے نرمی کی خواہش نے نئے سرے سے زخم ہرے کردیے تھے۔

''تمہارے یہ بدلے بدلے انداز...... یقین کرو ایمن تم نے اس وقت مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ اتنا کمزور بھی نہیں ہے ہمارا رشتہ۔''

''اس گھر میں آئے دن اب آپ کی دوسری شادی کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ اگر آپ ان کے ساتھ نہیں ہیں تو کچھ بولتے کیوں نہیں۔ امی جان ہر وقت مجھے سناتی رہتی ہیں کہ آج نہیں تو کل وہ نئی بہو لے آئیں گی۔'' ایمن پھٹ پڑی آنسوؤں کا ریلہ بہہ نکلا۔

''پاگل ہو تم...... وہ میرے بغیر بہو لینے جاسکتی ہیں۔ میں شادی کے لیے ہاں کروں گا تو نئی بہو آئے گی...... بے وقوف نہیں تو...... جب مجھے دوسری شادی کرنا ہی نہیں تو میں اس ٹاپک پر فضول سی بحث کیوں کروں...... ایک چپ دس مسئلوں سے بچاتی ہے۔ وقت بچاتی ہے۔ فضول بات سے بچاتی ہے۔'' یاور ایک تسلسل سے بول رہا تھا۔ ایمن کے لیے یہ سب کچھ اتنا حیران کن تھا کہ وہ آنکھیں پھاڑ کر یاور کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆......☆☆

نواسیوں سے اطلاع مل گئی تھی کہ یاور آیا ہے۔ مگر عطیہ بیگم کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ اس کے سامنے جائیں۔ مشکور احمد سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ عطیہ بیگم نے انھیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ خاصی دیر خود سے الجھتی رہیں پھر مزید صبر نہ ہوسکا تو لاؤنج میں چلی آئیں۔ یاور ساس کو دیکھ کر سروقد کھڑا ہوگیا۔

''اسلام علیکم آنٹی!'' بچیاں بھاگ کر باپ کے دائیں بائیں کھڑی ہوگئیں۔ نانا نانی کے پیار نے جیسے خوف کی وہ دیوار گرادی تھی جو دادا دادی نے کچی مٹی سے تعمیر کی تھی۔ خون کے رشتوں کے مابین تعمیر ہونے والی دیوار کچی مٹی کی ہی تو ہوتی ہے۔ جسے ڈھانے کے لیے کسی سیلابی ریلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ موسم کا بہانہ بھی کافی ہوتا ہے۔

''جیتے رہو بیٹا...... خیریت سے آئے ہو؟'' عطیہ بیگم نے یوں کلام کیا جیسے محبتوں و بھروسوں کے طویل سلسلے درمیان میں رہے ہوں۔

''جی...... اللہ کا شکر ہے...... ایمن کو لینے آیا ہوں۔'' یاور نے نظریں چرا کر کہا تھا۔

''اچھی بات ہے بیٹا...... مگر تم بُرا مت ماننا...... ایمن اب اس طرح نہیں جائے گی جیسے آج تک

آ کر جاتی رہی ہے۔'' عطیہ بیگم نے طول دیے بغیر ٹو دی پوائنٹ بات کی۔

یاور بری طرح چونک پڑا تھا۔ اس کے خیال میں تو رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل جانے والی بیوی کو وہ لینے آ گیا تھا تو یہ بیوی کی سات پشتوں پر احسانِ عظیم تھا۔

''میں سمجھا نہیں......'' وہ خاصا فکر مند نظر آنے لگا تھا۔

''آرام سے بیٹھو بیٹا...... بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں۔'' عطیہ بیگم نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساتھ ہی ایمن کی طرف دیکھا۔

''بیٹا...... یاور کو کھانے، چائے پانی کا پوچھو۔''

''تھینک یو آنٹی...... کھانا تو میں نے امی پاپا کے ساتھ کھا لیا تھا۔ انھوں نے ہی اصرار کیا کہ سنڈے کا انتظار مت کرو ابھی جا کر ایمن اور بچوں کو لاؤ۔''

ایمن حیرت سے منہ کھول کر یاور کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ جبکہ عطیہ بیگم نے حیرت چھپانے کی کوشش میں ایمن کی طرف دیکھا تھا۔

''امی جان کہہ رہی تھیں بچوں کے بغیر تو گھر کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ وقت نہیں کٹتا......'' یاور مزید گویا ہوا۔

''یہ کہہ رہی تھیں فردوس بیگم...... مگر وہ تو پوتیوں کو انسان ہی نہیں مانتیں۔ اتنی جلدی خیالات کیسے بدل گئے؟'' عطیہ بیگم سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ سفید جھوٹ پر نیلی پیلی ہونے لگیں۔ آخر داماد نے سمجھا کیا تھا۔ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسا چلا آ رہا تھا۔ کون سی سالوں پرانی بات تھی۔ ابھی کل ہی تو ایمن کس بُرے حال میں یہاں آئی تھی۔ پیاس برداشت کرتے ہوئے ہونٹ سفید لکڑی ہو رہے تھے۔ دو گھنٹے تک جو بات کرنے کے قابل نہ تھی۔

''آنٹی غصے میں تو سب ہی اُلٹا سیدھا بول جاتے ہیں۔''

''دیکھو بیٹا...... میں ٹھہری عورت ذات...... جس کی گواہی بھی آدھی...... اس لیے کہ فوراً جذباتی ہو جاتی ہے...... مشکور صاحب سو رہے ہیں۔ وہ کیوں کہ میڈیسن لے کر سوتے ہیں اس لیے ہم کتنی بھی ضروری بات ہو انھیں جگاتے نہیں ہیں۔ صبح کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے، تم آرام سے سو جاؤ...... گھر فون کر کے بتا دو...... صبح مشکور صاحب کے سامنے بات کر لیتے ہیں۔ ایمن واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئی مگر ہم ماں باپ ہیں...... ہر طرح سے بیٹی کو بسانے کے راستے ڈھونڈیں گے۔''

''کیا مطلب؟ واپس جانے کے ارادے سے نہیں آئی؟'' یاور نے بمشکل دماغ کی طرف چڑھتے بخارات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

''آدھے گھنٹے میں پانچ گلاس پانی پیا...... پانی تک نہیں تھا تمہارے گھر میں اس کے لیے۔ ایک گھنٹہ اور دیر سویر ہو جاتی تو میرے منہ میں خاک کوئی بڑا نقصان ہو جاتا۔''

''ٹھیک ہے آنٹی...... اگر آپ کو یقین ہے کہ میرے گھر میں اسے نہ کھانے کو ملتا ہے اور نہ ہی پینے کو پانی تو پھر معاملہ ایک طرف ہو جانا چاہیے...... میں کل امی جان اور پاپا کو لے کر آتا ہوں۔ بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔'' یاور لحاظ کی زنجیروں کی جکڑن برداشت کرتے کرتے اُٹھ کھڑا ہوا۔

بچیوں پر ایک نظر ڈال کر اس نے گویا چھاگل سے ہونٹ گیلے کیے اور بڑے سکون سے گویا ہوا۔ نظریں ایمن کی طرف تھیں۔

''رات کے اندھیرے میں نکلنے والی عورت کو کون شوہر سر جھکا کر لینے آتا ہے۔ یہ ہمت شاید میں نے ہی کی تھی، وہ بھی اولاد کی خاطر...... خدا حافظ'' یہ کہہ کر اس نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ مہ وش اور ماہ پارہ جو بات نہیں سمجھ سکتی تھیں مگر ماحول کو سونگھ تو سکتی تھیں۔ دبکی بیٹھی تھیں۔ باپ کو جاتا دیکھ کر ماں کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''ماما...... پاپا ہمیں نہیں لے کر جا رہے......''

یاور جا رہا تھا...... ایمن کے دل میں کچھ ہو رہا تھا۔ قربتوں کی انتہا کو چھونے والا رشتہ پل میں اتنا دور محسوس ہو رہا تھا جیسے برسوں پہلے کسی بھرے بازار میں ٹکراتے بچے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... بچیاں سہم کر ایمن کے آنسو صاف کرنے لگیں۔ عطیہ بیگم نے ایمن کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''تمہارے بابا یاور سے خود بات کریں گے۔ وہ چاہتے ہیں یاور تمہارے لیے الگ چھوٹے سے گھر کا انتظام کریں۔ یہ عورت کا شرعی حق ہے۔ شریعت عورت کو شوہر کے ماں باپ کے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے پر مجبور و پابند نہیں کرتی۔ اور جب ایک نہیں دو دو جانوں کا سوال ہو تو مصلحت جُرم ہے۔ فکر نہ کرو بیٹا...... ماں باپ زندہ ہیں۔ تمہارے سکھ کے لیے جو کر سکتے ہیں کریں گے۔ باپ کے گھر میں ماں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھی ہو...... خبردار رونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ امن کی پیشانی چوم کر اس کی پُشت سہلانے لگیں۔

''ماما جس لمحے پوری قوت کے ساتھ مظاہرہ کرتی ہے۔ خدا بھی اپنا قلم چوم لیتا ہے۔

☆☆......☆☆

دوسروں کی خوشیوں میں دل کھول کر خوش ہونا چاہیے۔ جو دل بڑا کر کے جیتے ہیں اصل میں زندگی تو وہی جیتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تم 'ٹوئنز' کی ہیٹ ٹرک کرو گی...... چار سال میں چھ بچے۔''

چمن ساڑی اتار چکی تھی۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں آئینے کے سامنے بیٹھی جیولری اتار رہی تھی۔ ثمر چینج کر کے ڈریسنگ سے باہر آیا تو اس نے چمن کے چہرے پر پھیلی گہری سوچ کے پرچھائیں سے جیسے بہت کچھ پڑھ لیا۔

چمن نے چونک کر ثمر کی طرف دیکھا۔ اور مسکرانے لگی......

''اللہ کا شکر ہے میں دوسروں کو خوش دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہوں...... اور چاہتی ہوں جہاں تک نظر جائے بس خوش باش چہرے دکھائی دیں۔ میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھ کر سو بار ماشاء اللہ تو کہا ہوگا۔ آخر آپ نے مجھے سمجھا کیا ہے؟'' وہ اُٹھ کر ثمر کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی جیسے لڑنے کو تیار ہو۔

''دیکھو بی بی...... رات بہت ہو گئی ہے۔ بس اب تک جتنا سمجھ سمجھا لیا کافی ہے۔ اگر زیادہ بولیں تو بولتی بند کر دوں گا۔'' ثمر نے شرارت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے چمن اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

ایم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ

ہم شکل

ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی،
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔
"اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے سات ہم شکل بنائے ہیں......"
کیا یہ روایت دُرست ہے؟
اسی روایت کی کھوج میں موت سے پنجہ کش اُس سرکش نوجوان کی
ناقابلِ فراموش داستان......
کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟
کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟

ایک انوکھی داستان...... جو ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں دھوم مچا رہی ہے
آپ بھی پڑھنا مت بھولیے اور ناول ہم شکل کا حصہ بن جائیے

اسی وقت ثمر کے موبائل پر Ring ہوئی تھی۔

''اوفوہ...... یہ اس وقت کس شیطان نے شر پھیلایا ہے؟'' اس نے کوفت سے منہ بنا کر اپنے سیل کی طرف دیکھا تھا۔

آگے بڑھ کر سیل اٹھا کر کالر کا نام دیکھا۔ ندا کا نام بلنک ہو رہا تھا۔

''یعنی کہ حد ہوگئی بے وقوفی کی...... یہ کوئی وقت ہے فون کرنے کا۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے لائن کاٹ دی...... چمن غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کون ہے؟''

''ارے ہے ایک بے وقوف سی لڑکی۔ میرا بس چلے تو کل ہی اسے شوکاز دکھا کر فارغ کر دوں...... ذرا سی دیر میں سر میں طوفان اٹھا دیتی ہے۔ پیالی میں طوفان اٹھانا تو سنتے آرہے ہیں یہ چمچے میں آندھیاں چلا سکتی ہے۔''

''ثمر...... ثمر...... کیا ہو گیا ہے آپ کو...... بولتے ہی چلے جا رہے ہیں۔'' چمن نے پریشان ہو کر ٹوکا۔

''محبت کا اثر ہو گیا ہے...... یا شاید جنات کا...... اہلِ جنات میں سے ہی لگتی ہے...... بولتی ہے تو رکتی ہی نہیں ہے...... جیسے بریک فیل ہو گئے ہوں...... سارے موڈ کا ستیاناس مار دیا...... دھت تیرے کی۔''

ثمر نے پہلے سیل ایک طرف اچھالا...... پھر خود بیڈ پر ڈھے گیا اور اپنا سر پکڑ لیا۔

چمن گھبرا کر سرہانے بیٹھ گئی اور ثمر کا سر دبانے لگی۔

''کک...... کون ہے یہ...... آخر پرابلم کیا ہے آپ کا موڈ کیوں خراب ہو گیا۔''

''Leave it...... نیو انٹری ہے آفس میں...... جی تو چاہتا ہے کھڑے کھڑے نکال دوں مگر بہت کم عمر اور بے وقوف سی ہے۔ ضرورت مند بھی لگتی ہے۔ میں لاسٹ Days چھٹیوں پر تھا یا شاید آؤٹ ڈور میٹنگز میں بزی تھا تب حمزہ صاحب سے اپائنٹ کیا ہے۔ شاید سفارشی ہے...... نان ایکسپرینسڈ۔''

''تو پوچھ لیں بے چاری کیوں کال کر رہی تھی۔ ہوسکتا ہے اسے آفس میں کوئی پرابلم ہو اس وجہ سے۔'' چمن کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ثمر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''صبح نہیں ہو گی کیا......؟ آفس کی پرابلم آفس میں ہی ڈسکس ہوتی ہیں۔ یہاں رکھی ہوئی ہے۔'' ثمر نے چڑ کر اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ چمن کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''توبہ...... میں بھی پتا نہیں کیا ہیڈک ہے کہ اتنی رات کو کال آرہی ہے۔ شکر ہے یہاں ہی رکھی ہوئی ہے۔ یہاں نہیں رکھی ہوئی۔''

چمن نے پہلے ثمر کے سر پر ہاتھ رکھا پھر دل پر......

''یہاں تو تم پنجے گاڑ کر بیٹھی ہوئی ہو۔'' ثمر نے چمن کا ہاتھ کھینچ کر خود سے قریب کیا۔

''پنجے گاڑ کر...... کیا مطلب؟'' چمن نے ہنستے ہوئے خود کو سنبھالا۔ ''مجھے چڑیل سمجھتے ہیں؟''

''تم مجھے بھوت سمجھ لو...... چڑیل اور بھوت کا Pair تو بنتا ہے ناں؟''

چمن کھلکھلا کر ہنس پڑی...... اس بے خبر کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ بانو آپا اس وقت گھر میں جلے پیر کی بلی

بن کر منڈ گشت کر رہی ہیں۔

بہو بن سنور کر بیٹے کے ساتھ باہر گئی تھی...... دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اب کمرے سے ہنسی کی آواز بھی باہر گئی تھی......

آخر اس نے کس سے ثمر پر کالا جادو کرایا ہے کہ شاہ صاحب کے سارے تعویذ بے اثر ہو رہے تھے۔ وہ فکر مندی سے سوچ رہی تھیں...... ہرے اور نیلے کرارے نوٹ جو پرس سے نکال کر شاہ جی کے چندہ بکس میں جا چکے تھے آنکھوں کے سامنے اڑتے دکھائی دیے۔ تو سینے پر ہاتھ رکھ کر کلیجہ تھام لیا۔

☆☆......☆☆

''بیٹا ہماری بیٹی بن کر نہیں اپنی بچیوں کی ماں بن کر سوچو۔ جب اولاد کی بھلائی کا سوچو گی تو خود بخود تمہارے اندر صبر و برداشت پیدا ہو گی۔''

مشکور احمد کو جیسے ہی صبح سویرے پتا چلا کہ یاور ایمن کو لینے آیا تھا مگر ایمن نے جانے سے انکار کر دیا تو وہ معاملہ مزید بگڑ جانے کے خیال سے متفکر ہو گئے۔ اور لگے ایمن کو سمجھانے۔

''بابا...... برداشت کرتے کرتے تو یہ نوبت آئی ہے کہ برداشت جواب دے گئی ہے۔ مجھے جان سے مار دیں مگر میری بچیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ میری برداشت سے بہت زیادہ ہے۔'' ایمن بولتے بولتے رو پڑی۔

عطیہ بیگم نے شوہر کی طرف یوں دیکھا جیسے نظروں ہی نظروں میں قصائی کہہ رہی ہوں۔ ایمن کے آنسو دیکھ کر مشکور احمد ایک دم آزردہ نظر آنے لگے اور بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بیٹا...... وہ لینے آیا تھا اس کا مطلب ہے کہ اس کے دل میں تمہارے لیے گنجائش ہے۔ تم نے اسے خالی ہاتھ لوٹا کر مردانہ انا کو للکارا ہے۔ اب بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''تو کیوں آئے......؟ نہ میں نے بلایا اور نہ میں چاہتی ہوں اب دوبارہ وہ یہاں آئیں۔ اگر آپ مجھے اور بچیوں کو بوجھ سمجھ رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ کہیں جاب کر لوں گی۔'' ایمن اسی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو ایمن...... تمہارے باپ کی تو پینشن اتنی آتی ہے کہ لوگوں کو آج کل اتنی سیلری نہیں ملتی...... میرے پاس جو جمع پونجی ہے وہ تم دونوں بہنوں ہی کی تو ہے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بچیوں کا باپ الحمدللہ زندہ ہے۔ اللہ اسے جیتا رکھے۔ باپ کے ہوتے ہوئے بچے باپ کی شفقت سے کیوں محروم کیے جائیں۔''

''آپ کو بتایا تو ہے کہ اس گھر میں بیٹیوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ وہ بیٹیوں کو اولاد نہیں لاکھوں کا خرچہ کہتے ہیں۔ میری ساس کہتی ہیں میرا بیٹا کیا داماد وں کے لیے خون پسینہ ایک کرتا ہے؟'' ایمن نے بمشکل آنسو روک کر سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہ تو تمہارے ساس سسر کہتے ہیں...... یہ ان کی سوچ ہے...... یاور اپنے بچوں کی خاطر رات کو آیا تھا ناں...... اپنے دل سے مجبور ہو کر...... ورنہ اسے کون مجبور کر سکتا تھا؟'' مشکور احمد نے پھر ایک مضبوط دلیل دی۔

''مجھے تو حیرت ہے کہ وہ آخر آ کیسے گئے؟ اور وہ بھی ہمیں لے جانے کے لیے۔'' ایمن نے عطیہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا جو بادلِ نخواستہ خاموش بیٹھی تھیں۔ محتاط اس لیے تھیں کہ معاملہ بہت نازک تھا۔ شوہر کے سامنے دلیل بازی سے آئندہ کسی نقصان کی ذمہ داری بھی ان پر آ سکتی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی سن رہی تھیں کہ مشکور احمد اب آخری بات کیا کرنے والے ہیں...... اس کے بعد ہی فیصلہ کرتیں کہ انھیں اب کیا کہنا چاہیے۔

''میرے لیے یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ یاور تمھیں لینے آیا تھا۔ اب میں اس سے بات کرتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے الگ گھر کا بندوبست کرے۔ تمہاری شادی اس کے ساتھ ہوئی ہے، اس کے ماں باپ کے ساتھ نہیں۔'' اب مشکور احمد نے وہی بات کہی جو وہ عطیہ بیگم سے کر چکے تھے کہ اگر یاور واقعی کسی وقت ایمن کو منانے آ گیا تو ان کی طرف سے یہ شرط رکھی جائے گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب ایمن کسی طرح بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہ ہو۔

''آپ بات کر کے دیکھ لیں...... مگر مشکل ہے کہ وہ شرط مانیں۔'' ایمن نے بڑے وثوق سے کہا تھا۔ اب بہر حال وہ قدرے پُرسکون نظر آ رہی تھی اسے پتا تھا کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ یاور ماں باپ کے اشاروں پر چلنے کا عادی ہو چکا ہے۔ خود سے کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتا۔

''میں نے اسے رات یہی کہا تھا...... اگر وہ واقعی بچوں کی خاطر آیا تھا تو پھر کچھ نہ کچھ ضرور سوچے گا۔'' عطیہ بیگم فطری طور پر یکسر نا امید ہونے والوں میں سے نہیں تھیں۔ اور اُسی روایتی سسرالی تنازعہ ہی سمجھ رہی تھیں جس کو عقل سمجھ استعمال کر کے انجام تک پہنچایا جا سکتا تھا۔

اور ایمن کا یہ حال تھا کہ ماں باپ کی باتیں کسی دیوانے کا خواب محسوس ہو رہی تھیں۔ یاور اپنے ماں باپ کے آہنی شکنجے سے اپنا وجود چھڑانے میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟ سوئی ہر بہلاوے پر یہیں آ کر اٹک رہی تھی۔

☆☆......☆☆

ثمرا کاؤنٹ کا وزٹ کر کے ابھی اپنی کرسی پر سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ندا حواس باختہ گرتی پڑتی اندر داخل ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک کمپوزڈ پیپر تھا۔ ثمر لیپ ٹاپ کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔ اور سوالیہ نظروں سے ندا کی طرف دیکھنے لگا۔

''Sir... I am sorry''

Extremely sorry...... بس پانچ منٹ دے دیجیے...... صرف پانچ منٹ۔''

For God Sake...... پوری زندگی لے لیجیے۔ مگر پتا تو چلے آخر پرابلم کیا ہے۔'' ثمر کا بی پی شوٹ کرنے لگا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا تھا۔

''پوری زندگی کا میں نے کیا کرنا ہے سر...... آپ کی زندگی آپ کو مبارک ہو...... بس دو تین Mistakes ہیں...... پانچ منٹ میں ٹھیک کر کے لے آتی ہوں...... سر میں Terminate نہیں ہونا چاہتی...... ہم پر بہت قرضہ ہے۔ جاب کروں گی تو اُترے گا۔ انسان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ انسان آخر انسان ہے فرشتہ تو نہیں ہے...... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتی ہوں۔''

''اسٹاپ......'' ثمر نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مار کر اسے مزید بولنے سے روکا تھا۔ ندا نے بہت خوفزدہ ہو کر ثمر کی طرف دیکھا تھا۔

''کس دنیا سے تشریف لائی ہیں آپ......؟ آپ جاب کرنے آئی ہیں......؟ لگتا ہے منہ اُٹھا کر چلی آئی ہیں۔ کوئی سر پیر ہے آپ کی باتوں کا؟ پانچ منٹ مانگ رہی تھیں۔ دس منٹ فضول تفصیلات میں ضائع کر دیے۔ بی بی یہ ٹریڈنگ کمپنی ہے، بینک نہیں ہے۔ جو یہاں قرضے اتارنے چلی آئی ہیں۔ جب تک ہمارا Employee تین سال پورے نہ کرلے ہم دس روپے بھی ایڈوانس یا قرض نہیں دیتے۔ گھر سے میز ریکھ کر آئیے۔ رات کے بارہ بجے مجھے فون کر رہی ہیں...... میرا گھر ہے یا پرائیویٹ ہاسپٹل یا ATM جس پر میں نے 24 Hours کا بورڈ لگایا ہوا ہے؟ جائیے اور جب تک میں نہ بلاؤں آنے کی ضرورت نہیں۔''

اوپر اکاؤنٹ میں صبح صبح مغز ماری کر کے ویسے ہی اعصاب شل ہو رہے تھے، اس پر مستزادہ بے تکان بولتی نازل ہوگئی تھی۔

لفظ ''جائیے'' میں کالا جادو تھا...... ندا کو یوں محسوس ہوا زنجیریں کٹ گئیں۔ بندشیں کھل گئیں۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی کہ مُڑ کر نہ دیکھا اور اپنی ٹیبل پر جا کر دم لیا۔

اُف توبہ...... کتنا سارا بولتے ہیں...... Oh God...... اتنا غصہ...... لگتا ہے بیگم سے لڑ کر آئے ہیں...... کہیں بے چاری کو دو چار لگا کر تو نہیں آ گئے؟''

وہ دھپ سے اپنی چیئر پر گر گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ شارق اور نعمان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے۔

''ڈسپرین چاہیے......'' شارق کی شریر آواز ندا کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر شارق کو گھورا۔

''یار...... مس ندا کی آنکھوں میں تو خون اترا ہوا ہے۔'' شارق گھگھیا کر نعمان سے مخاطب ہوا۔

''خاموش...... میرے کانوں میں آگ بھری ہوئی ہے۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔'' ندا نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

''یعنی کہ آپ بہری ہو چکی ہیں...... مگر ہم اونچا نہیں بولیں گے...... کیونکہ بہرے تو خود چلا چلا کر بولتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں ساری دنیا بہری ہے۔ ان کو سنائی نہیں دیتا تو کسی کو بھی سنائی نہیں دیتا۔'' نعمان نے ایک ڈرافٹ تیار کرتے کرتے تنگ کرنے کا بمشکل وقت نکالا...... درحقیقت صبح صبح کام کا آغاز ہوا تھا۔ وہ بہت تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

''خاموش ہونے کے کتنے لو گے؟'' ندا نے دانت پیس کر دیکھا۔

''صرف 200 پاؤنڈ...... یا 150 دینار۔'' نعمان نے شارق کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

''ابھی تو میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور اس آفس میں تین سال سے پہلے دس روپے کا قرضہ نہیں ملتا۔'' ندا بڑبڑائی اور لیپ ٹاپ پر نظریں جما کر اپنی غلطیاں Remove کرنے لگی۔

''بڑی نالج ہے بھئی...... ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔ اچھا کیا بتا دیا۔ کم از کم جیب میں دس روپے تو

ہونا چاہئیں۔ برا وقت بتا کر نہیں آتا۔''

''آرام سے کام کرو۔ Stress لینے کی ضرورت نہیں ۔ سر تو بس یونہی پیار سے ڈانٹتے ہیں...... دل پر لینے کی ضرورت نہیں۔'' شارق نے پھر تنگ کیا۔

''میں تو دو دن سے اپنی C.V اور Application دس جگہ فارورڈ کر چکی ہوں۔ آج کہیں سے اچھی آفر آ جائے تو ایک سیکنڈ اس آفس میں نہ رکوں۔'' ندا بڑبڑا رہی تھی۔

''نئی جاب...... نئی جگہ...... نیا باس...... ذرا سوچو...... نیا باس ثمر صاحب سے بھی زیادہ غصے والا نکلا تو کیا کرو گی؟...... کیا زندگی بھر Bosses کی وجہ سے جاب ٹرائی کرتی رہو گی۔''

نعمان نے غلطیوں سے بھرا پیپر پرنٹر سے نکال کر توڑ مروڑ کر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے بڑا دانشمندانہ سوال کیا۔

ندا ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی...... یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔

کوئی گنجا، موٹا، دبا کر اسموکنگ کرنے والا باس مل گیا...... وہ بھی خوب گرجنے برسنے والا تو وہ کیا کرے گی؟ ٹھیک ہے...... سر غصے والے ہیں مگر خوب صورت بھی تو ہیں...... غصہ کرتے ہوئے بھوت تو نہیں لگتے۔ اب وہ نعمان کی دلیل سے قائل ہو کر خود کو سمجھانے بجھانے لگی۔ اور تندہی سے اپنے کام میں جت گئی۔ نعمان اور شارق نے بھی اسے سنجیدگی سے کام کرتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆......☆☆

نعمان کی بات ایسی دل کو لگی تھی کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ثمر سے اپنی قابلیت منوا کر ہی رہے گی۔ چاہے کام کرتے کرتے رات ہی ہو جائے۔ اور واقعی اسے احساس ہی نہ ہوا اور رات سر پر آ کھڑی ہوئی جھٹپٹے کے وقت جب Peon نے آ کر پوچھا کہ اس کے لیے چائے لائی جائے یا نہیں تو وہ چونک پڑی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے دھیرے دھیرے قدم رکھتی رات کی آمد کا اعلان کرتے محسوس ہوئے۔

''اوہ...... اتنی دیر ہو گئی...... پتا ہی نہیں چلا......'' پھر Peon کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا سب چلے گئے؟''

''اکاؤنٹ والے بیٹھے ہوئے ہیں اور ثمر صاحب بھی ابھی ہیں۔ باقی سب چلے گئے ہیں۔''

Peon نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ وہ اپنی عادتِ ثانیہ کے مطابق ہڑبونگ کے انداز میں ضروری چیزیں بیگ میں ڈال کر باہر نکلی تو دیکھا ثمر اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے پھر دور کی سوجھی جیسے کہ اکثر سوجھا کرتی تھی۔

اتنی بڑی گاڑی میں اکیلے بیٹھ کر جائیں گے...... ذرا سا مجھے ڈراپ کر دیں گے تو کوئی احسان نہیں کریں گے۔ بہت سی کمپنیز اپنے ایمپلائی کو پک اینڈ ڈراپ دیتی ہیں۔ ''ایکسکیوز می سر!'' اس نے بھاگ کر ثمر کو جا لیا۔

ثمر نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تھا۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اِس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

سالگرہ

"ماما آپ پریشان نہ ہوں...... میں بڑا ہو کر آپ کو جاب نہیں کرنے دوں گا۔ اور پھر میں کبھی بھی شکایت نہیں کروں گا۔ آپ کل بھی چھٹی مت کرنا۔ میں اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ اپنی برتھ ڈے منالوں گا۔" معوذ پھر سے اپنے سنجیدہ اور متین انداز میں......

معصوم حسرتوں کا نوحہ، افسانے کی صورت۔

سرد برفانی ہواؤں کا سلسلہ پہاڑی وادیوں سے ہو کر شہری آبادیوں میں داخل ہوا تو یا محسوس ہونے لگا کہ زندگی منجمد ہو جائے گی۔ نفوس ٹھٹھر کر ساکت ہو جائیں گے۔ مگر باوجود موسموں کی شدتوں کے کاروبارِ زیست جمتا ہے نہ ٹھہرتا ہے۔ وقت کا پہیہ چلتا ہے اور ہر ذی نفس کو اپنے ساتھ باندھے آگے سے آگے دھکیلنے پر مجبور کرتا چلا جاتا ہے۔ عائشہ بھی وقت کے دھکے پر ناچار چلنے اور بڑھنے پر مجبور ہی نہیں بے بس بھی ہوئی جا رہی تھی۔ احتیاجات کا اژدھام تھا جو عفریت بن کر مسلسل جدوجہد کو بھی نگلنے پر تیار تھا۔ ''ضرورتیں'' کم نہیں ہوتی تھیں۔ اور ''وسائل'' بڑھتے نہیں تھے۔ مگر ...... خواہشیں پنپنے سے روکنا بھی تو غیر فطری عمل تھا۔ اور وہ جو سینے میں ماں کا دل دھڑکتا ہے اُس کا کیا کیجیے کہ اولاد کے لیے دنیا کی ہر نعمت سمیٹنے کی تمنا ہر ماں کی اولین حسرت رہی ہے۔ عائشہ بھی پانچ سال سے اپنے آٹھ سالہ معوذ (بیٹے) کی پرورش کے لیے اپنے جواں سال ہمدم و رفیق شریکِ سفر کی تین سالہ رفاقت اور اُس کی حادثاتی شہادت کا سوگ منا کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتی بازارِ زیست میں اپنی ضرورتوں کے عوض اپنا ہنر اور وقت بیچنے نکلی تھی۔ گو کہ اُس کے لیے چار دیواری سے باہر کی دنیا میں آنا ایسا سہل نہ تھا۔ لیکن کچھ کام مجبوراً بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہ دنیا ہے جہاں وقت پڑنے پر سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ اپنوں کی بے رُخی اور بے نیاز رویوں کی شکایت کیا کیجیے۔ آٹھ سالہ معوذ کی متادل میں بسائے اُس کی بہترین تربیت کی خاطر وہ ہر دُکھ بھلائے زمانے کے سرد و گرم کو سہتے ہوئے زندگی کی دوڑ میں سرپٹ دوڑنے سے بھی نہیں چُوکتی تھی۔ تبھی تو موسم کی شدتیں بھی سہتی تھی اور رویوں کی حدتیں بھی ...... مگر جس ذات کے لیے وہ اپنی ذات بُھلا کر سرد و گرم سہنے نکلی تھی اگر اُسی کو وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں دینے سے قاصر ہو رہی تھی تو اُس کی ممتا تو تڑپتی تھی۔

☆......☆......☆

عائشہ زمان باس کے کمرے سے جس افسردگی و ملال سے باہر آئی تزئین کو اندازہ لگانے میں ذرا دیر نہ لگی کہ اُس کی چھٹی کی درخواست رد ہو چکی ہے۔ پھر بھی وہ پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ باس نے کیا کہا؟''

''کیا کہنا تھا...... ہمیشہ کی طرح صاف انکار......''

عائشہ نے سلگتے ہوئے اپنی میز پر فائل پٹخی اور پھر رندھے گلے سے بات مکمل کرتے ہوئے اپنی سیٹ سنبھال لی۔

چند دن کی چھٹی کیا مانگ لی۔ باس نے لیکچر ہی جھاڑنا شروع کر دیا کہ ''ہمیشہ کے لیے چھٹی لے لیں۔ کاش ایسا ہو سکتا۔''

تزئین افسوس و ملال بھرے تاثرات کے ساتھ اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئی۔

''پھر...... اب کیا کرو گی؟'' تزئین تشویش سے پوچھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں تیرتی نمی سے نظریں چرا گئی۔

''کیا کروں گی؟ کل مجھے ہر حال میں چھٹی کرنی ہے۔ تم تو جانتی ہو کل معوذ کی سالگرہ ہے اور اس بار میں اُسے سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔'' اُس کے غصے میں دبی اپنی بے بسی و لاچاری کا امتزاج تزئین کے لیے بالکل نیا سا تھا۔ ورنہ تو گزشتہ پانچ سالوں میں وہ فرض شناسی کی زندہ مثال بنی انہیں بھی ادائیگی فرض کی تلقین کرتی نظر آتی تھی۔

''دیکھ لو...... باس کا موڈ آج کل ویسے بھی اچھا نہیں ہے۔ کہیں تم...... میرا مطلب ہے باس نے تمہیں غصے میں......''

تزئین کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بات کیسے کہے۔ عائشہ بھی اس وقت باس کی کی گئی بے عزتی سے مغلوب تھی۔ یکدم جوش میں بولی۔

''میں باس کے بُرے موڈ پر اپنے اکلوتے بچے کی خوشی قربان نہیں کر سکتی۔ زمان کی شہادت کے بعد میری اور معوذ کی زندگی میں یہی ایک خوشی تو رہ گئی ہے۔''

زچ ہو کر جوش میں بولتے زمان کے ذکر پر اُس کی آنکھوں میں جھلملاہٹ اور لہجے میں نمی اتر آئی۔ تزئین نے بدقت اُس کی جانب دیکھا۔ زمان خان کی شہادت ایسا موضوع تھا جس پر نہ کبھی عائشہ کھل کر بول پاتی تھی اور نہ ہی تزئین پوچھ پاتی تھی۔ تزئین اُس کے قریب ہو کر اُسے تھپتھپا کر تسلی آمیز لہجے میں حوصلہ دینے لگی۔

''اچھا! بھئی پریشان مت ہو۔ تمہارا دل چاہ رہا ہے تو کر لینا چھٹی۔ مہینے میں ایک آدھ چھٹی تو ہر Employee کا حق بنتا ہے۔''

''تمہیں تو پتا ہے تزئین میں نے کبھی بلاوجہ چھٹی نہیں کی۔ ہر موسم میں ہر موقع پر حاضر رہی ہوں مگر اس بار۔''

عائشہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے رویے کی توجیہہ دی تو تزئین کے لبوں پر استہزاء پھیل گیا۔ جو کہ اپنی مشترکہ مجبوریوں کی وجہ سے تھا۔ ''اسی لیے باس نے ہمیں ربوٹ سمجھ لیا ہے، جس کی نہ کوئی ضرورت ہوتی ہے نہ تمنا نہ احتجاج!''

''سمجھا کریں...... مگر میں ربوٹ نہیں ہوں۔ میرا بچہ! اُس کی خوشیاں میرے لیے اہم ہیں۔ اگر باس نے اس بار زیادہ ہنگامہ کیا تو وہ مجھے کیا؟ نکالیں گے میں خود یہ جاب چھوڑ دوں گی۔'' عائشہ کی چڑچڑاہٹ پہلی بار واضح ہوئی ورنہ تو وہ بہت تحمل بردباری اور ذمہ داری سے بات چیت کرنے کی عادی تھی۔ تزئین بھی اُس کی کیفیت و مجبوری سمجھ رہی تھی سو خاموشی سے اُسے تھپتھپا کر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

چھٹی کے معاملے میں سر شیرازی کا رویہ اور چڑچڑاہٹ ہر ملازم کے ساتھ یکساں رہتا تھا۔ اس لیے تزئین اور عائشہ کے علاوہ بھی اُن کے ماتحت بھی ملازمین اُن سے شکوہ کناں رہتے تھے۔ عائشہ بہت کم چھٹیاں کرتی تھی۔ زمان کے بعد یہ ملازمت اُس کے لیے غنیمت تھی۔ جسے اُس نے بہت جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا۔ اس شہر میں وہ قریبی گاؤں سے شادی ہو کر اپنی پھوپو خجستہ بی بی کے گھر آئی تھی۔ زمان خان پھوپو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جس سے وہ بچپن سے منسوب تھی۔ زمان خان خود بھی تعلیم یافتہ تھا اسی لیے اُسی کی خواہش پر اُس نے پرائیویٹ امتحان دے دے کر گریجویشن کیا تھا اور شادی کے بعد بھی زمان کے کہنے پر وہ کمپیوٹر کے مختلف کورسز کر کے آج اس مقام پر تھی۔ دراصل زمان اسی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ مارکیٹنگ ایجنٹ ہونے کے باعث اُس روز بھی زمان خان مارکیٹ میں موجود ایک آفس میں بیٹھا تھا۔ جب زور کا دھماکہ ہوا تھا اور ریت سیمنٹ اور اینٹوں کو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا اور پھر انسانی اعضاء کا ہوا میں چیتھڑوں کی طرح لہرا کر چیخوں کے ساتھ فضاؤں میں گونجنا بھی لوگوں نے دیکھا سنا تھا۔ نجانے کون بربریت کا تماشائی تھا جس نے اک لمحۂ زیست میں سیکڑوں زندگیوں کو اجل واصل کیا تھا۔ انسانیت کے دشمنوں نے اپنا خوف مٹایا تھا یا دوسروں کو ہراساں کرنے کے لیے کئی گھروں کے بچوں سے والدین...... والدین سے بچے، بہنوں سے بھائی، ماؤں سے بیٹے چھنتے ہوئے 'حساب کا دن' بھلا دیا تھا۔ زمان خان بھی اپنے تین سالہ بیٹے، اکیس سالہ بیوی اور عمر رسیدہ ماں سے جدا ہو کر پیچھے رہ جانے والوں کو ظلم و بربریت کا شکار چھوڑ گیا تھا۔ میڈیا پر ہوئے مظاہرے اور حکومتی سطح پر کیے گئے امدادی دعوے بھی گزرے وقت کی دھول بن گئے تھے۔ عائشہ اور اُن جیسے متاثرہ لوگ ناچار اُس دھول کو صبر شکر کے ساتھ چاٹ کر زندگی کے کارواں میں بڑھنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ عائشہ نے بدقت عدت گزاری تھی۔ زمان کا ایک خواب اُسے پایۂ تکمیل تک

پہنچانا تھا۔ معوذ کی بہترین تعلیم و تربیت اور اُسے آرمی فورسز میں بھیجنا اب عائشہ کا مقصدِ حیات تھا۔ تبھی وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی اور کچھ خیر خواہوں کی کوششوں سے زمان کی کمپنی میں ہی اُسے بدقت ملازمت مل پائی تھی۔ ملازمت کے دوران اُسے اندازہ ہوا تھا کہ تنہا عورت کا اپنی اولاد کی پرورش کرنا کس قدر دشوار ہے۔ ابتداء کے دو سال تو پھوپو خجستہ بی بی اُس کا حوصلہ و ڈھارس بنی رہی تھیں۔ مگر بیٹے کے دکھ کو روگ بنانے والی خجستہ زیادہ عرصہ خود کو زندگی سے ہم رکاب نہ کر پائی تھیں اور زمان کے بعد تیسرے سال میں ہی خود بھی زندگی سے موت کی پناہ میں چلی گئی تھیں۔

اب وہ تھی معصوم بچے کی معصوم خواہشیں اور اُس کی بے بس ماںمتا کی بے آواز صداؤں کا ماتم تھا جو بے مہر فضاء شہر کے شور میں دب کر رہ گیا تھا۔ وہ کشمکش بھرے ذہن و دل کے ساتھ گھر پہنچی تو معوذ معمول کے شکوے بھرے انداز میں دروازہ کھولتے ہی بولا۔

’’ماما...... آپ آج پھر لیٹ ہیں۔‘‘ عائشہ نے دروازے سے اندر آتے ہوئے تائید اً سر ہلا کر کہا۔

’’ہاں میں پھر لیٹ ہوگئی۔ بس جگہ جگہ رُکتی ہے تو دیر ہو ہی جاتی ہے۔‘‘ عائشہ نے دو کمروں کے چھوٹے سے گھر کے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ہمیشہ کا دیا جواب دہرایا۔ کندھے سے بیگ اور سر سے چادر صوفے پر اُتار کر رکھتے ہوئے اُسے دیکھا تو وہ بھی ماں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

’’کیا ہوا؟‘‘ کیا بلقیس باجی (ہمسائی) نے کچھ کہا تھا؟‘‘ عائشہ کو اُس کی نظروں سے ’کچھ‘ محسوس ہوا تھا تبھی وہ فکر مندی سے اُس کی طرف لپکی۔ معوذ کے معصوم چہرے پر سنجیدگی اور بے ریا آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ عائشہ نے بڑھ کر اُسے بانہوں میں سمیٹا۔ جانتی تھی بلقیس باجی وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ کر معصوم و شفاف ذہن و دل پر دنیا کی زبان میں ’تجربات‘ تحریر کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ اور عائشہ بہت دقت سے حساس دل و ذہن سے اُس تحریر کا اثر زائل کر پاتی تھی۔ معوذ اب بڑا ہو رہا تھا بہت سی باتیں عمر سے پہلے ہی سمجھنے لگا تھا۔

’’بیٹا...... بلقیس باجی کی باتوں پر دھیان نہ دیا کرو۔ تمہیں تو معلوم ہے نا تمہارے بابا جان چاہتے تھے تم بہت پڑھ لکھ جاؤ۔ وہ تمہیں بہت اچھا انسان بنانا چاہتے تھے۔ تم اپنے ملک کا نام روشن کرو یہ اُن کی خواہش تھی۔ اسی لیے تو میں......‘‘ عائشہ کی بات کاٹ کر معوذ فوراً بولا۔

’’اسی لیے آپ جاب کرتی ہیں۔ میں نے آنٹی بلقیس سے یہی کہا تھا۔ مگر وہ کہتی ہیں تمہاری ماں کو جاب نہیں شادی کرنی چاہیے۔ ماما...... وہ ایسا کیوں کہتی ہیں۔‘‘ اُس کی ناسمجھی میں ابھی معصومیت تھی۔ عائشہ یکدم جھنجلا اُٹھی۔

’’فضول باتیں کرتی ہیں وہ...... میں اُن سے بات کروں گی۔ میری زندگی میرا معوذ میری جان ہے۔ چلو بھول جاؤ اُن کی باتیں...... ماما اپنی جان کے لیے ایپل شیک اور اپنے لیے چائے بنا کر لاتی ہیں۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ ٹی وی دیکھو لو۔ پھر تمہیں ہوم ورک کرواتی ہوں۔‘‘ عائشہ نے اپنے طور پر اُسے بہلایا اور پھر خود ہی ٹی وی آن کر کے اُسے صوفے پر بیٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ معوذ ٹی وی ریموٹ سے اپنی پسند کا کارٹون چینل سرچ کرنے لگا۔ بظاہر وہ ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مگر اُس کا ذہن مسلسل اپنی ماں میں لگا ہوا تھا۔ عائشہ اُس کے لیے ملک شیک اور اپنے لیے چائے لے کر آئی تو وہ عائشہ کے قریب بیٹھتے ہی اچانک بولا۔

’’ماما...... اگر بابا جان شہید نہ ہوتے تو آپ کو جاب نہ کرنا پڑتی، ہے نا......‘‘ عائشہ نے اُسے ملک شیک پکڑاتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا وہ اکثر اسی قسم کے سوال کیا کرتا تھا۔

''ہا...... ں...... پھر میں سارا وقت اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی اور پھر نہ میرا بیٹا بور ہوتا نہ اُسے اکیلے رہنا پڑتا اور نہ ہی اُسے ڈر لگا کرتا۔'' عائشہ نے اُس کے بال بکھیرتے ہوئے لاڈ سے کہا تو وہ سر نفی میں ہلا کر بولنے لگا۔

''ماما...... کیا سچ مچ جو شہید ہو جاتے ہیں وہ ہمارے پاس ہوتے ہیں۔ ہماری باتیں سنتے ہیں۔ بابا جان بھی تو ہمارے پاس ہوتے ہیں تو پھر آنٹی بلقیس کیوں کہتی ہیں کہ ہم 'اکیلے' ہیں۔''

''معوذ!'' عائشہ نے قدرے زچ ہو کر سرزنش والے لہجے میں اُسے پکارا۔ پھر قدرے نرمی سے اُسے سمجھانے لگی۔ یقیناً باجی بلقیس نے اُس سے آج ایسی باتیں کی تھیں۔ جس پر اُس کا ذہن منتشر تھا۔

''بیٹا...... 'میں' اور 'تم' ہیں تو 'ہم' اکیلے کیسے ہوئے؟ اور پھر یہ بات بالکل سچ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں یا بے گناہ مارے جاتے ہیں وہ شہید ہوتے ہیں اور شہادت پانے والے لوگ زندہ ہوتے ہیں اور اللہ کے قریب...... باجی بلقیس کو پتا ہی نہیں ہے کہ تمہارے بابا جان ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔'' عائشہ نے بولتے بولتے بہت محبت سے اُسے اپنے پہلو سے لگایا۔

''ہاں...... ماما...... مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ بابا جان میرے پاس ہیں۔ جب میں گھر میں اکیلا ہوتا ہوں مجھے تب بھی بابا جان اپنے پاس محسوس ہوتے ہیں۔'' معوذ نے تائیداً بولتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ عائشہ نے اُس کی پیشانی سے بال پیچھے کر کے اُس کی پیشانی پر بوسہ لیا۔

''بالکل وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ تم بھی باجی بلقیس سے زیادہ باتیں نہ کیا کرو۔ اپنی پڑھائی پر توجہ دیا کرو۔ تمہیں معلوم ہے نا تمہارے بابا تمہیں آرمی آفیسر دیکھنا چاہتے تھے۔''

''مجھے پتا ہے ماما...... میں بڑا ہو کر سولجر بنوں گا اور سب دشمنوں کو مار دوں گا۔ پھر بابا تو خوش ہوں گے ناں؟'' معوذ کی معصومیت میں جوش ولولہ فطری تھا۔ عائشہ نے اُسے محبت سے دیکھا۔ ''بالکل، نہ صرف بابا جان خوش ہوں گے اللہ تعالیٰ بھی بے حد خوش ہوگا۔ کیونکہ وہ برائیوں کو ختم کرنے والے کو پسند کر کے اُسے اپنی بہترین نعمتیں عطا کرتا ہے اور شہید کو شہادت کے بعد ملنے والی زندگی اللہ کی بہترین عطا ہے۔'' عائشہ نے پہلے تو اُسے محبت سے سمجھایا پھر جیسے خود کلامی والے انداز میں دھیمے لہجے میں بولتی بولتی وہ کہیں کھوگئی۔ معوذ بھی ملک شیک پینے لگا۔ اپنی ماما کی باتوں سے اُس کے اندر فوجی بننے کی خواہش جاگنے لگی تھی۔ ایسا فوجی جو جرأت و بہادری میں بے مثال ہوتا۔ وہ خالی گلاس میز پر رکھ کر اُسی کمرے کے ایک کونے میں پڑے اپنے کھلونوں کی جانب آ گیا اور پھر اُن میں سے اپنی پسندیدہ گنز (بندوقیں) نکال نکال کر دیکھنے لگا۔

عائشہ بھی بیٹے کو کھیل میں مگن دیکھ کر رات کے لیے کھانا بنانے کچن میں گھس گئی۔ کام کے دوران بھی وہ آنے والے دن کے حوالے سے ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ کہ آیا وہ جرأت کر کے چھٹی کر لے، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو یا پھر ہمیشہ کی طرح معوذ کی سالگرہ کا دن تھکے ماندے ذہن و جسم کے ساتھ زبردستی کی خوشگواری طاری کر کے منائے۔ ابھی تو اُس نے کل کے دن کے حوالے سے کوئی انتظام بھی نہیں کیا تھا سو نہ ہی معوذ کے لیے کوئی تحفہ ہی خرید پائی تھی۔ آخر اُس نے حتمی فیصلہ کر لیا کہ کل وہ آفس نہیں جائے گی بلکہ حسبِ خواہش معوذ کے اسکول سے آنے سے پہلے سارا انتظام کر رکھے گی۔ اس اطمینانِ قلب کے ساتھ عائشہ نے بہت دنوں بعد رغبت سے کھانا کھایا۔ معوذ بھی معمول کے مطابق کھانے کے بعد باقی ہوم ورک کرنے بیٹھا تو اچانک اپنی میتھ کی کاپی پر سوال حل کرتے کرتے بولا۔

"ماما! 20th کو اسکول میں ونٹر ووکیشن شروع ہو جائیں گی۔ اس بار تو ہم نانو کے پاس گاؤں جائیں گے ناں۔" معوذ کے لہجے میں حسرت و خواہش کا ملا جلا تاثر عائشہ کو متوجہ کر گیا۔ وہ جو آنے والے دن کے لیے اپنے کپڑے اور معوذ کا اسکول یونیفارم استری کرنے میں منہمک تھی۔ ایسے چونکی جیسے معوذ نے پہلی بار ایسی خواہش کی ہو۔

"ماما...... ہم جائیں گے ناں......!" وہ پھر سے پوچھ رہا تھا۔

"پتا نہیں بیٹا...... اس بار بھی جا سکیں گے یا نہیں۔" عائشہ نے نظریں چرا کر اُس کی پینٹ کی تہہ جمائی۔

"کیوں ماما...... آپ نے تو کہا تھا کہ ہم اس بار تو ضرور جائیں گے۔" معوذ نے ٹھٹک کر پہلے کاپی بند کی پھر بغور ماں کو دیکھتے ہوئے اُس کا وعدہ یاد دلایا۔ عائشہ نے ٹھنڈی آہ کو بمشکل اندر ہی روکا۔

"کہا تو تھا میری جان...... مگر...... اُن سے چھٹی نہیں مل رہی۔" عائشہ نے استری کا سوئچ بند کر کے اُسے دیکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی ماما...... آپ نے پرامس کیا تھا۔" اُس کے لہجے میں ناراضگی اُتر آئی تھی۔

"باس نہیں مان رہے۔ انہوں نے تو کل بھی چھٹی نہیں دی۔" عائشہ نے استری شدہ کپڑے ہینگر میں لگائے اور کمرے میں موجود الماری کی طرف بڑھ گئی۔ معوذ بھی گود سے کاپی اور ہاتھ سے پینسل میز پر پھینکتے ہوئے اُٹھ کر اُس کے پیچھے لپکا۔

"ماما...... مجھے ضرور اس بار کہیں نہ کہیں جانا ہے۔ ہم کبھی گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی نہیں گئے۔ میرے سبھی فرینڈز جا رہے ہیں۔" معوذ نے جیسے منوانے کے سے انداز میں ضد کی تو عائشہ اُسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ معوذ حساس بھی تھا اور ذہین بھی۔ کبھی کبھی اُسے سمجھانا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے ہم عمر بچوں سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اسی لیے عائشہ نے اُسے سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "معوذ...... کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کے دوست جو کریں آپ بھی ویسا ہی کرو۔ آپ سمجھ سکتے ہو۔ آپ کے فرینڈز کی مدرز جاب نہیں کرتی ہوں گی۔ اس لیے وہ ہر ووکیشن میں کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں۔ آپ کے بابا جان ہوتے تو ہم بھی......! آخر ہر بار مجھے کیوں آپ کو بتانا پڑتا ہے کہ......!" بولتے بولتے عائشہ کی آواز ہی نہیں بھرا گئی اُس کے چہرے پر بھی حزن و ملال سا بکھر گیا۔ وہ ایکدم وہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ معوذ بھی اُس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ ماں کے آنسو اُسے بھی تکلیف دیتے تھے۔ اُس کی زندگی میں ماں کے سوا تھا بھی کیا۔ وہ آگے بڑھ کر ماں سے لپٹ کر خود بھی رونے لگا۔

"ماما...... ماما...... آپ کیوں رو رہی ہیں۔ آئی پرامس میں اب کہیں جانے کی بات نہیں کروں گا۔" عائشہ اُس کے آنسوؤں پر خود کو سنبھالتی اُسے چومنے لگی۔ اپنی ضد پر نادم ہو کر وہ اُسے ہی شرمندہ کر رہا تھا۔ وہ کیا کرتی بے اختیاری کا قلق اُس کی جان سے لپٹ کر جکڑے ہوئے تھا۔ "نہیں میری جان ہم جائیں گے ضرور جائیں گے۔ میں کوشش کروں گی کہ مجھے چھٹیاں مل جائیں۔ پھر ہم خوب سیریں کریں گے۔ عائشہ اُسے بہلاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کرتی بڑے عجیب تاثرات میں نظر آ رہی تھی۔

"ماما آپ پریشان نہ ہوں...... میں بڑا ہو کر آپ کو جاب نہیں کرنے دوں گا۔ اور پھر میں کبھی بھی شکایت نہیں کروں گا۔ آپ کل بھی چھٹی مت کرنا۔ میں اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ اپنی برتھ ڈے منا لوں گا۔" معوذ پھر سے اپنے سنجیدہ اور متین انداز میں بولتا عائشہ کو حیران کر رہا تھا کبھی کبھی وہ بالکل زمان کی طرح بات چیت کرتا محسوس ہوتا تھا۔

"ہاں...... ہاں...... تم اپنے کلاس فیلوز کے

ساتھ بھی برتھ ڈے منالیتا۔ مگر میں کل گھر پر بھی ارجسٹمنٹ کروں گی۔ اور میں کل آفس بھی نہیں جاؤں گی۔ ہاں ناراض ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔'' عائشہ نے جیسے خود کو بھی ہار کرا کر عزم سے کہا۔

''سچ ماما...... کل جب میں اسکول سے واپس آؤں گا۔ تو آپ گھر پر ہی ہوں گی نا......'' معوذ میں پھر سے بچوں کی سی گرمجوشی بھر گئی۔

''بالکل میرے چاند...... ماما گھر پر ہی ہوں گی۔ اب ایسا کرو سو جاؤ۔ صبح جلدی اُٹھنا ہے اور مجھے بھی کل صبح بازار جانا ہے۔'' عائشہ نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے تاکید کی تو وہ ہنس رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر بلا کی معصومیت نے عائشہ کی اندر بسی ممتا کو بے اختیار اُس کی بلائیں لینے پر مجبور کر دیا۔

☆......☆......☆

صبح نجانے کیسے الارم سے پہلے ہی عائشہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ فجر کی اذان میں کچھ وقت تھا۔ فجر کی نماز پڑھنا تو اُس کا معمول تھا ہی کبھی کبھار وہ تہجد بھی پڑھ لیا کرتی تھی۔ اُس کے اشک رواں تھے اور وقت بھی رواں دواں تھا۔ اذانِ فجر نے اُسے ہی نہیں چونکایا تھا۔ گہری نیند میں سوئے معوذ کو بھی جگا دیا تھا۔ کبھی کبھی معوذ بھی نماز پڑھ لیتا تھا۔ جب عائشہ اُسے تاکید کرتی۔ اب بھی اُسے بستر پر جاگتے دیکھ کر بہت نرمی سے اُسے مخاطب کیا۔

''معوذ...... اُٹھو بیٹا...... نماز پڑھ لو......!'' سرخ کمبل میں لپٹا آٹھ سالہ معوذ جو پھر سے سونے کا سوچ رہا تھا۔ ماں کی پکار پر ذرا سا کسمسایا۔

''ماما...... سردی بہت ہے...... پانی ٹھنڈا ہوگا۔'' معصوم عذر تھا مگر حقیقت بھی تھی۔ دسمبر کے وسط میں پانی بھی برف کی طرح چوٹ دیتا تھا۔

''میں نے پانی گرم کر رکھا ہے اُٹھو جان...... اللہ ہر کسی کو اپنے سامنے جھکنے کی توفیق نہیں دیتا اور تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہیں بتایا تھا سخت سردی میں وضو کرنا بھی جہاد کے برابر ہے۔ اور تمہیں تو مجاہد بننا ہے ناں۔'' عائشہ اُسے اسی طرح ترغیب دیا کرتی تھی۔

''سچ ماما...... میں سردی میں نماز پڑھنے سے بھی مجاہد بن جاؤں گا۔'' سوال میں گرمجوشی بھی تھی اور معصومیت بھی۔

''ہاں...... اگر تم شوق اور لگن سے پڑھو گے تو......!'' عائشہ اسی طرح اُس کی تربیت کرتی آ رہی تھی۔

معوذ فوراً بستر سے اُتر کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ عائشہ کے چہرے پر بہت نرم سی مسکراہٹ آ گئی۔ معوذ کی یہ عادت بہت اچھی تھی۔ وہ عائشہ کی باتیں بہت جلد مان لیتا تھا۔ نہ صرف مان لیتا تھا بلکہ عملی طور پر بھی ثابت کرتا تھا کہ وہ اپنی ماں کا فرمانبردار ہے۔ جتنی دیر میں معوذ وضو کر کے آیا اتنی دیر میں عائشہ نے خود نمازِ فجر ادا کی اور پھر تسبیحات پڑھنے لگی۔ معوذ کمرے کے کونے میں پڑی تپائی سے دوسری جا نماز اُٹھا کر لایا اور اُس کے قریب بچھا کر نیت باندھنے لگا تو عائشہ نے اُسے متوجہ کر کے پکارا۔

''معوذ!''

''جی ماما......'' وضو کا پانی تولیے سے صاف کرنے کے باوجود معوذ کے چہرے پر پانی کی نمی کے علاوہ بھی ایک خاص سی چمک تھی۔ عائشہ کی نگاہ اُس کے چہرے پر ٹھہر نہیں سکی۔ اُس کی آواز کسی خاص کیفیت کے تحت خود بخود مغلوب ہو گئی۔

''معوذ...... نماز پڑھنے سے پہلے آج دو نفل شکرانے کے بھی پڑھ لو۔ میں نے تمہیں نفل ادا کرنے کا طریقہ سکھایا تھا ناں؟'' معوذ نے قدرے حیرت بھرے تاثرات کے ساتھ استفسار کیا۔

''نف......ل......؟ وہ کس لیے ماما...... آج شب معراج تو نہیں تھی۔''

''نہیں آج شب معراج تو نہیں تھی مگر آج کا دن تمہاری پیدائش کا دن ہے۔ آج کے دن اللہ تعالیٰ نے تمہیں مکمل صحت منداور اپنی نعمتوں سے بھرپور زندگی عطا کر کے دنیا میں نیک اور اچھے کام کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اسی لیے آج اور ہمیشہ اللہ کے حضور شکرانہ ادا کیا کرنا۔''

''اچھا!'' عائشہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ معوذ سے ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ معوذ نے تابعداری سے سر ہلا کر اسے مطمئن کیا اور نمازِ نفل شکرانہ کی نیت باندھنے لگا۔ صبح کے معمولات کے مطابق عائشہ نے پہلے اپنے اور معوذ کے لیے ناشتہ بنایا اور پھر ہر روز کی طرح کمرے میں میز پر رکھنے کے بعد معوذ کو انڈا اور سلائس کھانے کی طرف راغب کرتی اُس کے بیگ میں کتابیں رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس کے ساتھ باتیں، نصیحتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

''معوذ میں نے چاکلیٹ کا ڈبہ بیگ کے ساتھ رکھ دیا ہے۔ یاد سے لے کر جانا اور تمام کلاس فیلوز میں بانٹنا۔''

''ماما...... میں اپنی ٹیچر کو دے دوں گا وہ سب میں بانٹ دیں گی۔'' دودھ کا گھونٹ بھرنے کے بعد معوذ کرسی سے اُٹھ کر ماں کے قریب آ گیا اور پھر بے اختیار ہی ماں سے لپٹ گیا۔

''تھینک یو...... آئی لو یو ماما۔'' معوذ کا یہ بے اختیارانہ عمل عائشہ کو چونکا گیا۔ اُس نے بھی فرطِ محبت میں اُس کی پیشانی چومی۔

''آئی لو یو ٹو۔ اب جلدی سے اپنا دودھ کا گلاس ختم کرو۔ وین آتی ہو گی۔ ویسے میں تو چاہ رہی تھی کہ تم بھی آج اسکول نہ جاؤ...... مگر......'' عائشہ اپنی بات کہہ کر خود ہی پریشان نظر آنے لگی۔ جیسے وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر کچھ اور کہہ رہی تھی۔ معوذ بھی حیران تھا۔

''ماما...... آج میرا ٹیسٹ بھی ہے نا...... مگر آپ کہتی ہیں تو میں چھٹی کر لیتا ہوں۔''

معوذ نے اُس کے کہنے پر دودھ کا گلاس دوبارہ اُٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ عائشہ نے کبھی اُسے چھٹی کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

''ہاں...... آج تو تمہارا ٹیسٹ ہے؟'' اُسے بھی جیسے یاد آیا۔

''چلو کوئی بات نہیں اچھا سا ٹیسٹ دینا۔ میں دعا کروں گی تمہیں سب سے زیادہ نمبر ملیں۔'' عائشہ نے معوذ کو پچکارا۔

''مگر ماما...... آج میری اچھی تیاری نہیں ہے۔ اس لیے میں نے دعا کی ہے کہ آج ہمارا ٹیسٹ نہ ہو۔'' وہ جو چھٹی کے نام پر ذرا پُرجوش ہوا تھا یکدم ڈھیلا ہو کر بولا تو عائشہ نے سنجیدگی سے دیکھا۔

''تیاری تو کرنی چاہیے تھی۔ کیوں نہیں کی تیاری۔''

''آنٹی بلقیس کی وجہ سے...... وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی تھیں۔'' معوذ کی شکایت میں بیزاری بھی تھی۔

''آئندہ وہ تم سے باتیں نہیں کریں گی، میں انہیں منع کر دوں گی۔'' عائشہ نے اُس کا بھاری بھرکم بستہ اُس کے دونوں بازوؤں میں پرو کر اُس کی کمر پر لاد دیا۔ اسکول وین کا ہارن قریبی گلی سے سنائی دے رہا تھا، کچھ ہی لمحوں میں وہ اُن کے گھر کی گلی کے قریب نکڑ پر آ پہنچتا۔ عائشہ جلدی سے چادر اوڑھ کر اُسے باہر نکلنے کا اشارہ کرتی منہ میں معمول کی آیاتِ قرآنی اور دعائیں پڑھتی اُس کے پیچھے لپکی۔ دروازہ اچھی طرح بند کر کے وہ معوذ کے ہمقدم ہو کر اُس پر آیات و دعائیں پھونک کر بولی بلکہ ہمیشہ کی جانے والی نصیحتیں دہرانے لگی۔

''معوذ...... بیٹا وین کی کھڑکی سے مت جھانکنا اور کسی بچے سے بھی جھگڑنا مت اور سبھی کے ساتھ مل جل کر کھیلنا...... ٹھیک ہے۔'' عائشہ نے اُس کا سر سہلایا۔

''او کے...... ماما......!'' معوذ بولتا نکڑ پر کھڑی وین میں لپک کر بیٹھ گیا۔ عائشہ کے چہرے پر دھیمی سی

مسکراہٹ تھی اور ہاتھ الوداعی انداز میں لہرا کر وہ بھی بچوں کے درمیان نمایاں معوذ کو بلائیں لیتی نظروں سے کھڑی دیکھتی رہی حتیٰ کہ وین آگے بڑھ کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

عائشہ گھر واپس پلٹی تو باجی بلقیس ساتھ والے گھر سے نکل کر اُس کے گھر آنے کا ارادہ رکھتی کھڑی تھیں۔

''باجی آپ......؟ آئیں ناں!'' دروازے کی چٹخنی کھولتی عائشہ انہیں دعوت دے کر اندر بڑھ گئی تو چالیس سالہ باجی بلقیس بھی پیچھے ہی آگئیں۔ اچھی نیک فطرت خاتون تھیں۔ عائشہ کو اُن کی ذات سے کافی ڈھارس اور حوصلہ تھا۔ وہ اکثر بازار سے (عائشہ کے گھر کی) ضرورت کی چیزیں لا دیا کرتی تھیں۔ کسی کسی وقت معوذ کو اپنے گھر سے کھانا بھی کھلا دیتی تھیں اور اپنے بچوں کے ٹیوشن اکیڈمی جانے کے بعد معوذ کے ساتھ تین چار گھنٹے گزار لیا کرتی تھیں یا پھر اُسے اپنے گھر لے جایا کرتی تھیں۔ (جب انہیں کوئی ضروری کام ہوا کرتا تھا) عائشہ کو وہ ہمیشہ چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھاتی رہتی تھیں کہ وہ اپنی زندگی تنہا گزار دینے والی سوچ کو بدل دے۔ عائشہ اُن کی باتوں سے متفق ہو کر بھی بے بس تھی۔ وہ ادارک رکھتی تھی کہ سفر لمبا ہو تو کسی ہمسفر کی رفاقت ہی اُس کی کٹھنائیوں کو سہل بنانے میں کارفرما ہوتی ہے مگر کیا کیجیے کہ ہمسفر کے بدل جانے کا احتمال ہی تو اُس کی ہر سوچ کو پابند کر دیتا تھا۔

اپنی ذات سے زیادہ اُسے معوذ کی فکر لاحق تھی۔ وہ اُس کی تربیت میں کوئی جھول اور خلاء نہیں چاہتی تھی جو کہ 'دوسرے باپ' کی صورت معوذ کی شخصیت کو متاثر کرتا۔

''تم آج آفس نہیں جاؤ گی؟'' اُسے چادر اُتار کر ایک طرف رکھتے دیکھ کر باجی بلقیس نے قدرے حیرت سے پوچھا تو وہ خفیف مسکراہٹ کے ساتھ سر نفی میں ہلا کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں باجی...... آج میں نے چھٹی کر لی ہے۔'' باجی بلقیس اُس کے کہے بغیر ہی سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔

''اچھا! میں نے سوچا تھا تمہارے آفس جانے سے پہلے پوچھ لوں، آج بازار سے کچھ منگوانا ہو تو......!''

''منگوانا تو ہے؟ باجی میں خود ہی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ بس ذرا گھر کی صفائی کر لوں۔ آپ تب تک اپنا کوئی کام کر لیں۔'' عائشہ کچھ سوچ کر بولی۔ تو باجی بلقیس بھی فوراً اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم فارغ ہو کر مجھے آواز دے دینا۔ میں بھی دوپہر کے لیے ہنڈیا چڑھا دوں۔ بازار میں کہیں دیر نہ لگ جائے۔'' عائشہ نے سر ہلایا اور باجی بلقیس کے جانے کے بعد برتن وغیرہ سمیٹ کر باورچی خانے میں آ کھڑی ہوئی، کام کرتے کرتے آج اُسے بار بار زمان کی یاد آبدیدہ کر رہی تھی۔ جس عزم و ارادے سے اُس نے چھٹی کی تھی، وہ جوش و ولولہ اب ماند سا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ اُسے معوذ کے آنے سے پہلے گھر کو غباروں سے سجانا تھا۔ بازار جا کر کیک اور کھانے پینے کی اشیاء لے کر آنی تھیں۔ اور سب سے اہم کام گاؤں سے آنے والے اپنے بابا یعنی معوذ کے نانو کے لیے کھانا بنانا تھا۔ جو خصوصی طور پر معوذ کی سالگرہ پر اُس سے ملنے آ رہے تھے۔ ورنہ انہیں شہر میں آ کر رہنا بالکل پسند نہیں تھا۔ یہی عائشہ کا سرپرائز تھا جو وہ معوذ کو دینا چاہتی تھی۔

ابھی اُس کا کام ختم نہیں ہوا تھا جب باجی بلقیس نے زور سے اُس کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عائشہ جو غباروں کا پیکٹ بستر پر رکھے چند غبارے پھلائے بیٹھی تھی۔ ہڑبڑا کر دروازہ کھولنے لپکی اور دروازہ کھولتے ہی بولی۔

''بس باجی...... میں آپ کی طرف آنے ہی والی

تھی۔ بس چلتے ہیں دس پندرہ منٹ میں۔'' باجی بلقیس حواس باختہ سی دروازے پر کھڑی رہ گئی۔

''آجائیں نا...... میں ذرا کپڑے بدل لوں۔'' باجی بلقیس کو خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ بے اختیارانہ پوچھنے لگیں۔

''تم نے ٹی وی میں خبر دیکھی؟'' بات مکمل کرنے میں اتنی دشواری باجی بلقیس کو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ عائشہ کی توجہ اُن پر نہیں تھی ورنہ اُن کی غیر ہوتی حالت اُسے تشویش میں مبتلا کر دیتی۔ وہ پہلے کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''باجی! آپ کو معلوم تو ہے۔ میں بلاوجہ ٹی وی نہیں لگاتی۔ اور خبریں سُن کر دیکھ کر مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ کیسی کیسی باتیں سننے اور منظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دس دن تک طبیعت نہیں سنبھلتی۔'' اُس کی بات سُن کر باجی بلقیس پر چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔

''کیا ہوا؟ کیا خبر تھی جس نے آپ کو پریشان کر دیا؟'' عائشہ اُن کی خاموشی محسوس کر کے پلٹ کر آئی۔ باجی بلقیس کی خاموشی اُسے تشویش میں مبتلا کر گئی۔

''وہ اسکول ہے نا...... دہشت گردوں نے...... بچو...... ں کو...... اسکول میں گھس کر...... قتل......'' باجی بلقیس کے لفظ بے ربط سے تھے۔ عائشہ کو جیسے سمجھ نہیں آئی۔ معمولات کا حصہ تھیں اب تو ایسی خبریں...... اور وہ تو خود بھی ایک بڑے سانحے کا شکار ہو چکی تھی۔ خبریں تکلیف دیتی تھیں، سو اُس نے اس تکلیف دہ امر پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن سُن کر اُسے تکلیف تو ہوئی تھی۔ آہ بھر کر غمزدہ لہجے اور تاثرات کے ساتھ بولی۔

''آہ...... اب مسجدوں کے بعد معصوم بچوں کے اسکولوں کو بھی تالے لگوائیں گے یہ بے دین، بے ضمیر، بے حمیت درندے۔ انسا...... ن کہنے کو دل نہیں چاہتا میرا انہیں۔'' اُس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ بلقیس باجی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ گلی سے بھی شور کے ساتھ دوڑتے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''با...... جی...... خیر تو ہے نا...... آ...... پ...... یہ شور...... آوازیں...... آپ کس اسکول کی بات کر...... رہی تھیں؟'' جواباً باجی بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ عائشہ کو وہم اور خدشے ٹھٹھکنے پر مجبور کر گئے۔ کچھ ہوا تھا۔ ایسا غلط اور بے یقین جس نے باجی بلقیس کے دل کو پگھلا کر بکھرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''وہ...... عائشہ...... ہما...... را...... معوذ جس اسکول میں پڑ...... ھتا...... ہے وہاں دہشت گرد گھسے ہیں۔'' باجی بلقیس نے جس ضبط اور حوصلے سے یہ اطلاع دی تھی وہی جانتی تھیں اور عائشہ کی سماعتیں سُن کر بھی بے یقین تھیں۔ دل مچل گیا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اور پھر اُس کے ہوش و حواس بکھر کر منتشر ہو گئے تھے۔ آوازوں کا شور تھا۔ نیوز چینلز والوں کا لمحہ بہ لمحہ نشر ہوتا تبصرہ دل دہلانے والے مناظر ماؤں کا کلیجہ چیرتی معصوم بچوں کی آہ و بکا اور خون میں لتھڑی لاشیں پھولوں کی پتیوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ ایک قیامت برپا تھی۔ پل بھر میں کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ گھر سے نکل کر حصول علم کی لگن میں محو معصوم مگر ذہین بچے خود پر حملہ آور ہوئے درندوں سے مزاحمت بھی نہ کر پائے تھے۔ ماؤں کے جگر گوشے چھلنی ہوئے خاکستر پڑے ہوئے تھے۔ انسانوں کے جنگل میں بے پر پنچھیوں کو پہلی پرواز سے پہلے ہی گھونسلوں سے گرا کر روند دیا گیا تھا۔ یہ کیسے طاقتور تھے جو اپنی حیوانیت کا شکار ناتوانا، کمزور اور بے بس نفوس کو کر کے اپنی برتری کا احساس دلا رہے تھے۔ عجب دیوانگی تھی۔ آٹھ سالہ معوذ اور اُس جیسے سیکڑوں بچے اپنے وطن کے اُن دشمنوں کی بربریت کا شکار ہوئے تھے جو انسانیت کے خانے سے خارج تھے۔

عائشہ کا دکھ عظیم تر تھا۔ اہلِ وطن اُن ماؤں کے دکھ پر اشکبار تھا۔ جن کے معوذ جیسے سپوت وطن کی مٹی پر نثار ہو

قربان ہو کر ایک نئی فصل کو خزاں میں کاشت کر کے نئے موسم کے پھل پھول دے کر بتا گئے تھے کہ قربانی کا عمل زندگی کو دوام ہی نہیں بخشتا بلکہ آنے والوں کو اپنے پیچھے اندھیروں کو اجالنے کا عزم وحوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

☆......☆......☆

خون آلود کفن میں لپٹا معصوم معوذ کا چہرہ چاند کی طرح تابناک اور روشن عائشہ کی طویل خاموشی کو آخر ٹوٹنے پر مجبور کر گیا تھا۔ عائشہ کے والد نثار گل نواسے کی سالگرہ پر سرپرائز دینے کی غرض سے آئے تھے اور اب خود حیران کن صورتِ حال سے دوچار بیٹھے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھے اُسے حوصلہ اور ڈھارس دینے کی کوشش میں تھے۔ عائشہ بھی اپنے غم گسار و ہمدرد باپ کی شفقت پاتے ہی کھنکتی مٹی کی طرح بجنے لگی تھی۔

''بابا...... میرا...... معوذ آپ نے دیکھا۔ وہ...... وہ بھی...... ز...... ما...... ن کی طرح مجھے تنہا چھوڑ گیا...... وہ کہتا تھا...... اس بار...... وہ بھی اپنے دوستوں کی طرح کہیں جانا چاہتا ہے...... آپ کے پاس...... مگر...... وہ تو بہت دور...... ہمیشہ کے لیے چلا گیا...... مجھے بتایا بھی نہیں۔'' زمان نے بھی مجھے نہیں بتایا تھا۔ وہ بھی چلا گیا اور یہ بھی۔''

''وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں گئے میرے بچے...... اللہ کا حکم تھا انہیں واپس لوٹنا تھا۔ جس طرح ہم سبھی کو وقتِ مقررہ پر اُس کے حضور حاضر ہونا ہے۔ ہمارا بلاوا تو نجانے کب اور کس حالت میں ہوگا مگر دیکھو اللہ نے ہمارے پیاروں کو کس شان اور اعزاز سے اپنے قرب کی سعادت بخشی ہے۔ تم چاہتی تھیں نا کہ معوذ ہمارے وطن پر اپنی جان نثار کردے تو ایسا ہو گیا ہے۔ میرے بچے اللہ کے اس احسان پر شکرانہ ادا کرو کہ ہمیں اُس نے اپنے پیاروں سے وابستہ کیا ہے۔ ہمیں ظالموں کا ساتھ دینے والا نہیں بنایا۔'' نثار گل کی باتیں اثر انگیز تھیں عائشہ کا دل خود بھی ایمان کی شمع سے روشن و منور تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی سنبھل گئی۔

''بابا جان...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اُس نے ہماری تمناؤں اور خواہشوں کے مطابق ہمیں عطا کیا ہے اور اُن حیوانوں کو اُن کے اعمال کے مطابق سزا بھی وہی دے گا انشاء اللہ...... ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کہ ہم اللہ کی طرف سے انعام پانے والوں میں شمار ہیں۔ اُس کے غضب کو آواز دینے والوں میں سے نہیں۔''

☆......☆......☆

عائشہ غمگین ہے افسردہ ہے زندگی کا رخ بدلنے پر کبھی کبھی متذبذب بھی رہتی ہے۔ ماں کا دل جو اُس کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ بچے کی جدائی پر سسکتا بلکتا بھی ہے۔ اور پھر اُس کی ممتا کی دھڑکنیں فخر و انبساط سے خراماں و رواں ہو جاتی ہیں۔ وہ معوذ جیسے بچے کی ماں ہے یہ احساس اُسے زندگی کے نئے رُخ سے روشناس کرواتا نئی سمت لے آیا ہے۔ اُس نے ملٹی نیشنل کمپنی سے استعفیٰ دے کر اُسی اسکول میں معوذ جیسے بچوں کو علم کی روشنی بانٹنے کی درخواست دی ہے اور اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کا بھی ارادہ باندھا ہے۔

وہ آرمی پبلک اسکول کے ہر شہید کو ہر نماز میں اپنی دعاؤں کے تحفے بھیج کر اپنی محبتوں کا ایقان منتقل کرتی ہے۔ زندگی سے اُسے اب کوئی شکایت ہے نہ گلہ۔ اُس کی گود میں پروان چڑھنے والا اُس کا جگر گوشہ اپنی پیدائش کے یوم پر ہمیشہ رہ جانے والی زندگی سے ہم کنار ہوا تھا۔ اُسے اللہ سے اور کیا چاہیے تھا۔

☆......☆......☆

''اور تم کیا جانو...... شہید کی موت اصل میں اللہ سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ شہید کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اللہ سے ملاقات کی راحت پانے کی لذت دنیاوی زندگی کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ آیات کا مفہوم عائشہ کی سماعتوں میں گونجتا اُسے زندہ رہنے کی طرف بلکہ زندگی جینے کی طرف راغب کر گیا تھا۔

☆......☆......☆

''رات کو مجھے اچانک جہانگیر خان کا فون آیا، وہ مجھ سے تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے۔''
''مم...... میرے متعلق؟'' میں ہکلا کر بولی۔'' ہاں وہ تمہارے گھر کے بارے میں پوچھ رہے تھے، وہ تمہارے گھر آ کر تمہیں پرپوز کرنا چاہتے ہیں۔'' میڈم کی بات......

ناولٹ نمبر کی سوغات، ایک بہت منفرد ناولٹ

میں اور علیزہ ایک جان دو قالب تھے۔ ہم دونوں کی دوستی سے ہر کوئی واقف تھا۔ ہم اسکول کے وقت کے ساتھ ساتھ تھے اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی...... ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے...... ہمارے بیچ کوئی بھی بڑا جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھار اختلاف رائے ہو جایا کرتا تھا جس نے ہمارے درمیان کوئی بھی دیوار نہیں کھڑی کی تھی۔
آج کل ہم دونوں ایک پرائیویٹ کالج میں بطور لیکچرار کے اپنی ڈیوٹیاں انجام دے رہے تھے۔ ہم دونوں کی الگ الگ کہانیاں تھیں...... نہیں بلکہ حقیقتیں تھیں...... میری خاصی بڑی فیملی تھی...... ابا وفات پا چکے تھے۔ ہم چار بہنیں تھیں اور دو بھائی تھے۔ ہم چاروں بہنیں بھائیوں سے بڑی تھیں...... تینوں بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی ابھی اسکول گوئنگ تھے...... ابا کی وفات نے ہمیں معاشی طور پر بڑا دھچکا پہنچایا تھا...... ہماری کلاس تو پہلے ہی مڈل کلاس تھی۔ پھر بھی ابا کی زندگی میں بڑے اچھے سے گزارا ہو جاتا تھا کیوں کہ ابا کا ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور تھا۔ جس میں سے اچھی آمدنی ہو جایا کرتی تھی...... لیکن ابا بس چند دن بیمار رہے اور جب تک ہم ان کی بیماری سمجھتے وہ جان جانِ آفرین کے سپرد کر گئے تھے۔ بڑے کٹھن دن تھے وہ...... اماں بیٹیوں کو دکان پر نہیں بٹھا سکتی تھیں۔ تینوں داماد اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ کچھ وقت تو نوکروں کے ذریعے دوکان چلی، لیکن جب اماں کو اندازہ ہوا کہ نوکر سب کچھ خود ہی بٹور رہے ہیں تو انہوں نے دوکان اونے پونے بیچ کر اس باب کو ہی بند کر دیا۔ ان دنوں جب گھر کے حالات دگرگوں ہو رہے تھے...... مجھے ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار شپ مل گئی اور اس طرح گھر کی گاڑی بری بھلی چلنے لگی۔ علیزہ بھی مڈل کلاس لڑکی تھی لیکن وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ سو وہ رئیسوں جیسی زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکچرار شپ بھی وہ اپنے شوق کی بنا پر کر رہی تھی بقول اس کے کہ وہ صرف

اور صرف میرے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ جاب کر رہی تھی...... ہم دونوں کا ابھی رشتہ طے نہیں ہو سکا تھا جس کا اماں کو بہت قلق تھا...... علیزہ تو اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ میری اور اس کی دوستی کو بھی اماں نے پسند نہیں کیا تھا۔ لیکن آج کل اماں کو میری شادی کی شدید فکر لاحق ہو گئی تھی۔ جب سے میری تیسری بہن رومانہ کے شوہر نے دبے لفظوں میں رومانہ کو کہا تھا کہ اماں میری شادی اس لیے نہیں کروائیں گی کہ میری وجہ سے ان کے گھر کی گاڑی چل رہی ہے حالانکہ میں جانتی تھی کہ اس بات میں زیرو فیصد بھی سچائی نہیں تھی۔ اماں میری شادی کی فکر میں ہر وقت ہلکان ہوتی رہتیں لیکن ابھی تک کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملا تھا۔ ابھی حال ہی میں اماں نے اپنے گھر کے اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا تھا۔ جس سے آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اماں اپنے طور پر گھریلو قسم کا بزنس بھی کرتی تھیں...... مثلاً شامی کباب اور سموسوں کے پیکٹ بنا کر سٹورز میں دینا...... ایسے کئی چھوٹے موٹے کام کر کے وہ اپنی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ کر رہی تھیں...... میں خاصی اسمارٹ تھی نین نقش بھی اچھے تھے لیکن میرا رنگ سانولا تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ میری سانولی رنگت ہی میرے رشتے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی تھی...... میں بڑی مست ملنگ ٹائپ لڑکی تھی...... میں سمجھتی تھی جب بھی خدا کو منظور ہوگا میری شادی ہو جائے گی...... اور اگر اللہ نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگی...... بہت سی لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتی اور وہ شادی شدہ سے اچھی زندگی گزار رہی ہوتی ہیں...... میرے اس خیال سے علیزہ بھی متفق تھی لیکن ایک بات کا میں اعتراف کرتی ہوں علیزہ مجھ سے زیادہ گڈ لکنگ تھی۔ اس کی رنگت سفید تھی اس کے نقوش تیکھے تھے اور قد لانبا تھا۔ اس کے بال لمبے گھنے اور کالے تھے۔ جو اس کے گورے چہرے پر لہراتے بہت بھلے لگتے تھے اس کے بہت سارے رشتے آتے تھے لیکن ابھی بات نہیں بنی تھی...... شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے وہ ہر رشتے میں میخ نکال کر اسے ریجیکٹ کر دیتے تھے۔

اس دن کالج سے گھر لوٹی تو اماں کو بہت خوش پایا۔ جب سے اماں پر ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ آن پڑا تھا اماں کا موڈ ہر وقت آف ہی رہتا تھا۔ لیکن آج اماں بہت مسرور بے حد شاداں اور مگن نظر آ رہی تھیں۔ اماں کو خوش دیکھ کر میرے اندر طمانیت پھیل گئی۔

''کیا بات ہے اماں...... کیا آج کوئی خزانہ مل گیا ہے آپ کو۔'' میں مسکرا کر اماں سے پوچھنے لگی۔

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔'' اماں نے بڑا لفرئی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھے شریک نہیں کریں گی...... اپنی اس خوشی کے خزانے میں۔''

''ارے کروں گی...... سو بار کروں گی...... تیری شرکت کے بغیر تو کچھ بھی ہونے سے رہا۔'' اماں خوشی سے لبریز آواز میں بولیں۔ تو میں حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اماں میری طرف جھک کر رازداری سے بولیں۔

''تیرے لیے بہت اچھا رشتہ آیا ہے مینا۔''

''اچھا۔'' میرے اچھے موڈ میں اضافہ ہو گیا۔ کون ہیں؟...... کیسے لوگ ہیں؟''

اماں اسی رازداری سے بولیں۔

''تیری خالہ ہے نازینت...... اسی نے ساری بات کر لی ہے بہت اچھا رشتہ ہے بلکہ بہترین

ہے...... لڑکے کی دو بہنیں ہیں۔ جو شادی شدہ ہیں...... نہ ماں ہے نہ باپ لڑکا دوبئی میں اچھی پوسٹ پر کام کرتا ہے...... ابھی چھٹیوں میں گھر آیا ہے تو بہنوں نے اس کا گھر بسانے کا فیصلہ کیا ہے...... وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہیں...... زینت نے تیری تصویر دکھا دی۔ تیرے کردار کی تعریف کی...... بس انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ تجھے ہی بھابی بنانا ہے...... آج وہ آ رہی ہیں...... لڑکا بھی ساتھ آ رہا ہے کہ ہم لڑکا دیکھ لیں۔'' اماں نے ایک ہی سانس میں بات ختم کی...... ''اچھا تو بس تو کچن دیکھ میں ذرا کمر سیدھی کرلوں صبح سے کچن میں کھڑی ہوں۔ کمر اکڑ گئی ہے۔''

میں کچن میں آئی تو بہت پھیلاوا کچن میں پھیل چکا تھا۔ اماں نے اپنے طور پر کچھ ڈشز تیار کرلی تھیں لیکن ابھی بھی میرے کرنے کو بہت کام باقی تھے۔ کگر میں ابلے چنے پڑے تھے...... جن کو پیاز ٹماٹر سے آراستہ کر کے ڈش تیار کرنی تھی...... دوسری دیگچی میں گاجریں دودھ اور چینی کے ساتھ گل چکی تھیں لیکن ابھی اس پر کھویا پھیلانا اسے الائچی کا بگھار دینا باقی تھا۔ میں دوپٹہ کمر میں باندھ کر کام میں جت گئی۔ میں کام میں مگن تھی کہ آہٹ کی آواز پر چونک کر پیچھے دیکھا تو میرے پیچھے علیزہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ''ارے...... تم کب آئی؟''

''ابھی آئی ہوں۔ لیکن یہ کیا...... کیا کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں۔'' اس نے کچن میں بکھرے پھیلاوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' میں دھیرے سے مسکرائی۔ اماں اتنی فراخدل نہیں کہ عام مہمانوں کے لیے اتنا بکھیڑا کھڑا کردیں۔''

''ارے مجھے بھی تو بتاؤ وہ خاص الخاص مہمان کون ہیں؟'' وہ اپنی آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے بولی۔

''میرے رشتے کے لیے آ رہے ہیں۔'' میں نے زیادہ سسپنس نہیں پھیلایا تو وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

''ارے مینا سچ کہہ رہی ہے تو......'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جلدی سے بولی۔

''اچھا اب مجھے بھی کام بتا...... تیرے سسرالیوں کے لیے میں بھی کچھ کرلوں۔'' میں بے ساختہ ہنس پڑی۔

''میں نے سب کرلیا ہے...... اب تم انگلی کٹوا کر شہیدوں میں نام شامل کرنا چاہتی ہو۔'' ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا تو اماں کو گویا ہمارے قہقہے نے نیند سے جگا دیا۔ وہ سیدھی کچن میں آئی اور علیزہ کو میرے ساتھ دیکھ کر ان کا موڈ آف ہوگیا۔ علیزے نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے منہ ہی منہ میں بدبدا کر سلام کا جواب دیا اور پھر مجھے مخاطب کر کے بولیں۔

''ان لوگوں کے آنے کا وقت ہوگیا ہے۔ تم نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں؟''

''کرلیا ہے اماں...... بس اب تیار ہونے جا رہی تھی۔'' میں علیزہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی...... علیزہ نے میرے کپڑے نکالے اور مجھے تیار ہونے میں مدد کی...... چائے کی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے میں اندر گھسی، تو بالکل سامنے وہ لڑکا جس کا نام اماں نے اکبر بتایا تھا۔ وہ اپنی نظروں میں شوق کا طوفان لیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ساتھ میں اس کی بہنوں کی نظریں بھی مجھ پر جمی تھیں۔ میں کنفیوز سی ہوگئی، لیکن اس وقت علیزہ میری مدد کو آ پہنچی...... مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ

ان لوگوں کے لیے چائے بنانے لگی۔اماں نے میری شادی شدہ بہنوں کو اس موقع پر نہیں بلایا تھا۔ ان کا جواز یہ تھا کہ تمہاری بہنیں اپنے بچوں کے ہمراہ آتی ہیں تو چائے کے لیے ڈبل لوازمات پکانے پڑتے ہیں......اور اس چھوٹے سے گھر میں اتنی اُدھم مچ جاتی ہے کہ مہمانوں کا دل ہی نہیں چاہتا کہ اس کچ پچ والے گھر میں رشتہ کریں۔اماں کے خیال سے مجھے اتفاق نہیں تھا لیکن میں چپ کر گئی...... مہمانوں نے بڑے اچھے طریقے سے چائے پی لی۔اس دوران وہ مجھ سے چھوتے موٹے سوالات بھی کرتے رہے......اکبر زیادہ تر خاموش رہا...... وہ خود بھی ایک سلجھا ہوا سنجیدہ نو جوان لگ رہا تھا...... چہرے پر ایک نرم سا تاثر پھیلا تھا۔ جو اس کے مردانہ وقار میں اضافہ کر رہا تھا۔وہ لوگ رخصت ہوئے اماں کو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ ایک دو دن میں انہیں جواب سے مطلع کریں گے......اماں بڑی خوش تھیں...... انہیں سو فیصد امید تھی کہ اس بار یہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ انہیں اکبر بھی داماد کے طور پر بہت پسند آیا تھا۔اور وہ بار بار کہہ رہی تھیں دیکھ لینا بینا...... اکبر تیرے سارے بہنوئیوں سے اچھا ثابت ہوگا۔

میں شرما جاتی......علیزے بھی مجھے اکبر کے حوالے سے چھیڑ رہی تھی۔اماں کی بات دوسری تھی لیکن علیزے سے تو میں بہت فری تھی۔سو جب اس نے ہنس کر کہا۔

”بینا......اکبر جیسا شوہر پا کر تو تو آسمانوں میں اڑنے لگے گی...... تیرے پیر زمین پر نہیں ٹکیں گے اور جب میں تم سے ملنے آؤں گی تو تو نوکر سے کہے گی کہ کون علیزے؟ جاؤ اس سے کہہ دو کہ میں اپنے میاں کے ساتھ مصروف ہوں۔

میں کھل کھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

تو کیسے ملنے آئے گی جانم...... میں تو دوبئی میں ہوں گی۔

وہ جلدی سے بولی۔

”کیا میں دوبئی نہیں آسکتی۔ارے میری جان اگر تو امریکہ میں بھی ہوئی تو میں وہاں بھی ملنے آؤں گی۔ وہ مجھے گلے لگاتے ہوئے پیار سے بولی۔

علیزے نے اگلے دن ہی یونیورسٹی کی دوستوں کو بتا دیا کہ میرے آزادی کے دن ختم ہونے والے ہیں اور میں بہت جلد پیا دیس سدھارنے والی ہوں۔سہیلیوں نے مبارکبادیں دیں۔جنہیں میں خوشی خوشی وصول کرتی رہی۔

لیکن دو دن بعد ایسی خبر سننے کو ملی کہ مجھے تو جو دکھ ہوا سو ہوا لیکن اماں تو جیسے ڈھے ہی گئیں۔اس دن سنڈے تھا۔میں گھر پر تھی آج کچن کا سارا کام کرنے کی میری باری تھی میری کوشش ہوتی کہ آج کے دن میں ماں کو کام کو ہاتھ لگانے تک نہ دو ں سنڈے کو بھی میں صبح منہ اندھیرے اٹھ جاتی اور سارے گھر کی صفائی کرتی۔ پھر کچن میں آکر دو ہانڈیاں بنا لیتی کہ ایک آدھ دن اماں کو کچھ نہ پکانا پڑے۔ ہفتے بھر کے گندے کپڑے مشین میں دھو دیتی۔اس وقت بھی میں ایک ہانڈی بنا چکی تھی اور دوسری ہانڈی یعنی آلو مٹر بنانے کی تیاری کر رہی تھی کہ زینت خالہ آ گئی۔اماں کب سے زینت خالہ کے انتظار میں تھیں......آج انہیں دیکھ کر اماں بے طرح خوش ہو گئیں......گرمجوشی سے انہیں گلے لگایا اور خوشی سے لبریز آواز میں مجھے آواز دے کر بولیں۔

اری بینا...... چائے بنا کر لا......اچھی سی تیری زینت خالہ آئی ہے۔

”نہیں آپا...... چائے کو دل نہیں کرتا۔“

زینت خالہ کی آواز بجھی بجھی سی تھی...... میں نے چائے کا پانی چولھے پر رکھ دیا لیکن میرا سارا جسم کان بن کر اماں اور زینت خالہ کی باتیں سن رہا تھا۔ زینت خالہ پوچھ رہی تھیں۔

آپا...... جب وہ لوگ اس وقت رشتے کے لیے آئے تو مینا کی کوئی دوست بھی یہاں تھی۔؟

ہاں...... وہ دم چھلی تو ہر وقت مینا کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ اس دن بھی یہاں تھی......'' اماں کی آواز میں ناگواری اور بے زاری تھی۔ جہاں اس کے ذکر پر مجھے حیرت ہوئی وہاں اماں بھی حیرانگی سے بولیں۔

''لیکن زینت ...... اس لڑکی کا یہاں کیا ذکر ہے؟''

سارا مسئلہ تو اس لڑکی کا ہی ہے...... اگر وہ نہ ہوتی تو مینا کا رشتہ طے پا جاتا۔''

کک...... کیا مطلب۔'' اماں کی آواز میں اندیشے لرز رہے تھے۔

''مطلب یہ ہے کہ...... اکبر نے اس دوسری لڑکی کو پسند کر لیا ہے...... بہنیں بے چاریاں تو بڑی شرمندہ ہو رہی تھیں...... لیکن وہ بھی کیا کریں...... جب لڑکے نے ہی راستہ بدل لیا۔''

میرا تو جی دھک سے رہ گیا۔

لیکن اماں پر کیا گزری...... یہ تو میں کچن میں بیٹھے بیٹھے بتا سکتی تھی...... کتنی دیر تک اماں کی آواز ہی نہیں آئی...... میں گھبرا گئی...... مجھے اماں کی فکر ہونے لگی میں تیزی سے کچن سے باہر آ کر صحن میں آ گئی۔

اماں...... اماں آپ ٹھیک تو ہیں ناں......؟''

میں نے گم صم...... بے دم سی بیٹھی اماں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اماں نے ایک تیز نظر مجھ پر ڈالی اور غصے سے بولیں۔

''میں نے سو بار سمجھایا تھا کہ اس لڑکی سے دوستی ختم کر دے...... یہ تجھے تباہ کر دے گی۔ پر تو نے میری ایک نہ مانی۔ دیکھ لیا...... میری چھٹی حس کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔''

اماں میں نے حیرت سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''اس میں علیزے کا کیا قصور ہے...... اس نے تو انہیں نہیں کہا تھا کہ مینا کو چھوڑ کر مجھے پسند کریں۔''

اماں میری بات پر توجہ دیے بغیر رونے لگیں...... وہ زارو قطار رو رہی تھیں۔ آنسو کسی آبشار کی طرح ان کے گالوں پر گر رہے تھے۔ مجھے اماں کا رونا بہت تکلیف دے رہا تھا۔ جب خواب ٹوٹتے ہیں تو بندے کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ خواب تو میرے بھی ٹوٹے تھے لیکن مجھے اس وقت اپنے خوابوں کے ٹوٹنے کا دکھ نہ تھا۔ مجھے تو ماں کے خواب ٹوٹنے کا دکھ تھا۔ انہوں نے تو اکبر کو اپنا داماد بھی سمجھ لیا تھا۔ اس بار تو انہیں سو فیصد یقین تھا کہ یہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ میرا کیا تھا۔ میں تو اب اس کھیل کی عادی ہو چکی تھی۔ میں نے تھک کر سوچا اور اماں کو بہلانے لگی۔

''اماں...... نصیب سے زیادہ کسی کو کچھ نہیں ملتا اگر علیزہ نہ آتی تو کوئی اور وجہ بن جاتی...... لیکن یہ رشتہ طے نہ ہوتا۔ کیوں کہ یہ میرے نصیب میں نہیں تھا۔''

اماں آنسو پونچھ کر ہٹ دھرمی سے بولیں۔

''تو کچھ بھی کہے...... میں تو یہی کہوں گی یہ رشتہ علیزہ کی وجہ سے نہیں ہوا...... اب بھی وقت ہے مینا...... اس لڑکی سے دوستی ختم کر دے۔''

اچھا اماں...... ختم کر دوں گی۔ پر آپ تو خود کو سنبھالیں نا...... پلیز اماں...... ساری دنیا اس اکبر

پر ختم تو نہیں ہوئی.......''

لیکن اماں کوئی جواب دیے بغیر منہ موڑ کر لیٹ گئیں اُن کی سسکیاں اب بھی جاری تھیں......اس دوران خالہ زینت چپکے سے اٹھ کر چلی گئی تھیں...... میں تھکے تھکے قدموں سے کچن کے باقی کام ختم کرنے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

شام کو اماں کو تیز بخار آ گیا۔ بخار اتنا تیز کہ وہ ہذیان بول رہی تھیں۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے اپنے بھائی سعید کو جلدی سے محلے کے ڈاکٹر کے پیچھے دوڑایا۔ ڈاکٹر نے ان کا چیک اپ کیا اور دوائیاں دیں۔ میں اماں کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ اماں کچھ دن خاصی بیمار رہیں میں نے کالج سے چند دن کی چھٹی لی اور دن رات اماں کی خدمت میں لگی رہی چوتھے دن اماں کا بخار ٹوٹ گیا لیکن وہ اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ چارپائی سے اٹھنا بھی ان کے لیے محال تھا...... میرے کالج کا بہت ہرج ہو رہا تھا...... اماں کمزور ضرور تھیں لیکن اب ٹھیک تھیں...... میں نے اپنی ایک شادی شدہ بہن کو اُن کی خدمت کے لیے بلایا تھا اور خود کئی دن کی غیر حاضری کے بعد کالج چلی گئی۔

کالج میں ساری کولیگز میرے ارد گرد جمع ہو گئیں۔ سب کو معلوم تھا میری غیر حاضری کا سبب اماں کی بیماری ہے۔ سو سب ان کے بارے میں پوچھنے لگیں لیکن مجھے حیرت ہوئی ان میں علیزہ نہیں تھی...... میں نے بے اختیار پوچھا۔

''علیزہ کہاں ہے؟'' کیا وہ آج کالج نہیں آئی؟''

''وہ تو خود کئی دن سے نہیں آ رہی'' حنا نے جواب دیا۔

''اور سنا ہے کسی اکبر نامی لڑکے سے اس کی بات پکی ہو گئی ہے۔'' نمیزہ نے لقمہ دیا۔ اکبر کے نام پر میرے دل نے ایک بیٹ مس کر دی شاید اکبر اور علیزہ کے قسمت کے ستارے ملتے تھے۔ اس لیے وہ اسے خدا نے میرے گھر بھیج دیا اور اکبر نے اسے پسند کر لیا۔ میرے دل میں علیزہ کے لیے کچھ نہیں تھا...... میں تھی ہی ایسی لڑکی...... میرے دل میں کسی کے لیے کوئی منفی جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں ہر بات کو مثبت انداز میں لیتی تھی...... اور علیزہ کے لیے تو میرے دل میں کوئی غلط بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ بچپن سے لے کر اب تک ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دکھ سکھ شیئر کیے تھے۔ اب وہ میرے ساتھ کچھ کیسے بُرا کر سکتی تھی۔ لیکن جب اماں کو پتا چلا تو اماں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ علیزہ کو کوس کوس کر وہ تھک گئیں۔ مجھے بھی ساتھ رگید ڈالا۔ مجھے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ انہوں نے مجھے برا بھلا کہہ ڈالا، پرواہ تھی تو اس بات کی کہ کہیں اماں کی طبیعت پھر سے خراب نہ ہو جائے۔ کچھ دن تو اماں اسی بات کے زیر اثر رہیں......کبھی علیزہ کے خلاف بولتی کبھی مجھے طعنے تشنے دیتی......کبھی کھانے پینے پر غصہ نکالتی اور کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیتیں میں منت سماجت کر کے انہیں کھانا کھلاتی دودھ کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا کر انہیں زبردستی پلاتی۔ آہستہ آہستہ ان کی حالت نارمل ہونے لگی۔ اس دن بڑے دنوں بعد علیزہ کالج آئی۔ میں اماں کی بیماری میں ایسی الجھی تھی کہ مجھے اس سے بات کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ علیزہ جیسے ہی میرے سامنے آئی۔ میں بے تابی سے اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''کیسی ہو علیزہ؟'' آج اتنے دنوں بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔''

علیزہ میری نیچر سے اچھی طرح واقف تھی۔

اس لیے اُسے حیرت تو نہیں ہوئی لیکن وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ باقی کولیگز اس سے اس کی منگنی اور اکبر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اصلی بات کا تو ان کو علم ہی نہ تھا۔

میں خالی پیریڈ میں کالج کے پچھلے لان میں آ گئی تو میرے پیچھے پیچھے علیزہ بھی آ گئی۔

''مینا...... تم مجھ سے ناراض ہو نا؟'' وہ چھوٹتے ہی بولی اس کے چہرے پر شرمندگی پھیلی تھی۔

''نہیں...... میں کس بات پر ناراض ہوں گی تم سے بھلا۔'' میں نے اُسے جواب دیا تو وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے رُندھی آواز میں بولی'' مجھے معاف کر دو مینا۔''

''ارے میں نے آگے بڑھ کر اسے بے اختیار گلے لگایا۔

ہم دونوں کا رشتہ کیا ایسا ہے۔ جس میں معافی تلافی کی گنجائش ہو۔ وہ بھرائی آواز میں بولی۔''

''مینا...... میں اکبر سے شادی بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جانے وہ کیسے میرے گھر تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن امی جسے میرے لیے کوئی رشتہ پسند نہیں آتا تھا...... وہ اس رشتے پر ریجھ گئیں۔ بطور داماد اکبر انہیں بہت پسند آیا تھا۔

اور پھر دوبئی کا چارم...... بس میرے لاکھ ناں ناں کرنے کے باوجود انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔''

''دیکھو علیزہ۔'' میں نے رسان سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ تو تمہارا اور اکبر کا جوڑ بھی خدا نے آسمانوں میں بنایا تھا۔ مجھے نہ تم سے کوئی گلہ ہے نہ ناراضگی۔'' وہ میرے گلے لگ کر بے اختیار رو دی تھی۔

''مینا تم کتنی اچھی ہو۔ تمہارا دل کتنا صاف و شفاف ہے، بالکل کسی شیشے کی طرح۔''

میں نے مسکرا کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا...... اور تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں پہلے کی طرح ایسے باتوں میں مگن ہو گئے۔ جیسے پہلے ہوتے تھے۔ لگتا نہ تھا ہمارے درمیان کوئی انوکھا سا واقعہ ہوا ہے۔

علیزہ کی شادی ہو گئی۔ میں چاہتے ہوئے بھی شادی میں شرکت نہ کر سکی کہ ان دنوں اماں کی طبیعت پھر سے خراب ہو گئی تھی...... علیزہ کا شادی کا گفٹ میں نے اپنی کولیگ حنا کے ہاتھ اسے بھجوا دیا تھا۔ اماں کو مزید تکلیف نہ پہنچے اس خیال سے میں نے نہ تو علیزہ کی شادی کا انہیں بتایا نہ اپنے گفٹ کے بارے میں انہیں بتایا حالانکہ میں اماں سے چھوٹی سی چھوٹی بات شیئر کرتی تھی۔

شادی کے فوراً بعد علیزہ دوبئی چلی گئی تھی۔ کچھ عرصے ہم ایک دوسرے کو فون اور ایس ایم ایس کرتے رہے۔ پھر بعد میں میرے مختلف مسائل کی وجہ سے یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ان دنوں گھر میں چھوٹے موٹے پرابلمز چل رہے تھے...... دونوں چھوٹے بھائیوں کو توجہ دینا ضروری ہو گیا تھا...... ان کا تعلیمی ریکارڈ بھی اچھا نہیں جا رہا تھا...... میں نے انہیں اچھے اسکولوں میں ڈالا اور پھر انہیں پڑھانے کی ذمہ داری بھی اپنے سر اٹھا لی۔ اماں کی خراب صحت کی بنا کر گھر کی ذمہ داریاں بھی نبھاتی تھیں۔ جاب کا بھی بوجھ تھا...... اماں کی تیمارداری ان کا خیال رکھنا غرض میں کچھ ایسی گھن چکر بنی کہ مجھے ذرا بھی فرصت نہیں ملتی تھی کہ میں کسی سے کوئی بھی رابطہ رکھتی اور شاید علیزہ بھی اپنی نئی زندگی میں مگن ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کی طرف سے بھی خاموشی تھی۔

کالج میں ہر خاص موقعے پر فنکشن ہوتے

رہتے تھے......اب کہ ویلنٹائن ڈے کے موقعے پر پرنسپل صاحبہ نے ایک گرینڈ فنکشن ترتیب دیا تھا۔ جس میں ''محبت ہے زندگی'' کے عنوان پر ایک تقریری مقابلہ تھا۔ جس میں جہانگیر خان نامی شہر کے ایک نامی گرامی شخصیت کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ حنا کو اس سلسلے میں ہمیشہ ہر قسم کی معلومات رہتی تھیں...... وہ اپنے مخصوص لہجے میں میں میرے کان میں گھسی دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''جہانگیر خان علاقے کی دبنگ شخصیت ہیں'، جس ادارے میں مہمان خصوصی بن کر جاتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے رقوم دینے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ تب ہی تو ہماری پرنسپل صاحبہ نے اس بار انہیں مدعو کیا ہے۔'' وہ مسکرا مسکرا کر بتا رہی تھی۔ ہم تمام لیکچرار انتظامات میں مصروف تھیں...... میں اس کی بات کچھ سن رہی تھی کچھ نہیں سن رہی تھی...... وہ بتا رہی تھی۔

''موصوف الیکشن بھی جیت چکے ہیں...... ان کے وزیر بننے کے بہت چانسز ہیں...... سب لوگ حیران ہیں کہ اس چھوٹی ایج میں انہوں نے اتنی ترقیاں کر لیں۔''

بابا...... یہ کرسیاں یہاں رکھ دو۔'' میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے چوکیدار بابا سے کہا۔ حنا بہت باتونی تھی...... ہمیشہ کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی اور کام سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ لیکن میں تو کام کے بارے میں بہت پھرتیلی تھی اور جہاں ذمہ داری مجھ پر آن پڑتی تو میں وہاں جان مارا کرتی تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے میری اس کوالٹی کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے آج کے تمام انتظامات کا انچارج بنایا تھا اور میری ساری توجہ اپنے کام پر تھی۔

میری زیر نگرانی تمام انتظامات احسن طریقے سے ہو گئے۔

سارا کالج دلہن کی طرح سج گیا تھا۔ پرنسپل صاحبہ کی نظروں میں میرے لیے ستائش اور منہ پر تعریفی کلمات تھے...... وقت مقررہ پر طالبات اور ان کے عزیز واقارب آنے شروع ہو گئے۔ کچھ دیر میں کالج کا ہال لوگوں سے بھر گیا...... تھوڑی دیر میں مہمان خصوصی بھی آ گئے...... حنا کا صحیح کہنا تھا ان کی عمر بھی خاصی کم تھی اور وہ لمبے تڑنگے پٹھانوں جیسے حسن کے حامل تھے...... انہوں نے سادہ سی قمیض شلوار پہن رکھی تھی۔ پیروں میں چارسدہ زمانے کی چپل تھی۔ ہنستا مسکراتا چہرہ لیے وہ اپنے مخصوص صوفے پر بیٹھ گئے...... پرنسپل صاحبہ اور ہم تمام ٹیچر ان کے استقبال کے لیے کھڑی تھیں۔ انہوں نے ایک اچٹتی نظر ہم سب پر ڈالی۔ تقریری مقابلہ شروع ہوا۔ اس مقابلے میں کالج کی کوئی ٹیچر وغیرہ حصہ نہیں لے سکتی تھی۔ لڑکیوں نے اس مقابلے میں جوش وخروش سے حصہ لیا...... ہر ایک لڑکی کی تقریر پرخوش اور مدلل تھی...... انعامات بھی مہمان خصوصی کے ہاتھوں دیے گئے۔ آخر میں انہوں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی کہ اس طرح کی سرگرمیاں ہر تعلیمی ادارے میں ہونی چاہیے کہ غیر تعلیمی سرگرمیاں طالب علموں پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ اس سے زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ! مہمان خصوصی اور ان کے ساتھ آئے مہمانوں کے لیے ہم نے عشائیہ کا بندوبست کر رکھا تھا...... ہاں میں یہ بتانا بھول گئی کہ جہانگیر نے ہمارے کالج کے لیے اچھا خاصا ہدیہ عنایت کیا تھا۔ جس نے ہماری پرنسپل کے چہرے پر مسکراہٹوں کے پھول سجا دیے تھے اور وہ بڑھ بڑھ کر ان کی خاطر مدارت کر رہی تھیں...... عشائیہ کے دوران ہم ٹیچرز بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ وہیں پرنسپل

صاحبہ نے ہمارا بھی ان سے تعارف کروایا۔ میری باری آئی تو پرنسپل صاحبہ نے کہا۔ "یہ مینا ہے۔ میرے کالج کی سب سے محنتی لڑکی، آج کے فنکشن کی ساری تیاری اس نے کی ہے۔

شوخ سی نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے بولے۔

آپ ہیں مینا ہیں...... تو اتنی خاموش کیوں ہیں...... مینا تو ہر دم چہکتی ہے۔

میں مسکرائی لیکن خاموش رہی...... چائے کے دوران میں چائے کا کپ لے کر ایک کونے میں کھڑی تھی۔ سارے لوگ گروپ بنا کر خوش گپیوں میں مصروف تھے...... وہ جانے کہاں سے میرے قریب آ گئے۔

آپ یہاں اکیلی کھڑی ہیں...... اور...... آپ نے اتنا کچھ ہمارے لیے رکھا ہے۔ خود کچھ بھی نہیں لے رہیں۔ چائے کا خالی کپ لیے کھڑی ہیں۔"

میں گھبرا گئی...... وہ سیدھے میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے ستارے چمک رہے ہوں...... خدا نے میری مشکل آسان کی...... اور ہماری ایک لیکچرار مس نجمہ چکن روسٹ کی ڈش اٹھا کر اُن کی طرف آئی اور ان سے استدعا کرنے لگیں کہ وہ اس میں سے کچھ لے لیں۔ ان کی توجہ مجھ سے ہٹ کر ان کی طرف ہو گئی۔ میں اپنی کولیگز کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن میں نے اسٹیج پر بھی محسوس کیا تھا کہ جہانگیر خان کی نظریں مجھ پر جمی ہیں...... سارے فنکشن میں جہاں جہاں بھی جاتی ان کی نظریں میرا طواف کرتی رہتیں...... میں اندر ہی اندر خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔ خدا اِن بڑے لوگوں سے بچائے اِن کی نظروں میں آنا سراسر گھاٹے کا سودا ہوتا ہے کہ عورت تو ان کے نزدیک ٹشو پیپر جتنی حیثیت رکھتی ہے کہ برت کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ میں اندر ہی اندر کانپ رہی تھی...... پھر بھی مجھے اس سوچ پر طمانیت ہوئی کہ میں نہ خوبصورت ہوں اور نہ ہی

امیر گھرانے سے میرا تعلق ہے...... مجھ میں خوبی ہی کیا ہے بس شاید وہ یوں ہی نظر باز سے بندے ہوں گے۔ میں نے خود کو مطمئن کیا اور باقی کے کاموں میں لگ گئی۔

فنکشن کو کافی دن بیت گئے تھے۔ کافی دنوں تک اس فنکشن کی بازگشت کالج کے دور یوار سے سنائی دیتی رہی تھی۔ بعد میں یہ موضوع پرانا ہو گیا۔ جہانگیر خان کی نظریں یاد کر کے میں چند دن اپ سیٹ رہی بعد میں خود ہی اپنی سوچ پر شرمندہ ہو گئی اور اپنے مسائل میں ایسی ڈوب کر رہ گئی کہ ہر بات بھول گئی۔ اماں کی بیماری طویل ہوتی جا رہی تھی صبح مجھے اٹھ کر گھر کا کام بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ بھائیوں کی تیاری ان کو ناشتا وغیرہ کرانا بھی میری ذمہ داری تھی۔ اماں کو ناشتا کرانا اور ان کے لیے پرہیزی کھانا بنانا بھی میری ذمہ داری تھی۔ سو جلدی جلدی کرتے ہوئے مجھے کالج جانے میں دیر ہو جاتی۔ یہ تیسرا دن تھا جب میں کالج کے لیے مسلسل لیٹ ہو رہی تھی۔ اس دن بھی میں خاصی لیٹ ہو گئی تھی۔ میرے جاتے ہی خالہ نے مجھے پیغام دیا کہ پرنسپل صاحبہ نے تمہیں فوراً بلایا ہے! میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ پرنسپل صاحبہ اگر اچھے کام پر سراہتی تھیں تو غلطیوں پر بندے کو لتاڑ بھی دیتی تھیں۔ میں نے ابھی تک انہیں یہ موقع نہیں دیا تھا کہ لیکن شاید اب یہ موقع ان کے ہاتھ آیا تھا۔ میں جل تو جلال تو کا ورد کرتی اُن کے آفس کی طرف جانے لگی۔ لیکن جب میں بھاری پردہ اٹھا کر اُن کے آفس میں گھسی تو اُن کو بڑے اچھے موڈ میں پایا......

آؤ ...... مینا...... وہاں دروازے میں کیوں کھڑی ہو۔

''وہ دراصل میم آج میں پھر لیٹ ہو گئی...... سوری میم...... وہ دراصل میری والدہ بیمار رہنے لگی ہیں تو......'' اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے میں رُک رُک کر بولی۔

ارے...... تو تم سے وضاحت کس نے مانگی ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم لیٹ آ رہی ہو۔'' میں ناسمجھی سے کچھ بولے بنا ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ارے نہیں مینا...... بات یہ نہیں...... بات تو دوسری ہے۔

بالکل انوکھی اور نئی بات۔''

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ دبے دبے جوش سے تمتما رہا تھا...... پرنسپل صاحبہ ہمیشہ ہم تمام ٹیچرز سے ایک فاصلے پر رہ کر بات کرتی تھیں...... میں نے انہیں اتنا فرینکلی بات کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور پھر ان کا انداز...... مجھے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔

''تم بیٹھو مینا...... وہ اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس بات کا سرا کہاں سے شروع کروں...... میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

یا اللہ خیر! اب تو میں سچ مچ گھبرا گئی۔ اب ایسی بھی کیا بات تھی کہ میڈم کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ کیا میرے متعلق کسی نے انہیں کچھ غلط بتایا ہے۔ مجھے قسم قسم کے وہم گھیرنے لگے۔ لیکن جب میڈم نے مجھے وہ بات بتائی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میرے تو حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ اتنی بڑی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی اور نہ ہی مجھے ان کی کہی بات کا یقین آ رہا تھا...... میڈم مجھے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بتا رہی تھیں۔

''رات کو مجھے اچانک جہانگیر خان کا فون آیا...... وہ مجھ سے تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے۔''

''مم...... میرے متعلق؟'' میں ہکلا کر بولی۔
''ہاں وہ تمہارے گھر کے بارے میں پوچھ رہے تھے...... وہ تمہارے گھر آ کر تمہیں پرپوز کرنا چاہتے ہیں۔''
''میڈم کی بات پر میں بری طرح حواس باختہ ہوگئی۔ کتنی دیر تک تو مجھ سے بولا ہی نہیں گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو بولنے پر آمادہ کیا اور رُک رُک کر...... پریشان ہو کر کہنے لگی۔
''میم...... آپ نے بتایا نہیں کہ میں مڈل کلاس بھی نہیں لوئر کلاس ہوں...... اور میرے اتنے مسئلے مسائل ہیں...... اور پھر میں شکل وصورت میں بھی ان کے پاسنگ نہیں...... غرض ہر لحاظ سے یہ ایک بے جوڑ رشتہ ہے۔ آپ کو انہیں سمجھانا چاہیے تھا نا میم۔''
''سمجھایا بھئی...... اچھی طرح سمجھایا...... میں نے تمہارے بارے میں ساری حقیقت انہیں کھل کر بتا دی...... لیکن جو سچ تھا وہ بھی بتا دیا کہ تم بے حد ایماندار...... سچی اور اسٹرانگ لڑکی ہو۔ والد کی وفات کے بعد جیسے تم نے سارے گھر کو سنبھالا...... بیمار والدہ کی خدمت کی اور ساتھ جاب کی ساری ذمہ داریاں نبھائیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور شکل وصورت کے بارے میں بھی کیا تبصرہ کرتی مینا...... اس لیے کہ وہ تمہیں دیکھ کر پسند کر چکے ہیں۔ اور تم اپنے بارے میں جانے کیوں احساس کمتری میں مبتلا ہو...... جب کہ تم جیسی نمکین حسن رکھنے والی لڑکی تو پورے کالج میں بھی کوئی اور نہیں...... ہر بندہ تمہیں ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی خواہش ضرور کرتا ہے۔''
پرنسپل صاحبہ بہت جوش وخروش سے بات کر رہی تھیں...... وہ فطرتاً اچھی عورت تھی اور مجھے تو بہت پسند کرتی تھی...... لیکن میں عجیب شش وپنج میں تھی...... جہانگیر خان جیسے مرد کا ساتھ تو یقیناً ہر عورت کا خواب ہوتا ہے لیکن میں خود کیا تھی۔ بالکل اسی طرح اپنے بارے میں سوچتے ہوئے میری سوچوں کو بریک لگ گئی...... اتنے بڑے گھرانے میں فٹ ہوسکوں گی۔ پرنسپل صاحبہ بڑے غور سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھیں۔ مجھے الجھا الجھا اور خاموش دیکھ کر بولیں۔
''مینا...... قسمت بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی دیکھو...... اپنے کان بند مت کرو...... اور پہلی دستک پر اپنے دل کا دروازہ اس انتہائی نائس بندے کے لیے کھول دو...... ورنہ پچھتاؤ گی اور بری طرح پچھتاؤ گی۔ اور سنو۔'' جب میں ان کے آفس سے نکلنے لگی تو انہوں نے مجھے پکارتے ہوئے کہا۔
''اس بارے میں ابھی کسی سے کچھ مت کہنا...... تم بھی اپنی زبان بند رکھو میں بھی اپنی زبان بند رکھوں گی کیوں کہ دوست دشمن کا پتا نہیں چلتا...... معلوم ہی نہیں ہوتا۔''
احسانمندی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میڈم اس وقت مجھے اپنی ایک مخلص بڑی بہن جیسی لگ رہی تھیں۔ باہر نکلتے وقت میں نے جھک کر کہا۔
''میم کیا میں اس وقت گھر جا سکتی ہوں۔ وہ میری ذہنی حالت کچھ اپ سیٹ سی ہے...... تو......'
''آف کورس۔'' میڈم جلدی سے بولیں میں خود تمہیں کہنے والی تھی کہ تم گھر چلی جاؤ...... لیکن سنو وہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں میں چھپاتے ہوئے بولیں۔
شام کو اچھے سے تیار رہنا...... مہمانوں کو بہت اچھے طریقے سے ویلکم کہنا...... اب جاؤ...... بیسٹ آف لک! میں کھ شرما سی گئی...... پھر انہیں سلام کرتے ہوئے میں اُن کے آفس سے نکل آئی۔
اماں کو جب میں نے تفصیل بتائی تو پہلے انہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب یقین آیا تو ان کی شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی...... ان کی ساری بیماریاں جیسے پھر کر کے اڑ گئیں۔ وہ جلدی سے کچن میں آ گئیں۔ اور بھائی کو چیزوں کی ایک لمبی سی لسٹ پکڑا دی...... مجھے تو اماں پر حیرت ہو رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا وہ کبھی بیمار تھیں۔ وہ تو سارے کام ایسے پھرتی سے کر رہی تھیں۔ جیسے ان کے ہاتھوں میں جادو کی چھڑی آ گئی ہو۔ مجھے تو وہ کچھ کرنے نہیں دے رہی تھی۔

''تم کمرہ صاف کرو اور پھر اپنے کپڑے استری کر لو۔ نہا دھو لو تیار ہو جاؤ...... بس آج تمہارا یہی کام ہے۔

میں نے میرون رنگ کا سوٹ پہن لیا۔ جس پر ہلکی سی کڑھائی کی گئی تھی...... میں نے اماں کے لاکھ کہنے کے باوجود ہلکا سا میک اپ کیا جو نہ ہونے کے برابر تھا۔ وقت مقررہ پر وہ لوگ آ گئے۔ ایک عام سی کار میں جہانگیر کے ساتھ ان کی بڑی بہن تھیں...... بھرے بھرے جسم کی ایک سوبر سی خاتون جنہوں نے ایک بڑی شال سے خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں دھک دھک کرتا دل لیے کچن میں تھی۔ جب کہ ماں نے انہیں ہاتھوں میں لیا اور بڑی عزت سے انہیں کمرے میں بٹھا دیا...... قدرے شرمندگی سے اماں انہیں کہہ رہی تھیں کہ اُن کے چھوٹے سے گھر میں اُن کے شایانِ شان ایسی جگہ نہیں جہاں ان کو بٹھایا جا سکے۔ مجھے کچن میں ان کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جواب میں وہ خاتون بڑی نرمی سے کہہ رہی تھیں۔

''خالہ جان اگر بندہ کچھ خریدنے دکان میں جاتا ہے تو دکان پسند نہیں کرتا...... وہ چیز خرید کر آتا ہے اور ہم خدانخواستہ کوئی چیز خریدنے نہیں آئے، بلکہ بڑی محبت سے اور عزت سے آپ کی بیٹی کو اپنانے آئے ہیں۔''

اماں پر جوش انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''میری بیٹی میں بہت گن ہیں...... اسے اپنا کر آپ کو کبھی ملال نہیں ہوگا...... وہ آپ کی تمام امیدوں پر پورا اُترے گی۔''

اس خاتون کی بے قرار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

اللہ...... خالہ جان...... بلایئے نا اُسے...... میں تو اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔

اماں نے کچن کی طرف منہ کر کے مجھے آواز دی۔

بینا پہلے آ کر مہمانوں سے مل لو...... چائے بعد میں لے آنا۔ میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں...... دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے لگ رہا تھا کہ دھڑک دھڑک کے بے حال نہ ہو جائے لیکن جائے بنا بھی چارہ نہ تھا۔ دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھتے ہوئے میں کمرے میں چلی آئی۔ بالکل سامنے جہانگیر خان اپنی چمکتی آنکھوں میں شوق کی دنیا بسائے مجھے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج بھی پٹھانوں جیسی شلوار قمیض اور ساتھ میچنگ واسکٹ پہنی تھی...... اور سادہ سے ڈریس میں وہ بلا کا جاذب نظر لگ رہا تھا...... ان کی بہن لپک کر اٹھیں اور مجھے گلے لگا کر میرے کئی بوسے لیے پھر انہوں نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

ماشاءاللہ...... ماشاءاللہ...... مجھے توقع تھی جہانگیر کی پسند خاص ہی ہوگی۔ شرم نے میرے ہونٹوں پر قفل لگا رکھا تھا۔ اور میں خود میں بات کرنے کی بالکل بھی ہمت نہیں کر پا رہی تھی وہ خاتون ہی مجھ سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولیں۔

میں جہانگیر کی بڑی بہن ہوں...... یہ مجھے آپا

کہتا ہے تم بھی آپا کہنا۔ میں دوبئی میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ یہ تو میں خاص اس کا رشتہ کرانے اس کی درخواست پر آئی ہوں...... اس سے پہلے میں کئی بار اس مقصد کے لیے آئی کہ اس کا گھر بسا سکوں لیکن اسے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی تھی۔ یہ کہتا تھا جب بھی کوئی لڑکی میرے دل کو بھا گئی تو میں فوراً آپ سے کہہ دوں گا۔

مارے شرم کے میرا سر گھٹنوں کو چھونے لگا تھا...... میں اچھی خاصی میچور لڑکی تھی لیکن آج تو سمجھو سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بن گئی تھی۔ شرم کے مارے نظریں نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

''چلو مینا اب جا کر چائے لے آؤ۔'' شاید اماں میری حالت سمجھ گئیں تھیں۔ سو انہوں نے مجھے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ چائے کے دوران اماں اور اُن کے بیچ سارے معاملات طے پا گئے چائے۔ انہوں نے بڑے اچھے ماحول میں پی...... اور خوشی خوشی رخصت ہوئے۔

میری شادی بہت جلدی اور بے حد سادگی سے ہوئی تھی۔ میں میری بہنیں اپنی آل اولاد کے ساتھ آئی تھیں اور میں نے بھی اپنی کالج کی کولیگز کو بلایا تھا اور پرنسپل صاحبہ بھی آئی تھیں میری قسمت کے اس دن بدلتے موڑ پر سب حیران لیکن بہت خوش تھے۔ جہانگیر خان کے ساتھ اس کی بہن بہنوئی اور ان کے بچے اور قریبی دوست آئے تھے۔ اماں کو جہانگیر نے بڑی سختی سے جہیز وغیرہ کے لیے منع کیا تھا۔ لیکن اماں نے کھانے کا بڑا زبردست انتظام کیا تھا...... میں جیسے خواب میں چلتے ہوئے جہانگیر کے سنگ رخصت ہوگئی۔ مجھے تو خود اس بدلاؤ کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

جہانگیر کی کوٹھی کو کوٹھی نہیں کہا جا سکتا تھا...... وہ تو بہت بڑا محل تھا...... قدم قدم پر ملازموں کی فوج تھی...... ایک ایک کام کے لیے کئی نوکر تھے...... لمبے چوڑے پورچ میں قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں اور جس بیڈ روم میں مجھے لے جایا گیا۔ وہاں تو مجھ پر سچ مچ سحر طاری ہونے لگا...... جہازی سائز کا بہت خوبصورت ڈبل بیڈ...... ایسے قالین جن پر پیر دھنس جاتے تھے اور اوپر سے کمرے کی آرائش و زیبائش...... مجھے خدا نے تو اتنا نوازا ہے...... میرے صبر کا خدا نے اتنا زبردست انعام دیا ہے۔ مارے شکر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میرا دل چاہ رہا تھا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے رب کے آگے سجدے میں گر جاؤں اور آنسوؤں کے دریا بہا دوں لیکن فی الحال کمرہ جہانگیر خان کی رشتہ دار خواتین سے بھرا ہوا تھا اور ایسا ممکن نہ تھا۔ میں اپنے خیالوں میں اماں کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔

''اماں تم خواہ مخواہ میرے لیے فکر مند ہو رہی تھی، دیکھو تو...... خدا نے میرے لیے کتنا بڑا انعام رکھا تھا۔ اس لیے تو اکبر سے میری شادی نہیں ہو سکی تھی۔ پھر میں دل ہی دل میں خدا کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی، اللہ تو نے بہت نوازا ہے...... بس اب ایک احسان کر دینا کہ مجھے ایک اچھے انسان کا ساتھ دے دینا۔ جہانگیر خان کو میرے لیے ایک بہترین شوہر ثابت کر دینا۔ جب مجھے تنہائی نصیب ہوئی تو میں اللہ کے حضور سجدے میں گر گئی اور ابھی میں شکرانے کے نفل پڑھ کر فارغ ہوئی تھی کہ جہانگیر خان کمرے میں داخل ہوئے صد شکر کہ میں فارغ ہو کر بیڈ پر دلہن کے انداز میں بیٹھی تھی...... انہوں نے کھانس کر اپنے آنے کا عندیہ دیا۔ پھر میرے قریب بیٹھ کر دھیرے سے ایک خوبصورت انگوٹھی میری انگلی میں ڈالتے ہوئے بولے۔

مینا...... تمہیں منہ دکھائی کا تحفہ دینا ضروری تھا ورنہ جب میں اس مقصد کے لیے بازار گیا تو مجھے

تمہارے شایان شان کچھ نظر نہ آ سکا۔

میرا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اندر ہی اندر دل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

تو چپ کر میں اپنے مجازی خدا کی بات تو سُن سکوں۔ وہ میرا گھونگھٹ اٹھا کر بڑے شوق اور وارفتگی سے دیکھے جا رہے تھے۔ پھر وہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں میرے دونوں ہاتھ تھام کر دباتے ہوئے بولے۔

مینا...... تم یقین جانو...... میں لاکھوں لڑکیوں سے ملا اندرون ملک بیرون ملک لیکن یقین کرو کسی نے مجھے متاثر نہیں کیا...... لیکن تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میری تلاش کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ مجھے تم جیسی گھریلو لڑکی کی تلاش تھی۔ جو ذمہ دارانہ روش رکھتی ہو، گڈ لکنگ ہو، جو بیوی بنے تو سارا گھر اس سے آراستہ ہو جائے۔ اس لیے تمہیں دیکھ کر میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ بیوی بنوگی تو تم بنوگی۔ ورنہ کوئی اور نہیں بنے گی۔

وہ اپنے جذبوں کی کہانی سنا رہے تھے۔ اور میں ہواؤں میں اُڑ رہی تھی...... دل کی دھڑکنیں کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھیں اور رات کیسے گزری پتا ہی نہیں چلا۔ جہانگیر خان کیسے انسان ہیں اس کا علم تو مجھے شادی کی پہلی رات ہو گیا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی ڈھیر ساری خوبیاں مجھ پر آشکار ہوتی جا رہی تھیں۔ دن عید کیسے ہوتی ہے اور شب رات کیونکر ہوتی ہے اس کا علم مجھے اب ہوا تھا۔ کیوں کہ میرا ہر دن عید اور شب برات تھی...... یہ مقولہ صرف محاورے تک محدود نہیں رہا تھا۔ جہانگیر خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے محل کے ساتھ جو چھوٹا سا بنگلا تھا۔ ان کا...... اور جو خالی پڑا تھا...... اُسے صاف ستھرا کر کے اس میں فرنیچر وغیرہ ڈلوایا اور اماں کو یہاں شفٹ کر دیا۔ جب جہانگیر نے مجھ سے یہ بات کی تھی تو میں نے خاص مخالفت کی تھی۔ اگر چہ مجھے اماں کی بہت زیادہ فکر رہنے لگی تھی لیکن میری غیرت کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اماں نے اپنی ساری زندگی خودداری سے گزاری ہے اور اب وہ بیٹی کی دست نگر بن کر رہیں گی اور اماں نے تو صفا چٹ منع کر دیا وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

ابھی اتنا بھی برا وقت نہیں آیا مینا کہ میں بیٹی داماد کے زیر سایہ زندگی گزاروں۔

میں تو خود ہی ایسا نہیں چاہتی تھی۔ سو خاموش ہو گئی۔ لیکن اس دن جب اُن سے فون پر روٹین کے مطابق باتیں کر رہی تھی تو اُن کی ہائے وائے نے مجھے چونکا دیا۔

کیا ہوا اماں خیریت تو ہے ناں؟ میں تشویش سے بولی۔

ہاں...... بس آج باتھ روم میں پاؤں پھسل گیا تھا تو اس کی وجہ سے سارا وجود درد کر رہا ہے۔

میری تو جان نکل گئی...... میں اور جہانگیر اسی وقت اماں کو دیکھنے چلے گئے اس بار جہانگیر نے انہیں سنجیدگی سے کہا۔ "اماں...... میں آپ کو اپنے گھر نہیں لے جا رہا۔ الگ گھر میں رہیں گی آپ، آپ کا کھانا پینا الگ ہوگا...... اور اگر آپ میرے گھر میں مفت رہنا نہیں چاہتیں تو میں آپ کا یہ گھر کرایہ پر دے کر اس کا کرایہ وصول کروں گا۔ لیکن آپ ہمارے قریب رہیں گی۔ مینا ہر زور آپ سے مل سکے۔ اور اماں وہ محبت سے اماں کا جھریوں بھرا ہاتھ تھام کر بولے۔

مینا آپ کی بیٹی ہے تو کیا آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی اپنی ماں کے عہدے پر فائز کر دیا تھا میری ماں زندہ نہیں میں آپ ہی کو ماں سمجھنے لگا ہوں لیکن لگتا ہے آپ مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھتیں اس لیے تو اتنی غیرت برت رہی ہیں۔

''نن ...... نن ...... نہیں بیٹا اماں سٹ پٹا کر بولیں تو میرا بیٹا ہے داماد کیا بیٹوں سے کم ہوتا ہے اور پھر تم جیسا داماد تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔''

''بس تو فیصلہ ہو گیا...... مینا...... اماں کا سامان باندھ دو ہم ابھی شفٹ کرائیں گے۔

اور اماں کے ناں ناں کرنے کو جہانگیر نے کوئی اہمیت نہیں دی اور فون کر کے نوکروں کو فوراً پہنچنے کو کہا...... شام تک اماں ہمارے ساتھ والے گھر میں شفٹ ہو گئیں تھیں۔

گزرتے وقت نے ثابت کر دیا کہ جہانگیر خان کا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا۔ مجھے اماں کی اتنی فکر تھی کہ میری خوشیاں ماند ہو گئیں تھیں لیکن جو وہ قریب آئیں تو ہر روز میں وقت بے وقت جا کر ان سے مل لیتی۔ اماں بھی ہفتے میں ایک دو بار مجھے دیکھنے آ جاتیں اور میرے ٹھاٹ بھاٹ دیکھ کر خوشی سے واپس چلی جاتیں۔ جہانگیر نے اماں کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازمہ رکھی تھی۔ گیٹ پر باہر چوکیدار ہوتا تھا جو باہر ڈیوٹی کرتا تھا۔ اماں حسب معمول کچن کا کام خود کرتیں جب کہ باقی سارے کام کی ذمہ داری ملازمہ کی تھی۔ بھائیوں کو اسکول جانے کے لیے جہانگیر نے وین لگوا دی تھی۔ وہ اُن کی پڑھائی کے بارے میں اُن سے پوچھ گچھ کرتا اور ایک بڑے بھائی کی طرح روک ٹوک کرتا۔ غرض میری زندگی کہ تمام مسائل انہوں نے ختم کر دیے تھے۔ میں ان کے احسانوں کا بوجھ تو مر کر بھی نہیں اتار سکتی تھی۔ لیکن اپنے فرائض سے میں نے کبھی بھی کوتاہی نہیں کی...... میں نے ان کا کوئی کام نوکروں سے نہیں کروایا...... ان کے کپڑے استری کرنا...... ہر روز ان کے لیے لباس منتخب کرنا ان کے لیے اُن کی پسندیدہ ڈش پکانا...... یہ سب میں کرتی...... وہ لاکھ ناراض ہوتے وہ بار بار کہتے یہ سب نوکروں کے کام ہیں۔ تم میرے دل کی ملکہ ہو اور اس گھر کی بھی...... بس ملکہ بن کر رہو...... نوکروں پر حکم چلایا کرو...... شاپنگ کیا کرو...... گھوما پھرا کرو...... مجھے اچھا نہیں لگتا جب تم میرے پاؤں سے چپل اتارتی ہو لیکن مجھے اچھا لگتا تھا اُن کا ہر کام کر کے دلی تسکین ملتی ہے۔ خدا نے جہانگیر خان کی صورت میں مجھے انمول تحفہ عنایت کیا تھا۔

کوئی چیریٹی شو تھا جہاں جہانگیر خان کو مہمان خصوصی کے طور پر انوائیٹ کیا گیا تھا۔ جہانگیر خان مجھے ساتھ لے جانے پر بضد تھے مجھے جانے سے انکار تو نہ تھا لیکن ان دنوں میری طبیعت کچھ خراب چل رہی تھی۔ اللہ پاک کی ذات نے میری خوشیوں کو مکمل کرنے کا سامان کر دیا تھا۔ میرے پیروں کے نیچے جنت سجنے والی تھی۔ میں ماں بننے کے پراسس سے گزر رہی تھی۔ جہانگیر خان میرا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ کسی قیمتی کھلونے کی طرح وہ میرا دھیان رکھتے۔ اب بھی میں اگر اپنی طبیعت کی خرابی کا بتاتی تو وہ مجھے جانے پر مجبور نہ کرتے۔ لیکن ان کا جوش و خروش دیکھ کر میں نے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی جب سے ہماری شادی ہوئی تھی۔ وہ بہت کم ہی کہیں اکیلے جاتے تھے۔ ہر جگہ مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود میں اچھی طرح تیار ہوئی...... وہ مجھے اس طرح تیار دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مجھے ستائشی نظروں سے سرتاپیر دیکھتے ہوئے بولے۔

واہ بیگم واہ......! تم تو آج قیامت ڈھا رہی ہو۔ پیاری تو تم پہلے سے ہی تھی لیکن آج تو تم پر نظر نہیں ٹھہر رہی ہے۔ کہیں تمہاری اس خوبصورتی میں ہمارے صاحبزادے یا صاحبزادی کا ہاتھ تو نہیں۔

آخر میں اُن کا لہجہ شرارتی ہو گیا...... میں بلش کر رہ گئی۔ حیاء سے میری نظریں جھک گئیں۔ وہ محبت

سے میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے۔
آپ کا تو مجھے علم نہیں لیکن ہمارے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ عورت جب ماں بنتی ہے تو اس پر دوہرا روپ آتا ہے۔ میں نے جلدی سے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
آپ دیر کر رہے ہیں جہانگیر...... وہاں آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا۔
اچھا...... چلو...... وہ میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے ہنستے ہوئے بولے۔
پورچ میں کھڑی پجیرو میں ڈرائیور الرٹ بیٹھا تھا...... ہمیں دیکھتے ہی وہ لپک کر اترا اور ہمارے لیے گاڑی کا دروازہ کھول کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ اور جب تک ہم نہیں بیٹھے وہ نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو وہ پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔
فنکشن خاصے بڑے پیمانے پر تھا...... یہ ایک گرینڈ فنکشن تھا۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ہمارے لیے جو خاص سیٹیں مخصوص تھیں ۔اُن پر ہمیں عزت سے بٹھا دیا گیا۔ جانے کیوں مجھے اپنے کالج کا وہ فنکشن یاد آ گیا۔ جس میں جہانگیر خان مہمان خصوصی تھے اور میں اُن کی خدمت پر مامور ایک عام سی ٹیچر...... اس وقت میرے ذہن میں بھی نہ تھا۔ مجھے ایک دن جہانگیر خان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ میں اُن کی نصف بہتر بنوں گی۔ اور لوگ مجھے بھی اتنی ہی عزت دیں گے۔ میں ایک ذرہ تھی جسے میرے رب نے آفتاب بنا دیا تھا۔
فنکشن میں بے انتہاء لوگ تھے۔ ہر طبقہ فکر کے لوگ تھے مرد حضرات اور خواتین کی بھی بڑی تعداد تھی۔ کندھے سے کندھا چھل رہا تھا۔ اپنے مقررہ وقت سے کچھ دیر بعد فنکشن شروع ہوا۔ یہ اپاہج بچوں کے لیے فنکشن تھا۔ پہلے اس ادارے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی۔ بچوں کے حوالے سے بنائی گئی ان کی تصاویر دکھائی گئیں۔ غرض انہوں نے جو بھی کام کیے تھے۔ ان بچوں کو اسٹیج پر بلا کر اُن کا تعارف کروایا گیا۔ اور آخر میں اُن کو انعام دینے کے لیے جہانگیر خان کو بلایا گیا۔
جہانگیر نے ایک پُر اثر تقریر کی، جس میں معاشرے کے ہر فرد پر زور دیا کہ وہ ان خاص بچوں کے لیے جو بھی کر سکتا ہے وہ ضرور کرے...... کیونکہ ان کا ہم پر اتنا حق ہے جتنا ہم پر اپنے بچوں کا حق ہو سکتا ہے۔ پھر انہوں نے ان خاص بچوں کے لیے ایک خطیر رقم دینے کا اعلان کیا۔ عشائیہ میں وہ میرے ساتھ کھڑے تھے۔ بعد میں اُن کو اُن کے کسی دوست نے آواز دی تو وہ اس کی طرف چلے گئے۔
میں پلیٹ ہاتھ میں لیے وہاں کی نگران عملے کے ساتھ کھڑی تھی جو بار بار مجھے کچھ لینے پر زور دے رہی تھیں کہ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے مجھے زور سے بھینچا میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی...... میں نے گھبرا کر اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور اسے دیکھ کر تو میں دم بخود رہ گئی۔ وہ علیزہ تھی علیزہ...... تم؟ مسرت سے میری آواز رندھ گئی...... ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے ملیں تو جدا ہونا یاد نہ رہا۔ ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم بھری محفل میں ملے ہیں۔ ہم دونوں بے قراری سے ایک دوسرے سے احوال پوچھنے لگیں۔
”بے وفا دوبئی سے آئی ہو اور مجھے ملنے تک نہیں آئی۔ شکوہ میرے لبوں پر مچل گیا تو وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔
ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں دوبئی سے آئے ہوئے ملنے کو بہت دل کر رہا تھا۔ اس لیے کالج چلی آئی...... وہاں تمہاری شادی کے بارے میں معلوم ہوا

کہ بہت بڑے آدمی سے تمہاری شادی ہوئی ہے۔ خوشی تو بہت ہوئی کہ تم اسی قابل تھی کہ جہانگیر خان جیسا شاندار مرد تمہارا نصیب بنتا ہے لیکن تمہارے سسرال آنے کی ہمت اپنے اندر نہ لاسکی کیونکہ۔''

وہ چپ ہوگئی اور پھر بولی لیکن تم بہت یاد آ رہی تھی...... اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس فنکشن کے مہمان خصوصی جہانگیر خان ہیں۔ تو اس امید پر چلی آئی کہ شاید تم بھی آ جاؤ...... اور دیکھو...... میرے جذبے سچے تھے اس لیے تم سے ملاقات ہوگئی۔

علیزہ پہلے سے کمزور لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ روپ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اس کی ہنسی کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جانے کیوں وہ مجھے بجھی بجھی اور اداس لگی کافی دیر سے میں اپنے چہرے پر کسی کی آنکھیں محسوس کر رہی تھی۔ اور ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر میں نے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ وہ اکبر تھا۔

علیزہ کا شوہر...... وہ بڑی حسرت سے ایک کونے میں کھڑا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک لمحے میں، میں نے سمجھ لیا وہ خود کو لعنت ملامت کر رہا ہے کہ اس نے مجھے ریجیکٹ کیوں کیا تھا۔ خیر ان باتوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں دل کی اتنی صاف تھی کہ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسے یہ احساس ہو کہ مجھے کھو کر اس نے بُرا کیا۔ کیوں کہ علیزہ اس کی بیوی تھی اور اسے علیزہ کے لیے اچھا سوچنا چاہیے تھا۔ نہ کہ کسی اور کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنا...... مجھے ذرا اچھا نہیں لگا میں اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر علیزہ سے باتیں کرنے لگی۔ علیزہ مجھے چپکے چپکے بتا رہی تھی۔

مینا...... اس شخص سے شادی کر کے میں نے سکھ کا ایک دن بھی نہیں گزارا...... یہ شخص حد سے زیادہ شکی ہے اتنا کہ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ آفس سے گھر آتا ہے تو کمروں میں گھوم پھر کر جائزہ لیتا ہے کہ میری غیر موجودگی میں کوئی غیر مرد تو نہیں آیا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں میں کس مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ اگر مجھے اپنے والدین کا احساس نہ ہوتا میں اس سے طلاق لینے میں لمحے کی بھی دیر نہ کرتی...... لیکن کیا کروں...... اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں اس لیے ہمیشہ سب انہیں اچھا ہے کہ رپورٹ دیتی ہوں۔

علیزہ کی باتیں مجھے ہولا رہی تھیں...... علیزہ میری بہنوں سے بڑھ کر دوست تھی میں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا تھا۔ ہمیشہ اس کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے غم سے میرا دل بند ہو جائے گا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھپک تھپک کر میں اُسے تسلیاں دے رہی تھی۔ اس دوران جہانگیر خان مجھے ڈھونڈتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ میں نے علیزہ کا تعارف اس سے کرایا تو جہانگیر خان مسکرا کر بولے۔

اتنی پرانی دوست ہے تم یہاں کھڑے باتیں کر رہی ہو بھئی گھر پرائیویٹ کرواسے۔ بلکہ یوں کرو ان کا ایڈریس لے لو کل ڈرائیور کو بھیج کر انہیں ان کے شوہر سمیت بلوا لینا۔''

میں نے دیکھا علیزہ کی آنکھوں میں خوف سا اتر آیا۔ وہ میرا ہاتھ دبا کر مجھے خدا حافظ کہہ کر تیزی سے چلی گئی۔ جہانگیر خان نے مجھے جانے کا عندیہ دے دیا۔ میں ان کے ساتھ چلنے لگی۔ ہمارے ساتھ ادارے کے بہت سارے افراد تھے۔ جو ہمیں گاڑی تک چھوڑنے آ رہے تھے۔ میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ علیزہ اکبر کے ہمراہ جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا، جیسے میرا دل بھی نوچ کر اپنے ساتھ لے جا رہی ہو!

☆☆......☆☆

حماد منزل پر موت سا سوگ طاری تھا۔ کیوں کہ شادی کا دھوم دھڑکا اور رونق فریحہ کے انکار کے باعث ایک دم ماند پڑ گیا تھا۔ حماد کا ہر مکیں اک گہرے شاک کی کیفیت میں تھا۔ امی نے سختی نرمی سے سب کچھ بھلا کر فریحہ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنے......

محبت کی ایک چھوٹی سی کہانی، افسانے کی صورت

وہ درد وفا، وہ وفا، وہ محبت تمام شُد
لے دل میں تیرے قرب کی حسرت تمام شُد
یہ بعد میں کھلے گا کس کس کا خون ہوا؟
ہر ایک بیاں ختم، عدالت تمام شُد
تو اب دشمنی کے قابل بھی نہیں رہا۔
اٹھتی تھی جو کبھی وہ عدالت تمام شُد
جائز تھی یا نہیں، تیرے حق میں تھی مگر
کرتا تھا جو دل بھی، وہ وکالت تمام شُد
وہ روز روز مرنے کا قصہ ہوا تمام
وہ روز دل کو چیرتی وحشت تمام شُد
محسن میں کنج زیست میں چپ چاپ ہوں پڑا
مجنوں سے وہ خصلت و حالت تمام شُد

ٹیکسٹ ٹائپ کر کے مطلوبہ نمبر پر send کر دیا اور خود بیڈ کے کراؤن سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔ مگر کیوں کہ اس کا دماغ جاگ رہا تھا تو سوچ میں موجود خیالات مجسم ہو کر سرگرم ہو گئے اور اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔ دل و دماغ کی چیخ پکار سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ نے اس کے پورے وجود کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دم گھٹنے لگا ہو۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں دوبارہ کھول لیں۔ کمرے میں موجود ٹیوب لائٹس روشن تھیں مگر اسے لگ رہا تھا جیسے چہار سو گھپ اندھیرا ہے۔ جس میں کچھ بجھائی نہیں دیتا۔ اس نے خشک ہوتے حلق کو سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے گلاس سے تر کیا اور اٹھ کر کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے تاکہ بڑھتی ہوئی گھٹن میں کچھ کمی واقع ہو۔ مگر ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا بس صرف کمرے کے در و دیوار پر ہی چل سکا۔ اس کے اندر کا حبس تھا کہ بس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ضبط کے آگے بندھے بند توڑ ڈالے اور اشکوں کی باڑھ طوفان باد و باراں کا روپ دھارے روانی سے بہنے لگی۔

اس کے اندر کا سناٹا، آہوں، سسکیوں اور دبی دبی چیخوں کے شور سے آباد ہونے لگا۔

☆......☆......☆

''مجھ سے شادی پر خوش نہیں ہونا!'' حمزہ ایک بار پھر فریحہ کی راہ روکے اس سے سوالیہ تھا۔

اب جبکہ شادی میں گنے چنے دن رہ گئے تھے۔حمزہ کا یہ سوال...... فریحہ کو لگا جیسے اس کے قدموں تلے زمین سرکتی جارہی ہے۔

''کیونکہ تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔'' خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب دے کر اس نے ایک اور دھماکہ کیا۔تو فریحہ کو محسوس ہوا جیسے کہ وہ ابھی بے دم ہو کر گر جائے گی۔ یہ وہ ہی حمزہ تھا۔ جو فریحہ کی صرف ایک جھلک کو ترستا تھا۔اس سے صرف ایک ملاقات کے لیے دیگر کزنز

ہے سوچ لو مگر خدا کے واسطے یہ ڈرامہ بند کرو۔''

حمزہ نے طنز آمیز لہجے میں کہہ کر اس کی راہ چھوڑی تھی اور فریحہ مرے مرے قدموں سے آ کر اپنے بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔

ایک حمزہ پر ہی بس نہیں تھا۔ اپنے اصول و نظریات کے سامنے اسے گھر بھر کی نوجوان پارٹی کی مخالفت کا سامنا رہتا تھا۔

''کیا باجی تم بھی نا...... میں اتنی مشکلوں سے تم دونوں کی ملاقاتیں ارینج کراتی ہوں اور تم ہو کہ مانو بلی بن جاتی ہو۔'' فریحہ کی چھوٹی بہن نے برا سا منہ بنا کر

کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔شادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے اور ان کی ملاقات اور بات چیت پر سخت پابندی تھی۔ مگر آج حمزہ کے اس کڑے رویے کی وجہ فریحہ کا بار بار گریز تھا۔جس کا محرک صرف خاندانی روایات کی پاسداری تھا۔مگر حمزہ کو کون سمجھاتا کہ اگر فریحہ کو اس سے شادی پر اعتراض ہوتا تو یہ رشتہ ہی کیوں طے پاتا۔

''تمہیں اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو منگنی کا ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔'' اب بھی وقت

اسے دیکھا تو وہ اس کی معصوم ادا پر ہنس پڑی تھی۔

''تھینکس مائی ڈیئر سسٹر۔مگر آپ کی ان منصوبہ بندیوں کا علم ہماری والدہ محترمہ کو ہو گیا نا تو بس۔ان کا ایک ہی وار تمام کارروائیوں کو نیست نابود کر دے گا۔ویسے بھی ملیحہ تم اب حمزہ کو ٹال دیا کرو۔ دیکھو نا شادی سے پہلے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ان مردوں کا ویسے بھی کچھ بھروسہ نہیں آج جن ملاقاتوں کے لیے ذوق شوق سے آتے ہیں۔کل ان ہی کو بے حیائی کا

طعنہ بنا لیتے ہیں۔ فریحہ نے بہت سنجیدگی سے ملیحہ کو سمجھایا۔ نہیں باجی کم از کم حمزہ بھائی تو ایسے نہیں ہیں۔ کتنی سویٹ نیچر ہے ان کی۔ سب ہی بہت تعریف کرتے ہیں ان کی۔ لگتا نہیں کہ اتنا عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں۔ پورا خاندان رشک کرتا ہے تمہاری قسمت پر حمزہ بھائی جیسا ہینڈسم، ایجوکیٹڈ، ویل مینرڈ بندہ تمہارا شریک سفر بنے گا۔'' ملیحہ اپنے ہونے والے بہنوئی کا بھرپور دفاع کرتی تھی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو سسٹر۔'' حمزہ ایسے ہی ہمیشہ رہیں تا عمر۔ لیکن چندا بندے کو پرکھنے اور برتنے کے بعد ہی اس کی اصل کا پتا چلتا ہے۔ فریحہ کے دل میں ہم وقت خدشات کھیلتے رہتے اسی لیے حمزہ سے فریحہ کا گریز دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لیکن حمزہ کے آج کے کڑے تیوروں نے فریحہ کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ صحیح تھی یا غلط۔ وہ دل و دماغ کی گواہی کے انتظار میں تھی کیوں کہ اب اس کے با عزت بری ہونے کا معاملہ انہی سے مشروط تھا۔

☆......☆......☆

وہ سب جوائنٹ فیملی سسٹم کی ڈور میں بندھے تھے۔ حمزہ اور فریحہ کی نسبت بچپن میں ہی طے ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں پھوپھی زاد کزن تھے۔ حمزہ اے لیول کے بعد ہائیر اسٹڈیز کے لیے پاکستان سے باہر چلا گیا تھا۔ اب جبکہ فریحہ نے اپنا ایم بی اے مکمل کر لیا تھا تو بھائی کے اصرار پر پھوپھو نے بیٹے کو سر پر سہرا باندھنے کے لیے بلوا لیا تھا۔ گو کہ لڑکی ہونے کے ناطے فریحہ تھوڑی بہت تشویش میں مبتلا تھی کہ جانے اتنے عرصے باہر رہنے کے باعث حمزہ کے عادت و اطوار کیسے ہوں مگر حمزہ کے واپس آنے کے بعد اس کی سوئیٹ نیچر سے وہ کافی حد تک مطمئن تھی۔ گو کہ ابھی بھی کچھ وسوسے اُسے تنگ کر رہے تھے۔ حمزہ نے فریحہ کو تصویروں میں تو دیکھا ہوا تھا مگر روبرو دیکھا تو تصویروں سے بڑھ کر پایا۔ گو کہ اسکائپ کی سہولت کے بعد دونوں کی باقاعدہ سلام دعا بھی رہنے لگی تھی۔ مگر مشین انسان کا نعم البدل تو نہیں۔ ایسے میں وہ فریحہ کی چھوٹی بہن ملیحہ سے چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں کے ارینج مینٹس پر زور دیتا تھا۔ کیوں کہ خاندانی روایات کی پاسداری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دونوں گھرانوں نے شادی سے پہلے ملاقاتوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ حمزہ پھوپھو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تو اپنی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ہونے والے لین دین کے چکر میں اکثر خود ہی فریحہ کے گھر کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ تو امی اور ملیحہ کے بازاروں کے چکر بڑھ گئے۔ جب کہ گرمی کی شدت بڑھ جانے کے باعث روپ کے کملا جانے کے ڈر سے امی نے فریحہ کے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی تو اس نے کچن کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس دن بھی وہ کچن سے کھانا بنا کر گرمی کے اثرات دور کرنے کے لیے سکنجبین کا گلاس سامنے رکھے ٹی وی ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی۔ گھر والے جیولری اور فرنیچر کا آڈر کنفرم کرنے نکلے ہوئے تھے۔ فریحہ کے اکیلے پن کی وجہ سے چھوٹا بھائی واحد گھر میں تو رہ گیا تھا۔ مگر اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر مگن تھا۔ ایسے میں ڈور بیل پر فریحہ نے دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ جب کہ وہ شوخی سے مسکرا دیا تھا۔

☆......☆......☆

حماد منزل پر موت سے سوگ طاری تھا۔ کیوں کہ شادی کا دھوم دھڑکا اور رونق فریحہ کے انکار کے باعث ایک دم ماند پڑ گیا تھا۔ حماد کا ہر مکیں اک گہرے شاک کی کیفیت میں تھا۔ امی نے سختی نرمی سے سب کچھ بھلا کر فریحہ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنے کی پوری کوشش کی مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ رشتوں کی بنیاد

اعتبار پر نہ ہو امی تو محض مجبوریوں کے ستونوں پر کھڑی عمارت جلد ڈھے جاتی ہے۔

حمزہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے جو دیکھا اس پر اعتبار کیا۔ فریحہ کو صفائی کا موقع دیے بغیر، تصدیق کیے بغیر اسے موردِ الزام ٹھہرا دیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے فریحہ کو ایک شاپنگ سینٹر میں ایک ہینڈسم سے آدمی کے ساتھ دیکھا تھا۔

''تو یہ ہے تمہارے گریز کی وجہ۔ میں بے وقوف تمہارے کترانے کو تمہاری شرم سمجھ رہا تھا۔'' حمزہ کے اس کے سر پر جا پہنچا تھا اور سلگتے لہجے میں انتہائی ناگوار انداز میں کہا تو فریحہ کے ساتھ کھڑے شخص نے انتہائی چونک کر اسے دیکھا تھا اور فریحہ جیسے لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کر لیا تھا۔

''پوچھ سکتا ہوں تمہارے دل کی دنیا کسی اور کے دم سے آباد تھی تو مجھ سے شادی سے انکار کیوں نہیں کیا اس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ فریحہ کا دل چاہا کہ دہکتا ہوا انگارہ اس کی زبان پر رکھ دے کہ اس پر کیچڑ اُچھالنے کی آئندہ جرأت نہ ہو مگر اس نے نہایت تحمل سے ضبط کی کڑی منزلیں طے کر کے فقط اتنا ہی کیا۔

''اس سوال کا جواب آپ کو شام پر میرے گھر پر ملے گا۔ وہ بھی سب کے سامنے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے والے شخص کو اشارے سے روک دیا اور پھر دھیمے قدموں سے ان کی معیت میں شاپنگ سینٹر سے نکلتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

وہ اسد صدیقی تھے۔ فریحہ کے سب سے چھوٹے چچا۔ جو کہ اک عرصے سے دیارِ غیر میں مقیم تھے۔ من پسند شادی ان کا جرم تھی۔ جن کی پاداش میں حماد منزل کے مکینوں نے عرصہ پہلے ان سے ناتا توڑ لیا تھا۔ وہ سالوں بعد لوٹے تو خالی ہاتھ تھے۔ بیوی ایک حادثے میں چل بسی اور اولاد نصیب میں نہ تھی۔ یہ اتنے سالوں پرانی بات تھی کہ حماد منزل کی نو

جوان پارٹی یا صرف ان کے نام سے واقف تھی یا پھر پرانی تصویروں کے ذریعے ان سے شناسا تھی۔ فریحہ نے انہیں ایف بی پر ڈھونڈ نکالا تھا۔ مگر ان ہی کے منع کرنے پر اپنے اس کارنامے کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی۔ اور اب فریحہ کی خواہش پر ہی وہ اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ دل میں کہیں دبی دبی خواہش اور موہوم سے امید بھی تھی کہ شاید اس طرح پرانے مراسم بحال ہو سکیں کیوں کہ اب ان سے بھی تنہائی کا دُکھ جھیلا نہیں جا رہا تھا اور وہ اسی سلسلے میں راہیں ہموار کرنے کی جہد و جہد میں تھے کہ قسمت نے یہ کھیل کھیل ڈالا۔

گو کہ اسد صدیقی کے سامنے آ جانے پر تمام اصلیت خود بخود واضح ہو گئی تھی مگر...... فریحہ حمزہ کے اس بدلے ہوئے روپ کو قبول کرنے سے یکسر انکاری ہو گئی تھی۔ حماد منزل کے مکینوں نے اسد صدیقی کو تو کھلے دل سے اپنا لیا تھا کہ خون کے رشتے بھلا کہاں ٹوٹا کرتے ہیں۔ مگر فریحہ نے ایسی چوٹ کھائی تھی کہ وہ سنبھالے سے نہیں سنبھل رہی تھی۔ سب نے سمجھایا، منایا...... حمزہ نے معافی مانگ لی، منتوں پر اتر آیا۔

''میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں فریحہ اس لیے یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پایا۔'' اس نے فریحہ کے آگے ہاتھ جوڑ ڈالے۔ وہ دن بھر اسے منانے کو ایس ایم ایس کرتا۔

''اور آپ کو شاید علم نہیں مسٹر حمزہ کہ محبت نہیں نفرت اندھی ہوتی ہے۔ اور اب مجھے آپ سے محبت ہرگز نہیں رہی اور اس کے ذمہ دار آپ خود ہی ہیں اور مجھے آپ سے سوائے اس کے کچھ نہیں کہنا۔ اس نے نظم ٹائپ کر کے حمزہ کو ایسا ایم کر دی۔ اور موبائل آف کر دیا۔ اُدھر حمزہ بھی شاید فریحہ کی نفرت کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا تھا۔ سو اس نے بھی سم نکال دی۔ کیوں کہ یہی پچھتاوا اس کے جرم کی سزا تھا۔

☆☆......☆☆

اپنے تئیں اس نے کوشش کی تھی کہ چپ چاپ جا کر اسے پکڑ لے وہ جو بھی تھی مگر اس کے قدموں کی آہٹ نے اس کی آمد کا بھید کھول دیا تھا۔ چونک کر تیزی سے گردن موڑنے والی لڑکی کا چہرہ دیکھ کر عبدالعلی کو شاک لگا تھا۔ ''تم......؟'' وہ کسی طرح بھی اپنی حیرت پر قابو نہیں رکھ سکا......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا پندرہواں حصّہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے، جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے......جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیز گار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیز گاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر

اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کرائی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہر ہی نہیں حاکیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے۔ اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں جتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر ہراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں جتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنور لی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں جتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارعنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اُسے اپنی پُرشفقت پناہ میں لے کر اُس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ اُس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اس بارے میں کوئی ذکر تو کجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عبیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں بیٹے کی محبت میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور عبیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

کلیاں گزاراں کیویں راتاں کالیاں
ڈنگدیاں مینوں رُتاں پیار والیاں
تیرے باجوں جی نئی لگدا میں تاں مرگئی تھاں......
آ جا سوہنیا گھر آ جا سوہنیا

اتباع نے دروازہ کھول کر نیم تاریک کمرے میں قدم رکھا تو شازیہ منظور کی دل نشین آواز نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ پہلے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی۔ پھر میوزک بند کیا۔

''قدر! جاگ رہی ہو؟'' اُس کی پوزیشن میں فرق نہ آتے دیکھ کر اسے پکارنا پڑا تھا۔

''میرا خیال ہے جاگتا ہوا انسان ہی میوزک انجوائے کر سکتا ہے۔ بائی داوے تم نے آف کیوں کر دیا؟''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ اور خصوصی خفگی سے ایک ایک بات جتلائی۔ اس کا مزاج اگر نازک تھا تو اس میں اس کا قطعی کوئی قصور نہیں تھا۔ آرائشوں سے مزین جس محل میں وہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ جس قدر ملازمائیں اس کی خدمت میں ہر وقت موجود رہا کرتی تھیں اور جتنے ناز اس کے مل کر عبدل ہادی اور علیزے نے اٹھالیے تھے۔ اتباع کا خیال تھا وہ بگڑی نہیں تھی۔ حالانکہ بگڑ جانا چاہیے تھا۔ ہاں وہ خود پسند بہت تھی۔ نازک اندام بہت تھی۔ تو یہ خود قدر کے خیال میں اس کی اضافی خوبیاں تھیں نا کہ خامیاں......

''اذان کا وقت ہے اس لیے بند کیا۔ تم بھی اٹھ جاؤ۔ اماں نیچے چائے پہ انتظار کر رہی ہیں تمہارا۔''

اتباع آگے بڑھ کر پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھولنے لگی۔ قدر نے اسے جواباً تیکھے چتونوں سے دیکھا۔

''تم بالکل بڈھی روح ہو اتباع! دودو والداؤں کے ساتھ رہ کر تم خود بھی ان ہی کی طرح ہوگئی ہو......سوکول......اینڈ اولڈ''

اس نے ناک چڑھالی تھی۔ انداز میں نخوت تھا۔

ناپسندیدگی تھی۔ اتباع نے تھم کر اس کے تاثرات دیکھے اور آہستگی سے مسکرادی۔

''یہ اس گھر کی برکت کہہ لو...... یہاں جو بھی رہتا ہے۔ اتنا ہی ڈیسنٹ ہو جاتا ہے۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔ بہر حال آنا تو تمھیں بھی یہیں ہے۔''

سنجیدگی سے بات کرتی وہ آخیر میں قدرے شوخ ہوگئی تھی۔ قدرے بھنویں اچکا کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''کہیں تم کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہوگئیں کہ یہ سانگ میں تمہارے بھائی جان کے لیے سن رہی تھی؟'' اس بات کے جواب میں اتباع دھیرے سے ہنس دی تھی۔

''غلط فہمی کا شکار ہوتی تو شک ہوتا تم کسی اور کے لیے سن رہی ہو۔ مجھے یقین ہے تم میرے بھائی جان کے لیے ہی سن رہی تھیں۔'' وہ ہنوز دھیمے سروں میں ہنس رہی تھی۔ قدر کا گلابی چہرہ جانے کس احساس کے تحت سرخ پڑ گیا۔

''یعنی غلط فہمی نہیں تو خوش فہمی کا شکار ضرور ہو۔ محترمہ اتباع عبدالغنی اطلاعاً عرض کردوں کہ میرے نادر خیالات ذرا مختلف ہیں۔ وقت آنے پہ کبھی فرصت میں ضرور فیض یاب کروں گی تمھیں۔ اس وقت تو بس اتنا بتادو تمہارے بھائی جان آخر مصروف کہاں رہتے ہیں۔ جب بھی دیکھو ہمیشہ غائب۔ اب یہی دیکھ لو...... کل سے ہم یہاں آئے ہوئے ہیں۔ محترم کی ایک جھلک نہیں ملی۔ تصویریں تم لوگ بنواتے نہیں ہو اسکائپ پہ آن لائن ہوتے بھی شریعت کی ممنوعیت مانع آجاتی ہے کہ اسلام میں ہر طرح کی مووی پکچر منع ہے۔ مجھے تو لگتا ہے نیلسن منڈیلا کو حسن میں مات دیتے ہوں گے جبھی تو چھپے پھرتے ہیں۔ ڈرتے ہوں گے کہیں میں رد نہ کردوں۔''

بات سخت تھی۔ کسی حد تک تکلیف اور دل آزاری کا باعث بھی...... اتباع کو یکدم چپ لگ گئی۔ مزاج میں۔'' وہ ماں کا عکس تھی۔ ہو بہو عبیر۔ اس کا تحمل، اس کا صبر و برداشت۔ ویسی ہی گھمبیر چپ اور شرمیلی فطرت۔ قدر سے اس موضوع پہ اس سے پہلے ہمیشہ ہلکا پھلکا مذاق چلا تھا اور بس مگر آج اس کے خیال میں قدرے انتہا کردی تھی۔

''میں نیچے چلتی ہوں۔ اماں منتظر ہوں گی میری! تم بھی ذرا جلدی آجانا۔''

اس کی خاموشی نے ہی قدر کو یہ بات جتلائی تھی کہ اسے یہ بات کتنی کھلی ہے۔ اس کے باہر چلے جانے کے بھی بہت دیر بعد تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی تھی۔ ایک عجیب سی تشنگی، کسک اور توہین کا احساس تھا جو اسے چھو چھو کر، رگید رگید کر گزر رہا تھا۔ آج اس احساس میں اور بھی شدت تھی۔ وہ محض پندرہ سال کی تھی جب ایک روز اتفاقاً اس نے پایا...... (علیزے، وہ علیزے کو اماں یا والدہ نہیں کہتی تھی۔ حالانکہ علیزے نے کتنی کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔ وہ بھی عبدالعلی کی طرح اسے اماں کہے۔ مگر وہ مان کر نہ دی۔)

''اماں......!!'' وہ کتنا ہنسی تھی۔

''کس قدر بیک ورڈ ہے یہ ورڈ ماما! اور پھر آپ آئینے میں تو خود کو دیکھیں ذرا۔ ہرگز آپ کو دیکھ کر نہیں لگتا آپ میرے جتنی لڑکی کی ماں بھی ہوسکتی ہیں۔ چلیں ماما تو کھینچ تان کر بنایا جاسکتا ہے مگر اماں...... ہرگز ہرگز نہیں۔''

''اماں لفظ میں کتنی اپنائیت اور مٹھاس ہے۔ مجھے پسند ہے۔ اچھا لگتا ہے بیٹے! پھر عبدالعلی بھی تو لاریب کو اماں کہتا ہے۔''

اور یہیں اسے غصہ آگیا تھا۔

''عبدالعلی...... عبدالعلی...... !ماما! آپ ہر بات میں اُس بندے کا حوالہ مجھے کیوں دیتی رہتی ہیں ہر وقت۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

وہ چیخ پڑی تھی۔ جبکہ علیزے کی رنگت اس قدر تیزی سے زرد پڑتی چلی گئی تھی۔

"کون...... کون اچھا نہیں لگتا...... عبدالعلی؟"

الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے تھے، جیسے خوف اس کی روح سلب کررہا تھا۔ یہ لگا تھا اگر علیزے نے لفظ ہاں کہہ دیا تو اس کا دل ہمیشہ کے لیے دھڑکنا چھوڑ دے گا۔

"ہاں...... نہیں لگتا مجھے وہ اچھا ماما! بیٹی میں ہوں آپ کی نہ کہ وہ آپ کی اولاد ہے۔ مگر آپ محبت اس سے زیادہ کرتی ہیں۔" قدر روہانسی ہورہی تھی۔

علیزے کے حواس ذرا سے بحال ہوئے۔

"ایسے نہیں کہتے ہیں بیٹے! عبدالعلی بھی میری اولاد ہے۔"

"قطعی نہیں۔ وہ صرف آپ کا بھتیجا ہے اینڈ دیٹس آل......"

قدر کی شدت پسندی اور خود پسندی پوری طرح واضح ہورہی تھی۔

"وہ میرا صرف بھتیجا نہیں ہے قدر! وہ میرا داماد بھی ہے۔ ہم نے تمہاری پیدائش کے موقع پر تمہارا نکاح عبدالعلی سے کردیا تھا۔ یاد رکھنا تمہاری شادی صرف عبدالعلی سے ہوگی۔"

اس روز علیزے پہلی مرتبہ قدر سے بلند آواز میں بولی تھی۔ پہلی بار اس کی آواز میں سختی اتری تھی۔ جبکہ قدر گنگ رہ گئی تھی۔ شاکڈ...... اس کی قوتِ گویائی سلب ہوکر رہ گئی۔

"واٹ......؟" وہ چیخی۔

"ایسی آخر کیا افتاد آن پڑی تھی کہ آپ کو یہ نکاح اتنی عجلت میں کرنا پڑا۔" وہ غم وغصے اور طیش سے لرزنے لگی اور کسی بھی پل رونے کے لیے تیار۔

"یہ میری خواہش تھی۔ شدید خواہش۔ قدر وہ اس قابل ہے کہ تمہیں ڈیزرو کرے۔"

وہ علیزے اسے لپٹا کر پیار کرنا چاہتی تھی، سمجھانا چاہتی تھی۔ مگر وہ بپھری ہوئی موج کی مانند مچل کر، بپھر کر اس کے حصار سے نکل گئی۔ انداز بے حد شاکی تھا، خفگی اور دکھ سے بھرپور۔

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے ماما! کہ آپ میرے ساتھ ایسا کرسکتی ہیں۔ اور پاپا جانی نے بھی نہیں بتایا مجھے کبھی۔" آنسو اس کی پلکوں سے پھسل پھسل کر بیچ چہرے پہ بکھرنے لگے۔ علیزے کی جان اس قدر مشکل میں آئی تھی۔

"کیا وہ تمہیں پسند نہیں......؟" علیزے کا رنگ فق ہوا تھا۔

"پسند کا کیا سوال ہے ماما! میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔ ہم جب بھی ماموں کے گھر گئے۔ وہ کبھی گھر پہ نہیں ملا۔ ہمیشہ ہوسٹل میں ہوا کرتا تھا۔ بڑے ہونے پہ بھی میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ اہم مسئلہ یہ نہیں ہے۔ آپ نے ماموں کے گھر کا ماحول دیکھا ہے......؟ کتنا بیک ورڈ ہے۔ اتباع...... اُف اپنی ماؤں سے زیادہ سنجیدہ اور گول ہے۔ وہ لوگ ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس میں انہیں ذرا سا بھی احتمال ہو کہ گناہ ہے اور عبدالعلی کے متعلق تو میں نے ہمیشہ یہی سنا وہ ماموں کی کاربن کاپی ہے۔ آئی ڈونٹ لائک اٹ۔ ماما! مجھے اتنے رُوڈ، اس قدر پابند اور ان رومینٹک بندے سے شادی نہیں کرنی۔ میں تو اپنے گھر کے ماحول سے الرجک تھی۔ مجھے آزاد ماحول اور آزادی پسند ہے۔ آپ مجھے یہاں سے بھی زیادہ پابند اور گھٹے ہوئے ماحول میں بھیجنے پر آمادہ ہیں۔"

جواب اتنا تفصیلی اور اس قدر دل برداشتہ تھا کہ علیزے سے کھڑے رہنا محال ہوگیا تھا۔ اس کا دل اس صدمے کو سہار نہیں پارہا تھا۔ جب ہی اگلے کئی دن وہ بستر سے نہیں اٹھ سکی۔ وہ بس روتی تھی...... عبدالہادی اس صورتِ حال سے اس سے زیادہ اپ سیٹ تھے۔

''میں اس لیے خلاف تھا بچپن کی رشتہ داریوں سے لیزے...... مگر آپ نے تب میری ایک نہ سنی۔''
وہ عاجز اور بے بس لگ رہے تھے۔ سخت مضطرب۔ علیزے کے آنسوؤں میں روانی آنے لگی۔
''ذرا سوچیں عبدالعلی! بھائی کو کیا منہ دکھائیں گے اب ہم۔''
عبدالہادی مضطربانہ ٹہل رہے تھے اور ہاتھ مسلتے تھے۔
''غلطی ہماری تھی۔ ہم نے اپنی بیٹی کو سر پہ بہت چڑھالیا۔''
علیزے دل گیری سے بولی۔ عبدالہادی نے ہونٹ بھینچ کر انھیں دیکھا۔
''وہ ہر صحیح غلط فرمائش کرتی رہی آپ نے پوری کردی۔ عجیب نقطہ تھا آپ کا۔ دین زبردستی مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ اسے قبول کیا جاتا ہے۔ اپنایا جاتا ہے۔ ارے پھر بتائیں دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے پر بچوں کو مارنے کا حکم کیوں ہے حدیث میں۔ مان لیں آپ کی نرمی سے بگڑی ہے۔''علیزے ساری شکایتیں اک ساتھ لے بیٹھی تھی۔
میں نے منع کیا تھا موبائل نہ لے کر دیں۔ مگر آپ نے آئی فون لے کر دیا۔ لیپ ٹاپ اس وقت تھا اس کے پاس جب وہ دس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہی سب اگر آپ نے اسے اپنے دین سے محبت کرنے پہ محنت کی ہوتی تو وہ ایسی ہوتی؟''
''میرا نظریہ اب بھی وہی ہے لیزے! موبائل فون اور لیپ ٹاپ اس کی ضروریات تھیں۔ میں ان سے ہاتھ کیسے کھینچ سکتا تھا۔ میں نے دین کے متعلق قدر کو محبت دی ہے۔ اس پہ اثر کتنا ہوا یہ کچھ کیسے کہوں۔ زبردستی میں محبت نہیں اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ عمر نہیں گزری۔ غلطیاں ہم سے بھی ہوئی تھیں۔ دیکھ لیں پھر اللہ کی عنایات کس قدر ہوئیں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔''

''ہاں...... اِس آس میں بیٹھے رہیے گا۔ ضروری ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہی ٹھوکر کھا کر سنبھلے......؟''
علیزے کا موڈ سخت آف ہوگیا تھا۔ عبدالہادی سرد آہ بھر کے رہ گئے۔
''پھر کیا چاہتی ہیں آپ......؟'' وہ عاجز نظر آرہے تھے۔ یہ سچ ہے مرد جب خواتین کی مرضی اور پسند کو مقدم رکھنے لگ جائیں تو پھر نہ صرف مشکلات کو فیس کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پہ شرمندگی سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔
''قدر میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ آپ اس کا ایڈمیشن پری میڈیکل کالج میں کروادیں۔ یہ ہوسٹل نہیں رہے گی۔ وہاں رہے گی اپنے ماموں کے گھر......''
علیزے کا فیصلہ عبدالہادی کو جذبز کر کے رکھ گیا۔
''اس کا کیا مطلب ہے بیگم صاحبہ! ہماری بیٹی شادی سے پہلے کیوں سسرال میں جا کر قیام پذیر ہو۔ یہ بالکل مناسب نہیں ہے۔'' انھیں شدید اختلاف ہوا تھا۔ علیزے اس قدر چڑنے لگی۔
''اس میں ہرگز بھی کوئی معیوب بات نہیں ہے عبدالہادی! جب اسے ساری زندگی وہاں گزارنی ہے تو یہ عرصہ بھی گزار لے، تاکہ اسے اس گھر میں رہنے کا طریقہ، سلیقہ آجائے۔ نکاح ہوچکا ہے اس کا۔ ویسے بھی وہ گھر اور اس کے مکین غیر نہیں ہیں۔ میرے بھائی کا گھر ہے وہ۔ یعنی ہمارا اپنا۔''
عبدالہادی محض انھیں عاجز اور بے بس نظروں سے دیکھتے رہے۔
''آپ اختلاف نہیں کریں گے عبدالہادی! نہ قدر کی سائیڈ لیں گے، سن لیں آپ...... میں اسے ہر صورت وہاں بھیجنا چاہتی ہوں۔ اور خاص کر عبیر بھابی اور بجو سے کہوں گی۔ اس نالائق کی ذرا بہتر تربیت کردیں۔ تاکہ عبدالعلی کے کچھ تو قابل ہوسکے۔''

اس آخری بات پہ عبدالہادی سرد آہ بھر کے رہ گئے۔

''عبدالعلی سے آپ کا عشق میری تو سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہرگز خیال نہ تھا وہ آپ کو اپنی بیٹی سے بھی عزیز ہو جائے گا۔''

علیزے اس بات پر ناراضی کے باوجود مسکرانے پر مجبور ہوئی تھی۔ چہرے پہ محبت کا انوکھا تاثر بکھر گیا۔

''محبت تو بلاشبہ بہت زیادہ ہے مجھے عبدالعلی سے۔ البتہ یہ فیصلہ نہیں ہوتا قدر سے زیادہ ہے یا اتنی ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک اولاد اپنی فرمانبرداری اور سعادت مندی کے باعث دل سے زیادہ قریب ہو جایا کرتی ہے۔ بانسبت اکڑ و اور ضدی اولاد کے...... بس اتنی سی بات ہے۔'' اس کے لہجے میں محبت کی خوشبو تھی۔ مان تھا، ناز تھا۔ اور یہ سب بلاشک وشبہ عبدالعلی کے لیے تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی اس کام میں وقت ہے۔ سال ڈیڑھ سال...... میں قدر کو خود قائل کرلوں گا۔ ماموں کے گھر جا کر رہے پر آپ کچھ نہ کہیے۔ پھر وہ بدل جائے گی۔ آپ بات منواتی نہیں ہیں۔ زبردستی ٹھونستی ہیں۔ بچپن سے لے کر اب تک آپ نے اسے روکا ٹوکا نہیں۔ اب ایک دم سے چاہتی ہیں وہ سدھر جائے۔ ایسا تو ممکن نہیں ہوتا۔''

عبدالہادی نے نرمی سے سمجھایا تھا مگر علیزے کو ان کی بات سخت ناگوار خاطر ہوئی۔

''یعنی آپ کا خیال ہے ساری غلطی میری ہے......؟'' وہ روہانسی ہوتی، اس کے گلے پڑنے کو تیار تھی۔

''چھوٹی سی ہوتی تھی جب سے میں اسے دوپٹہ لینے پہ قائل کر رہی ہوں۔ ایسی ہے وہ باپ کی بیٹی کہ یہ ایک بات مان کر نہ دکھائی۔ اتنی بڑی ہوگئی مگر دوپٹہ لینا نہیں آسکا۔ ہاتھ میں پکڑے تو پھرے گی سر پہ نہیں اوڑھے گی۔ بتائیں اس میں میرا قصور...... ڈانٹ کے بھی دیکھ لیا...... اس پر آپ کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی اسے...... بگڑنا نہیں تھا تو......''

''اچھا بھئی! معاف کر دیں۔ مان لیا۔ غلطی ہماری ہے۔''

عبدالہادی عاجز ہوئے۔ وہ انھیں خفگی سے، ناراضی سے دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

''ماما! بچپن کے نکاح کی کتنی اہمیت ہے ہمارے مذہب میں؟''

علیزے ڈائننگ ٹیبل پر ملازمہ کے لاکر رکھے کھانے کے لوازمات سجا رہی تھی۔ جب وہ آکر ان کے سر پر سوار ہوئی۔ علیزے کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے ہاتھ روک کر گردن موڑی اور اسے دیکھا۔ ٹی پنک لانگ شرٹ بے حد اسٹائلش جینز کے ٹراؤزر میں ملبوس اس کا موی سراپا اور اُس سے نکلتی شعاعیں اس کو ہمیشہ کی طرح بے انتہا حسین اور چارمنگ بنا کر دکھا رہی تھیں۔

''اہمیت ہی اہمیت ہے۔ یہاں تک سن لو...... بڑی ہونے پر اگر لڑکی کو یہ رشتہ پسند نہ آئے تب بھی وہ خلع نہیں لے سکتی۔ یہاں تک کہ اس کے ولی نہ چاہے۔ یعنی جنھوں نے نکاح کروایا۔ باپ یا دادا۔''

علیزے کا انداز صاف جتلاتا ہوا تھا کہ وہ بہر حال کچھ نہیں کرسکتی اب۔ قدر کی صبیح پیشانی پہ شکنیں سی نمودار ہوئیں۔

''ایک بات میں آپ کو بتا دوں صاف ماما! آپ کے بھائی کے گھر کا ماحول مجھے پسند نہیں آسکا ہے، یہ کلیئر ہے۔ ہاں اگر آپ کا لاڈلا داماد بھی مجھے اٹریکٹ کرنے میں ناکام رہا تو پھر میں پاپا جانی کو فورس کروں گی کہ مجھے ہر صورت خلع چاہیے۔''

اس کا انداز ضدی اور ہٹ دھرم تھا۔ علیزے کا چہرہ صرف غصے سے سرخ نہیں ہوا۔ ضبط سے بھی لال پڑتا جا رہا تھا۔

''اس سے پہلے کہ تم یہ کروقدر یا تو میں خود کو شوٹ کردوں گی یا تمھیں مار ڈالوں گی۔ یاد رکھنا۔'' وہ غرائی۔ قدر کا رنگ بالکل فق ہوگیا۔ اس نے اچنبھے میں گھر کر بے یقین سے ماں کو دیکھا۔ جو سرتاپا کانپ رہی تھی۔ لرز رہی تھی۔

''میں اپنے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں گی۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ یہ رشتہ میری خواہش اور ضد پر طے ہوا تھا۔'' وہ چیخی تھیں۔ قدر کچھ دیر ساکن نظروں سے انھیں تکتی رہی تھی پھر کچھ کہے بغیر پلٹ کر بھاگ گئی۔

اپنے کمرے میں آکر وہ کتنی دیر تک گھٹ گھٹ کر روتی رہی تھی۔ اس کی انا بلبلا رہی تھی۔ نسوانی پندار کرچی کرچی تھا۔ کس وجہ سے...... اس عبدالعلی کی وجہ سے جسے اس کی ماں اس پر فوقیت دے رہی تھیں۔ کیا وہ بتاسکتی تھی کسی کو۔ یہ اہم بات جان لینے کے بعد از خود اس کے دل میں اس انجانے ان دیکھے شخص کا خیال اور احساس جڑ پکڑتا چلا گیا تھا۔ سب سے شدید خواہش اسے دیکھنے کی تھی۔ اور اس کا اظہار اس نے اتباع سے بلا جھجک کردیا تھا۔

''میں عبدالعلی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ ذرا پتا تو چلے کس سے ماما نے میرا نصیب پھوڑا ہے۔''

اس کا انداز شگفتہ تھا۔ جواب میں اتباع نے کتنا حظ لیا تھا اس بات سے جبھی ہنستی رہی تھی۔

''تو تمھیں بالآخر یہ اہم بات معلوم ہوگئی۔ گڈ۔ کیا احساسات ہیں؟''

''یہ تو محترم کو دیکھنے کے بعد بتاسکتی ہوں۔ تم ان کی کچھ Pics تو ایم ایس کرو مجھے۔''

وہ نارمل انداز میں کہہ گئی تھی۔ یہ سچ تھا ابھی وہ کوئی رائے نہیں دینا چاہتی تھی عبدالعلی کے متعلق۔

''تم شاید یقین نہ کرو قدر مگر حقیقت یہی ہے۔ بھائی جان اسنیپس نہیں بنواتے''

''کیوں؟ اتنے خوفناک ہیں وہ؟''

اتباع کے سنجیدگی سے دیے جواب پر اس نے غیر سنجیدگی سے کہا تھا۔

''نہیں۔ گناہ کے خیال سے۔'' اتباع کی سنجیدگی و متانت ہنوز قائم دائم تھی۔ اور قدر شاک میں آگئی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں اسکائپ پہ دیکھ لوں گی۔ وہاں تو اویلیبل ہیں نا؟''

اس نے ہمت نہیں ہاری مگر اس کا بھی فائدہ نہیں ہوسکا۔

''نہیں ناں یار...... بھائی جان اسکائپ یوز نہیں کرتے۔ فیس بک پہ بھی نہیں ہیں۔''

''کیوں......؟'' اس کا انداز سخت احتجاجی ہوا۔

''اتنے مصروف ہیں؟ ملک ان ہی کے کاندھوں پر چل رہا ہے۔'' اس نے طنزیہ کہا تھا۔

''بات مصروفیات کی ہی نہیں ہیں نا قدر! بھائی جان ان خرافات کو پسند نہیں کرتے۔ پھر اسکائپ پہ بھی تو کیمرے سے مووی بنتی ہے ناں۔ جبکہ انھوں نے تصویریں، موویز نہ بنوانے کا عہد کررکھا ہے۔'' اتباع نے نرمی اور تحمل سے اصل وجہ بتائی تھی۔

وہ اس کے طنز صاف پی جایا کرتی تھی۔

''اووووف......!'' قدر نے اپنے بال نوچ لیے تھے جیسے۔

''اب کیا کروں......؟ مجھے تو دیکھنا تھا ان کو'' اس نے بےزاری سے کہا۔

''گھر جب آئیں گے تم بھی آجانا۔ پھر دیکھ لینا مل لینا، اچھی طرح۔''

اب کے اتباع کا انداز شرارتی ہوا تھا۔ قدر کا منہ بنا رہا۔ لگا کسی سوچ نے اس میں جوش جگایا۔

''سیل فون تو یُوز کرتے ہوں گے یا وہ بھی نہیں؟ چلو کیمرے کے بغیر ہی سہی۔''

اس کا انداز کسی حد تک تمسخرانہ ہوا۔

''ہاں فون استعمال کرتے ہیں۔ تم چاہو تو میں

ان کا کانٹیکٹ نمبر تمہیں دے دیتی ہوں۔''
ایک بار پھر اتباع کا رسان، تحمل اور رواداری ظاہر ہوئی۔ وہ کتنے نرم انداز میں کہہ رہی تھی۔ قدر نے ہنکارا ابھرا۔
''ضرور دے دو...... مجھے بات تو کرنی ہے۔''
اس نے اب کے سرد انداز میں جواب دیا تھا اور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔
اتباع کے بھیجے نمبر پر اس نے اس دن کتنی بار ٹرائی کیا۔ اسے یاد نہ رہ سکا۔ گھنٹیاں بجتی تھیں اور کال ریسیو نہ ہوتی تھی۔ قدر کو لگا تھا واقعی جیسے ملک اسی ایک بندے کے کاندھوں پر سوار ہو کر چل رہا ہے۔
اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو سیل فون پر نگاہ پڑتے ہی پھر سے عبدالعلی کا خیال آ گیا۔ بنا سوچے سمجھے اس نے پھر اس کا نمبر پُش کر دیا تھا۔ ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کال ریسیو ہونے کی مگر ہو گئی...... اسے حیرانی سے زیادہ خوشگواری نے آن لیا تو وجہ دوسری جانب سے آتی دلکش مردانہ آواز تھی۔ بھاری بیس والی گھمبیر تر آواز اور سماعتوں پر اثر دکھاتا ہوا لہجہ۔
''السلام علیکم!''
وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ دل جانے کیوں یکدم بہت شدتوں سے دھڑک اٹھا تھا۔
''وسلام! آپ عبدالعلی ہیں......؟''
اس کے لہجے میں اشتیاق اور شوق کی فراوانی در آئی تھی۔
''جی...... مگر آپ کون......؟'' اس کا لہجہ بتاتا تھا وہ الجھ رہا ہے۔ قدر بے ساختہ مسکرانے لگی۔
''قدر......!'' اپنا نام بتاتے اک تفاخر، اک ناز، اک اعتماد خود بخود اس کے لہجے میں اتر آیا۔ جس کو اگلے پل زمین پر پٹخ دیا گیا تھا۔
''کون قدر......؟'' سوال ہوا تھا۔ انداز کی بے نیازی اور بے گانگی نے قدر کو یکلخت صرف ٹھنڈا نہیں کیا وہ توہین، سبکی اور خفت کے ان دیکھے سمندر میں جا گری تھی۔
''کیا واقعی آپ مجھے نہیں جانتے؟'' وہ سلگی تھی۔ بھڑکی تھی۔ ایسی توہین کا تو اس کے آس پاس بھی تصور نہیں تھا۔
''دیکھیے محترمہ! فضول سوالات میں میرا ٹائم برباد نہ کریں۔''
دوسری جانب سے بے زاری میں لپٹی سرد آواز سننے کو ملی۔ اور قدر کے صبر، ضبط اور برداشت کی انتہا ہو گئی۔ ایک لفظ مزید کہے بنا اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں جیسے کسی نے مرچیں جھونک رکھی تھیں۔ وہ شعلوں میں گھری یہاں سے وہاں پھرتی چیزیں پٹختی رہی۔
''کیا سمجھتا ہے وہ خود کو......؟ میری توہین کر رہا تھا دانستہ۔''
اس نے سیل فون اٹھا کر دیوار سے دے مارا۔ طیش پھر بھی ختم نہیں ہوا تھا۔
'شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہے وہ...... میں اسے لازماً بتاؤں گی۔ میرے جوتے کو بھی پروا نہیں ہے اس کی۔'
اس نے حقارت سے سوچا اور فیصلہ کیا تھا، اور کتنے دن اسی اشتعال میں گزار دیے۔ لاشعوری طور پر وہ اس کے دوبارہ رابطہ کرنے کی بھی منتظر تھی۔ وہ معذرت کرے وہ خود اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔
مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کا نیا فون اسی سابقہ کانٹیکٹ نمبر کے ساتھ آن رہا۔ مگر عبدالعلی کی کال تو در کنار ایک میسیج بھی نہیں آیا۔ اور سبکی و ذلت کی انتہا پہ جا کر اس نے ایک انتہائی فیصلہ کر لیا تھا۔ جبھی علیزے کے پاس چلی آئی تھی۔
''ہاں ہاں بھابی! میرے لیے تو یہ عید کے چاند سے بڑھ کر خوشی کی خبر ہے۔ کب آ رہا ہے عبدالعلی!''
علیزے فون پر گفتگو میں مصروف تھی۔ قدر نے اس

کی بات پر دھیان نہیں دیا اور بے زاری سے انھیں مخاطب کیا تھا۔

"ماما!" اس کا انداز ہمیشہ کی طرح ضدی اور ہٹیلا تھا۔ اس کی بچپن سے عادت تھی وہ جب بات کرنا چاہتی یا فرمائش کرنا چاہتی تو علیزے چاہے کتنی اہم کام میں مصروف کیوں نہیں۔ وہ اسے روک کر پہلے اپنی سناتی تھی۔ علیزے جتنا بھی چڑتی اس حرکت سے عبدالہادی کبھی بے زار نہ ہوتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قدر کی یہ عادت بجائے چھوٹنے کے پختہ ہوگئی تھی۔

"پہلے میری بات سن لیں آپ۔"

علیزے کے ہاتھ اٹھا کر انتظار کے اشارے کو سمجھ کر وہ بدتمیزی سے چیخی۔ علیزے نے اسے خفگی سے دیکھا۔ دوسری جانب عبیر بھی اس کی آواز سن چکی تھی۔ جبھی ہنستے ہوئے کہہ گئی۔

"کوئی بات نہیں علیزے! آپ بات سن لیں ہماری گڑیا کی۔ ویسے بھی یہ اطلاع دینا تھی۔ عبدالعلی سے بات ہوئی تو شاہ نے کہا تھا آپ کی طرف کا چکر ضرور لگائے۔"

انھوں نے الوداعی کلمات ادا کر کے فون بند کر دیا۔ علیزے نے قدر کو دیکھا۔ جس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"ہاں بولو جان۔" وہ مسکرا رہی تھیں۔ موڈ عبدالعلی کی آمد کے متعلق سن کر ہی فریش ہو چکا تھا۔

"نہیں آپ لوگوں کی باتیں سن لیں۔ وہ سب آپ کو مجھ سے زیادہ اہم ہیں۔"

اس نے تڑخ کے جواب دیا تھا۔ علیزے گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ کہنا چاہتی تھی یہ لوگ نہیں ہمارے اپنے ہیں۔ مگر اس کے موڈ کی مزید تباہی کے پیش نظر کچھ اور بولی تھی۔

"خوامخواہ موڈ آف نہیں کرتے ہیں بیٹے! بتاؤ کیا کہنا تھا ماما کی جان نے ماما سے۔"

انھوں نے اس کا گال سہلا کر اسے پچکارا۔ قدر نے ناراضی سے ان کا ہاتھ پرے کر دیا۔

"مجھے افسوس ہے ماما! میں آپ کی خاطر بھی یہ رشتہ قائم نہیں رکھ سکتی۔ مجھے دنیا کے سب سے بدتمیز، روکھے اور سرد آدمی سے شادی نہیں کرنی۔ چاہے آپ کچھ بھی کہیں۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ وہاں رکے بغیر ایک جھٹکے سے مڑی تھی مگر دروازے میں ایستادہ، فل یونیفارم میں ملبوس لمبے تڑنگے یکسر انجان واجنبی نوجوان کو دوبروپا کے یکدم ٹھٹک گئی۔ جس کے نقوش بالکل یونانی تھے۔ اور ہیزل گرے آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری، چہرے پہ ہلکا ہلکا رواں جو اس کی دلکشی، سحر انگیزی اور وجاہت کو مزید نمایاں کر رہا تھا۔

"تم کون ہو......؟ اور یہاں تک کیسے چلے آئے؟" وہ اس کی شخصیت کے سحر سے بامشکل نکل کر یہ سوال کر سکی تھی۔

"بوجانی...... !پہچان سکی ہیں آپ مجھے؟"

اسے، اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کیے وہ دونوں بانہیں پھیلائے علیزے کی جانب بڑھا تھا اور قریب جا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

"عبدالعلی......! میرے بیٹے! میرے پسر! واٹ اے پلیزنٹ سرپرائز۔ میری جان تمہاری امی تو ابھی مجھے تمہارے یہاں آنے کا بتا رہی تھیں۔ تم نے اسی وقت آ کر مجھے حیران کر ڈالا ہے۔ میرے اللہ! کہیں خوشی سے میرا دل نہ رک جائے۔ کتنے پیارے ہوگئے ہو تم۔ کتنے خوبصورت اور......اور یہ یونیفارم؟"

وہ حیران تھی۔ ششدر تھی کہ خوش تھی۔ عبدالعلی کو قطعی سمجھ نہ لگ سکی۔ وہ بس سرشار سا اس کی محبتوں کی بارشوں میں بھیگتا رہا۔ جو کبھی اس کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ کبھی اس کے چوڑے سینے پر ہاتھ پھیر کر فوجی یونیفارم پہ خوشگوار حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

اس نے مسکراہٹ دبا کر گہرا سانس بھرا۔
''گھر جانے کی بجائے سیدھا آپ کے پاس آ گیا میں بو جانی! وہاں خطرہ زیادہ تھا جبھی!''
اس کا انداز، کسی حد تک شریر تھا۔ علیزے خاک بھی نہیں سمجھی۔
''کیا مطلب ہے بیٹے! ارے تم بیٹھو تو۔ یہ بیگ اتارو کاندھے سے۔ اتنا وزنی...... ٹھہرو میں پہلے تمہارے لیے کچھ منگواؤں کھانے کو۔''
اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پہ بٹھاتے ان کا ہر انداز، ان کی خوشی آشکار کرتا بلکہ چھلکا تا محسوس کر رہا تھا۔ صحیح معنوں میں پیران کے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔
''میری جان پہلے بتاتے تو سہی مجھے۔ اپنے ہاتھ سے کھانے بناتی تمہارے لیے۔'' انھوں نے پھر اس کا لاڈ اٹھایا۔ وہ نرمی سے مسکرا رہا۔
''آپ بیٹھیں تو بو جانی! میں یہاں کھانے پینے تھوڑی آیا ہوں۔ آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔ اُف ...... کتنے عرصے بعد دیکھ رہا ہوں آپ کو۔ لیکن قسم سے ویسی کی ویسی ہیں آپ ماشاء اللہ! جیسے اماں اور بابا جان کو لوگ میرے پیرنٹس ماننے پر تیار نہیں ہوتے بالکل یہی صورت حال ادھر ہے۔'' اس کا انداز شرارتی تھا۔ علیزے ذرا سی جھینپ گئیں۔
''بہت شریر ہو تم۔'' انھوں نے اس کے بال بکھیرے۔ دونوں اک دوجے میں مگن مسرور تھے۔
قدر کو اپنا آپ پہلی بار اتنا فالتو، اتنا بے کار اور حقیر لگا۔ وہ وہاں سے نکلی تو آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ دماغ بالکل ماؤف تھا۔ کمرے میں آ کر وہ اپنے بستر پر گر کر کتنی دیر خاموش آنسو بہاتی رہی تھی۔ اپنی کیفیات اسے خود صحیح طور سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ آیا وہ کسی بات پہ اور کیونکر پریشان ہے۔ اس کے اندر اک سناٹا اتر رہا تھا۔ وہ خود سے خفا ہو رہی تھی۔ علیزے نے کئی بار اسے اس بات پہ ڈانٹا تھا کہ وہ جلد باز ہے۔ وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکی تھی۔ مگر اب اسے لگا اس میں یہ خامی ہے۔ یہاں آج وہ جلد بازی میں بہت کچھ بنا سوچے سمجھے بول کر غلط کر چکی ہے۔ عبدالعلی کا خود کو نظر انداز کرنا اتنا نہیں کھلا تھا اسے جتنا وہ اپنا قصور اپنی غلطی سوچ رہی تھی۔ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنے بجائے کسی اور کو حق بجانب پائے۔
جو کچھ میں نے کہا اس کے بعد علی کو مجھے ایسے ہی نظر انداز کرنا چاہیے تھا۔ دل کے اس جانب اتنے جھکاؤ پہ ہی اس کے اندر ایسا سناٹا پھیلا تھا۔ جانے کتنی دیر تلک وہ یونہی ساکن پڑی رہی تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز پہ قدرے چونکی۔
''بے بی میم آپ کو کھانے پر بلا رہی ہیں۔ سر بھی موجود ہیں۔''
ملازمہ کا مؤدب لہجہ اس کی سماعتوں میں اترا۔ اس نے سر تکیے پہ پٹخ دیا۔
''رہنے دو منتظر...... مجھے کھانا نہیں کھانا......'' وہ حلق کے بل چیخی تھی۔ باہر خاموشی چھا گئی۔
وہ پھر اوندھی گر کر تکیوں میں منہ گھسا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔ ایک بار دستک ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ جانتی تھی۔ ماما یا پھر پاپا میں سے کوئی ہو گا، اس کے باوجود پوزیشن نہیں بدلی۔ یہاں تک کہ علیزے نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
''قدرے! بیٹا جانی!''
''نہیں ہوں میں آپ کی کچھ بھی...... وہ آ گیا ہے نا آپ کا لاڈلا، دلارا......'' وہ یونہی پڑے پڑے چیخی۔
''ایسا نہیں کہتے میری جان! اور مہمان کو کھانے پہ انتظار کرانا تو اور بھی بُری بات ہے۔''

انھوں نے پھر پچکارا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے ریشمی تراشیدہ بالوں کو سہلایا تھا۔

''مہمان کیوں انتظار کر رہا ہے۔ اتنی اہم ہرگز نہیں ہوں میں۔'' شکوہ بالآخر زبان پر آ گیا۔

علیزے اس ایک بات پہ چونکی تھیں۔ جبھی مقصد سمجھتے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

''ایسی بات کیوں سوچی ماما کی جان! آپ کے بغیر کھانا حلق سے نہیں اترے گا۔ نہ ماما کے نہ بابا کے۔ چلو اٹھو۔''

انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر سے اتارنا چاہا مگر وہ پھر اینٹھ گئی۔

''ٹھیک ہے پھر۔ آپ یہاں بھجوا دیں مجھے کھانا۔ وہاں نہیں جاؤں گی۔'' علیزے حیران نظر آنے لگیں۔ پھر سرد آہ بھری۔

''عبدالعلی کیا سوچیں گے بیٹے!''

''جو اس کا دل کرتا ہے سوچے۔ آئی ڈونٹ کیئر!'' اس نے تنفر سے کہا تھا۔ وہ آج تک خود اپنے آگے سب کو جھکاتی آئی تھی۔ عبدالعلی ہوتا کون تھا اس کے سامنے اکڑنے والا۔

''ایسا نہیں کرتے بیٹے! ماما اور پاپا کی خاطر آ جاؤ ٹیبل پہ۔ پلیز!'' علیزے ملتجی ہوئیں۔ وہ نروٹھے پن سے انھیں دیکھتی، ان کی ملتجی نگاہوں پر بالآخر پگھل گئی۔ کچھ کہے بغیر بستر سے اتر کر احسان کرنے والے انداز میں جوتے پہن کر دروازے کی جانب بڑھی تھی کہ علیزے گھبرائیں۔

''دوپٹہ...... دوپٹہ بیٹے!'' انھوں نے خود اس کا بیڈ پر دھرا دوپٹہ اٹھا کر اسے تھمایا۔ جو اس نے نخوت زدہ انداز میں گلے میں لٹکانے کا تکلف برتا تھا۔ علیزے اسے ٹوک کر سر پر اوڑھانا چاہتی تھیں مگر اس کے موڈ کے پیش نظر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ دونوں اسی خاموشی سے چلتی ڈائننگ ہال میں آئی تھیں۔ جہاں عبدالہادی نے ہمیشہ کا سا اس کا خیر مقدم کیا تھا۔

''آؤ بیٹے! طبیعت ٹھیک ہے؟''

انھوں نے کرسی چھوڑ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اس نے محض سر ہلایا اور علیزے کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اب عبدالعلی بالکل اس کے مدمقابل آ گیا تھا۔ بلیک ٹراؤزر پہ وائٹ ٹی شرٹ، اس کے اوپر سے لیدر کی براؤن جیکٹ جس کی زپ کھلی ہوئی تھی۔ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ امپریسو اور شاندار لگا اور بے نیاز اور لاتعلق بھی تو آنکھوں میں جلن بڑھنے لگی۔

''قدر سے ملے آپ بیٹے؟'' عبدالہادی کے سوال پہ قدر کی جان جل کر خاک ہوئی تھی۔ ڈش سے بریانی نکالتے اس کے ہاتھ کی گرفت چمچ پہ سخت تر ہو گئی۔

''جی انکل! بہت اچھی طرح سے تعارف ہو چکا۔''

اس جواب پر قدر نے اب کی بار نیچی نظر سے نہیں نگاہ اٹھا کر براہِ راست اسے دیکھا تھا۔ وہ کڑاہی کے ڈونگے سے بہت اختصار سے سالن اپنی پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ انداز اتنا مگن تھا گویا اس پل یہی سب سے اہم، خاص اور ضروری کام ہے۔ قدر نے دانت بھینچ لیے۔ علیزے کی ساری توجہ اسی پر مرکوز تھی۔ وہ جتنے نخرے کر رہا تھا۔ وہ اس قدر اُسے مختلف ڈشیز پیش کر رہی تھیں۔ ساتھ میں یہ فقرہ جھالر لگا کر 'خصوصاً تمہارے لیے بنائی ہے...... مجھے پتا ہے تمھیں پسند ہے۔'

قدر کو پھر سے اپنا نظر انداز ہونا محسوس ہوا۔ علیزے تو اسے لا کر بھولی ہی تھیں۔ عبدالہادی بھی پہلی بار گھر آنے والے داماد کے چاؤ لاڈ کرنے میں مصروف تھے۔

''ارے عبدالعلی بیٹے! بھائی کو بتا تو دیا تھا کہ ادھر ہو آپ؟ انھیں تو یہی پتا تھا کہ آپ وہاں جاؤ گے۔ منتظر ہوں گے۔ سب آپ کے بلکہ

پریشان......اور میری عقل دیکھو...... تمہیں دیکھ کر باقی سب بھول گیا۔" علیزے تیز تیز بولتیں سر پیٹنے والی ہوگئی تھیں۔ عبدالعلی بے حد نرمی سے مسکرانے لگا۔

"پریشان نہ ہوں۔ میں نے اس دوران فرصت نکال کر ایک ٹیکسٹ اتباع کو کردیا تھا۔ وہ بہت ذمہ دار ہے بتادے گی اماں کو بھی اور امی جان کو بھی۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے۔ مگر تم انھیں کال بھی کرلینا۔ اور سنو میں بہت دنوں تک ہرگز نہیں بھیجنے والی ہوں تمھیں۔" مطمئن ہوتے انھوں نے گویا اس پر حق جتلایا۔ جواب میں اس کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی تھی۔

"دیکھ لیں بوجانی! اگر آپ فون پر بابا جانی اور اماں کا غصہ کم کرسکتی ہیں تو مجھے اعتراض نہیں۔ ورنہ انھیں منانے اور قائل کرنے کے لیے آپ کو میرے ساتھ وہاں چلنا پڑے گا۔"

اس کا انداز بلیک میلنگ والا تھا۔ علیزے نے گہرا سانس بھرلیا۔ جبکہ قدر بے طرح چونک کر پھر اسے تکنے لگی تھی۔ دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ عبدالعلی بیٹے! دکھ تو انھیں ہوگا۔ ہرٹ بھی لازماً ہوں گے۔ والدین کے نزدیک بچوں کی خوشی اہم ہوا کرتی ہے اور فیصلے بھی۔ وہ اجازت دے ہی دیا کرتے ہیں چاہے کتنی ہی ناگوار بات کیوں نہ ہوں۔ مگر لاعلم رکھ کر اپنے طور پر لیا گیا فیصلہ ضرور انھیں خود اپنی نظروں سے بے مایا کرجاتا ہے۔ آپ تو بہت سمجھدار بچے رہے ہو ہمیشہ...... پھر ایسا قدم کیسے اٹھالیا۔"

علیزے کے لہجے میں ہلکا سا دکھ اور تاسف وملال تھا۔ عبدالعلی بھی قدرے شرمسار نظر آنے لگا۔ قدر کا دل...... اسے لگا وہ پاتال میں گر رہا ہے۔ اس نے چمچہ پلیٹ میں چھوڑ دیا۔ مہین سی آواز گونجی۔

"اس کا مطلب اچھی لگی تھیں...... شکر ہے

اگلے لمحے وہ کرسی دھکیل کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا بیٹے!" عبدالہادی نے حیرت سے استفسار کیا۔

"کچھ نہیں۔ کھا چکی ہوں میں۔" اس نے غصے میں علیزے کو دیکھا۔ جواب بھی متوجہ نہیں تھیں۔ اور دھپ دھپ کر وہاں سے چلی گئی۔ عبدالہادی سرد آہ بھر کے رہ گئے۔

"قدر نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا ہے علیزے! آپ انھیں یاد سے دودھ کا گلاس بھجوادینا پلیز!"

وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اُٹھے تو علیزے کو تاکید کی تھی۔ جو ہنوز عبدالعلی سے گفت وشنید میں مگن تھیں۔ دونوں کھا کم رہے تھے، باتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔

"ڈونٹ وری! بھیج دوں گی۔" علیزے لمحہ بھر کو متوجہ ہوئی تھیں۔

"عبدالعلی...... !معذرت بیٹے! مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ آپ سے کل فرصت میں میٹنگ ہوگی۔" اب وہ عبدالعلی سے مخاطب تھے۔ انداز میں شفقت بھی تھی۔ محبت بھی۔ وہ جواباً خوشدلی سے مسکرادیا۔

"ضرور انکل! انشاءاللہ!" انھوں نے اس کا سر تھپکا اور باہر نکل گئے۔

"قدر کیسی لگی تمھیں عبدالعلی؟" علیزے کے ہر انداز میں شوق اشتیاق تھا۔ خوشی تھی۔ عبدالعلی یکدم سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"جیسی میرے بچپن میں آپ لگتی تھیں۔" وہ بہت سوچ کر بولا تھا۔ علیزے اس جواب پر سرتاپا نہال ہوکر رہ گئیں۔ مسکراہٹ سورج کی پہلی نوخیز کرن کی مانند ان کے چہرے پر اتر کر اسے مزید روشن کرنے لگی۔

خدا کا۔'' وہ سراپا عاجز ہوئیں۔ عبدالعلی محض مسکرا دیا۔ وہ جان نہیں سکی تھیں۔ یہ مسکراہٹ دل رکھنے والی بھی ہوسکتی ہے۔

''تمھیں وہ سب یاد ہے میرے بچے! جب تمہارا نکاح ہوا تھا قدر کے ساتھ...... آٹھ سال کے تھے تم......اور قدر محض چند دن کی۔ عبداللہ کے پاس تو تصویریں بھی تھیں اس موقع کی...... دکھائیں نہیں تمھیں کبھی اس نے......؟'' ان کے انداز سے، آواز سے، آنکھوں سے اشتیاق اور خوشی پھوٹتی تھی۔ وہ انھیں دیکھتا رہ گیا۔

''جی...... جی دیکھ رکھی ہیں۔'' وہ کوشش کے باوجود اب مسکرا نہیں سکا۔ پھر دانستہ موضوع بدلا۔

''بو جانی! آپ کا کیا خیال ہے بابا جانی یا والدہ ہرٹ ہوں گی؟''

''آپ کا فیصلہ غلط نہیں ہے میرے بیٹے! مجھے نہیں لگتا بھائی اختلاف کریں گے۔ ہاں لاریب ضرور رکاوٹ ڈالے گی۔ مجھے یقین ہے۔ اس کی وجہ بھی کوئی اور نہیں۔ تمہاری محبت ہے۔ مگر فکر نہ کرو۔ میں عبیر اور بھائی کے علاوہ بجو بھی نا تمہاری طرف داری کو...... جیت ہماری ہی ہوگی۔''

انھوں نے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ساتھ ہی تسلی سے بھی نواز دیا تھا۔ اس سے قبل کہ عبدالعلی کچھ کہتا۔ اس کا سیل فون گنگنانے لگا تھا۔ جیکٹ کی پاکٹ سے موبائل نکالتے ہی وہ ایک دم الرٹ نظر آنے لگا۔

''آفیشنل کال ہے بو جانی! معذرت ڈراپ نہیں کرسکتا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ علیزے مسکرا دیں۔

''تم بات کرو بیٹے! میں تب تک خود چائے بنا کر لاتی ہوں تمہارے لیے۔''

انھوں نے اس کا گال سہلایا اور کرسی چھوڑ کر اُٹھ گئیں۔ ملازماؤں کو ٹیبل سے برتن اٹھانے کا کہتی ہوئیں وہ خود کچن میں آگئیں۔ تب ہی قدر بھی دندناتی ہوئی ان کے سر پہ آکر چڑھی تھی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے ماما!''

''بولو بیٹے......؟'' علیزے نے کیبنٹ کھول کر بہت خوبصورت سے مگ نکالتے ہوئے جواب دیا۔

''بتانا پسند کریں گی آپ کے لاڈلے داماد صاحب ایسا کون سا کارنامہ انجام دے کر آئے ہیں۔ جس کے بعد گھر جاتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ اور سب کی ناراضگی کا خطرہ لاحق ہوا پڑا ہے۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ یقیناً شادی کرلی ہوگی پسند سے اور اب آپ کی سفارش......''

''قدر......! آہستہ بولو......عبدالعلی نے سن لیا تو کتنی غلط بات ہوگی۔''

علیزے نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑ کر تنبیہہ کے انداز میں دبایا۔ مگر وہ بجائے شرمندہ ہونے کے اور بھڑ اٹھی۔

''ہاں تو سن لیں...... میں کون سا ڈرتی ہوں۔'' اس نے نخوت سے ہونٹ سکوڑے۔ علیزے بے زار ہوئی تھیں۔

''حد ہوتی ہے قدر کسی بھی بدگمانی کی...... بھائی اور لاریب کو بتائے بغیر آرمی جوائن کی ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ جس کا تم......'' معاً وہ ایک دم زبان دبا گئیں۔ ان کی نگاہیں ساکن ہوگئی تھیں۔ قدر نے الجھ کے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور جیسے لمحے کے ہزارویں حصے میں زمین میں گڑ گئی۔ آج ہی کے دن وہ دو مرتبہ اس کے نادر خیالات سے آگاہ ہوچکا تھا۔ حد تھی یعنی......اس کا بس نہیں چلا تھا خود کہیں غائب ہوجاتے یا عبدالعلی کا سر پھاڑ دے۔

''بو جانی آپ کا گھر تو بڑا بھول بھلیاں ہیں۔ اگر ایک مہربان خاتون گائیڈ نہ کرتیں تو میں لازماً گم ہوجاتا۔'' ایک بار پھر اسے نظر انداز کیے وہ اپنی

سنا رہا تھا۔ قدر کو اپنی غلطی بھی اس کا قصور لگنے لگی۔

''اگر دوسروں کی ٹوہ لیتے پھریں گے تو ایسے ہی ہوگا۔'' وہ پھنکاری تھی اور ایک دم ہی سارا غصہ نکالا۔ علیزے ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں۔

''بی بی اگر آپ راہ چلتے اپنے انتہائی ذاتی معاملے ڈسکس کرتی پھریں گی تو کوئی اپنے کان بند نہیں کرسکتا۔ اور مائنڈ اِٹ...... مجھے ہرگز کسی کے معاملے میں اتنی دلچسپی نہیں ہے کہ ٹوہ لینے کی ضرورت پیش آئے۔ الحمدللہ یہ میری فطرت ہے نہ عادت۔''

اس کا انداز جتنا سنجیدہ تھا اس سے کہیں بڑھ کر مضحکہ اڑاتا لہجہ قدر کو صحیح معنوں میں آگ لگ گئی۔

''دیکھیں مسٹر! آپ حد سے تجاوز کررہے ہیں۔'' انگلی اٹھا کر وہ تنبیہ کے انداز میں غرا کر بولی۔ علیزے کو دونوں نے نظرانداز کردیا تھا۔ جو شاک کے عالم میں سلیب کا سہارا لیے کھڑی ہر لمحہ بے جان ہورہی تھی۔

''اب آپ مجھے میری حدود بتائیں گی......''

عبدالعلی نے اس سے بڑھ کر غصیلے اور طنزیہ انداز میں استفسار کیا تھا۔ قدر کا رنگ پھیکا پڑا۔ وہ لاجواب بھی ہوئی تھی مگر ہار تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''آپ آخر ہوتے کون ہیں مجھے یہ بتانے والے کہ مجھے کب کیا کرنا چاہیے۔ مت بھولیں یہ گھر میرا ہے۔'' اب کے وہ جتلا کر بولی تھی۔ انداز میں تفاخر اور غرور بھرا ہوا تھا۔ عبدالعلی نے اب کے اسے حیرانگی سے دیکھا۔ پھر سرد تاثرات کے ساتھ عجیب انداز میں ہنسا۔

''آپ کو کس نے کہا میں اس گھر یا پھر آپ پر کسی استحقاق کا دعویٰ کرنے والا ہوں بی بی!''

اس کا لہجہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ قدر سن پڑ گئی۔ انداز میں اتنی تضحیک محسوس ہوئی تھی کہ اسے اپنا وجود پرخچوں کی صورت اڑتا بکھرتا ہوا لگنے لگا۔ اس نے

پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ علیزے کو شکی نظروں سے دیکھنا چاہا تھا جو اپنے لاڈلے کی اتنی فضول گفتگو کس درجہ تحمل سے سن رہی تھیں۔ مگر آنکھوں میں اترتی دھند نے ہر منظر غیر واضح کردیا تھا تو کچھ کہے بغیر منہ پر ہاتھ رکھے پلٹ کر کچن سے نکل کر بھاگ گئی۔ عبدالعلی سر جھٹک کر علیزے کی جانب مڑا تو اسے فق چہرے کے ساتھ سرتاپا لرزتا پاکر بے ساختہ گھبرا گیا۔

''بوجانی!...... آر یُو اوکے......؟'' اس کے لہجے میں کتنی محبت، کتنی تشویش تھی۔

علیزے کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ لگ کر سسک پڑی۔ وہ اور بوکھلایا۔

''کیا ہوگیا بوجانی! خود کو سنبھالیں پلیز!'' وہ انھیں بازو کے حلقے میں لے کر تھپکنے لگا۔

''میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں عبدالعلی! اور...... اور میری قدر...... میرا اثاثہ ہے...... یہ میری ضد تھی کہ تم دونوں کو اس رشتے میں باندھ دیا تھا۔ حالانکہ سب سمجھتے تھے...... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بڑے ہونے پر خیالات بدل سکتے ہیں...... اور...... اور وہی ہوا۔''

وہ زاروقطار رو رہی تھیں۔ عبدالعلی کو انھیں سنبھالنا چپ کرانا دشوار ہونے لگا۔ اس کے چہرے پر بے حد گھبراہٹ تھی۔ وہ جیسے کسی کٹھن کشمکش سے دوچار تھا۔

''آیئے اندر چلتے ہیں بوجانی!''

وہ اسے یونہی سہارا دیے اُس کے کمرے میں لے آیا۔ علیزے کا کمزور دل خوف و خدشات لیے لرزتا رہا۔ ہر لمحہ ڈوبتا رہا۔

''مجھے لٹادو بیٹے!'' وہ بے حد نقاہت محسوس کرنے لگی تھی۔ جیسے لمحوں میں عبدالعلی نے سنبھل کر اسے بستر پر لٹایا پشت پر تکیے اور کشن رکھے اور کمبل پھیلا دیا۔ خود اس کا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں ٹک گیا۔

''آپ یہ کبھی نہیں سوچیے گا بوجانی کہ آپ کا یہ بیٹا آپ کو کبھی ہرٹ کرے گا یا مایوس کرے گا۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں۔ ایسا وقت آنے سے قبل مجھے موت سے ہمکنار کردے۔''

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ قدر نے تڑپ کے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے میرے جگر گوشے! تمہیں خدا ہماری بھی عمر لگادے۔ آمین۔'' وہ سسکی۔ عبدالعلی نے اس کا ہاتھ لبوں سے چھولیا۔

''آپ کی محبت میرے لیے ہمیشہ فخر کا باعث رہی ہے بوجانی! جب میں چھوٹا تھا۔ اسکول میں کلاس فیلوز سے بابا جانی اور اماں کی نہیں آپ کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ میرے لیے یہ بات بے حد اعزاز کا باعث تھی کہ میری بو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ میں آپ کے کسی فیصلے سے اختلاف کا تصور بھی نہیں رکھتا۔ ہاں قدر کے رویے نے مجھے ضرور اپ سیٹ کیا ہے۔ آپ کی محبتوں کا ناجائز فائدہ اٹھارہی ہیں محترمہ! بوجانی......! میں نے اب ہی اسے دیکھا ہے۔ اللہ گواہ ہے۔ وہ مجھے بُری نہیں لگیں۔ مگر بوجانی......! میں چاہتا ہوں وہ مجھے اچھی لگیں۔ صرف اچھی نہیں۔ میں ان سے محبت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ہماری زندگی بہتر نہیں بہترین گزر سکے۔ آپ کا وہ فیصلہ آسودگی سے بھی ہمکنار کرسکتا ہے سب کو اگر جو قدر میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی۔ آپ چاہیں گی ناکہ وہ اچھی والی بچی بن جائیں......؟''

وہ رک کر انھیں تائیدی نظروں سے تکنے لگا۔ علیزے جو حیران گم صم اسے سن رہی تھیں۔ ٹھٹکیں اور اسی بے خودی میں سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ عبدالعلی ان کے انداز پر مسکرایا۔

''تو پھر مجھے وہ کرنے دیں جو میں کرتا ہوں۔ میرے کسی بھی عمل سے کبھی بھی آپ نے پریشان نہیں ہونا۔ کریں پرامس۔''

وہ اپنی شفاف چوڑی ہتھیلی پھیلا چکا تھا ان کے سامنے......علیزے نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

''مجھے تم پہ بھروسہ ہی نہیں ہے میرے بچے! مجھے تم پہ فخر بھی ہے۔''

ان کے انداز میں، ان کی آنکھوں میں محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ انھوں نے وفورِ جذبات سے معمور ہوتے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ عبدالعلی ہلکا پھلکا ہو کر مسکرایا۔

☆☆......☆☆

سامنے بل کھاتی سڑک تھی۔ دائیں جانب آسمان چھوتے پہاڑ اور بائیں جانب گہری کھائیاں اور آڑی ترچھی ندی جو اتنی بلندی سے دیکھنے پہ ایک لکیر کی صورت نظر آتی تھیں۔ آسمان نیلا تھا چمکیلا بلور جیسا مگر درخت جو بے حد گھنے تھے۔ اس کے اجالے کے راستے میں حائل تھے۔ کہ سورج اپنی روشنی زمین تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کے اردگرد بادلوں جیسی تاریکی تھی۔ بس کہیں کوئی ڈھیٹ کرن پتوں پر ناچ اٹھتی تھی۔ وہ کل سے آیا ہوا تھا۔ آج گھر سے باہر نکلا تھا۔ تو بھی علیزے اس کے لیے پریشان تھی۔

''اکیلے مت جاؤ بیٹے! راستے بہت خراب ہیں اور تم عادی نہیں ہو۔ مجھے فکر رہے گی۔'' جواباً وہ آہستگی سے مسکرادیا تھا۔

''کم آن بوجانی! فوجی بندہ ہوں! ٹریننگ کے ایسے ایسے مراحل سے گزرا ہوں کہ آپ بس سوچ ہی سکتی ہیں۔ ہر طرح کے راستوں پہ چاہے کتنے ہی دشوار کیوں نہ ہوں بے خطر بھاگ سکتا ہوں۔ سو یُو ڈونٹ وری۔''

اس کی تسلی کے باوجود علیزے نے اس پر آیت

الکرسی پڑھ کر دم کیے بغیر اسے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔

وہ ان کی محبتوں کو سوچ کر مسکرایا۔ اور سبزے کی باس اور جنگلی پھولوں کی مہک جو شام جہاں کو معطر کر رہی تھی لمبا سانس کھینچ کر پھیپھڑوں میں اتارنے لگا۔

یہاں سبزے کا رنگ اور ہی تھا۔ اور عجیب ہول جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بلکہ پھولوں کے رنگ بھی نئے تھے۔

سرخ اس قدر جوشیلا

پیلا اتنا امید بھرا...... سکون آمیز

گلابی خوشی کے احساس سے ہمکنار کرتا ہوا

اور سفید نور جیسا پاکیزہ

خوشی کا احساس اس کے رگ وپے میں سما رہا تھا۔ اسے یقین آنے لگا۔ مدھم اور ماحول کی خوبصورتی مزاج پہ اثر انداز ہوتی ہے۔ معاً وہ یکدم چونکا۔ خوفناک قسم کی پہاڑی کے سرے پر سے کسی آنچل کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ یکدم ٹھٹکا۔ وہ جو کوئی بھی تھی۔ اس کا انداز ہرگز بھی نارمل نہیں لگتا تھا۔ اس کے اندر جیسے کسی نے پارہ بھر دیا۔ درے اور نالے پھلانگتا اگلے لمحے وہ اس سمت بھاگ رہا تھا۔ اس کے پیروں تلے آتے چھوٹے پتھر اور کنکر پھسل پھسل کر لڑھکتے ڈھلوان کی جانب تیزی سے گر رہے تھے۔

اپنے تئیں اس نے کوشش کی تھی۔ چپ چاپ جاکر اسے پکڑ لے وہ جو بھی تھی مگر اس کے قدموں کی آہٹ نے اس کی آمد کا بھید کھول دیا تھا۔ چونک کر تیزی سے گردان موڑنے والی لڑکی کا چہرہ دیکھ کر عبدالعلی کو شاک لگا تھا۔

”تم......؟“ وہ کسی طرح بھی اپنی حیرت پر قابو نہیں رکھ سکا۔

”خبردار میرے قریب مت آنا تم...... سنا تم نے؟“ وہ بے ساختہ چیخی اور چٹان کے سرے کی جانب بھاگی۔ عبدالعلی چیتے کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اگلے لمحے جب وہ نیچے چھلانگ لگانے والی

تھی عبدالعلی نے بُو دز قند بھر کے اسے پشت سے اپنے بازوؤں کے سخت فولادی شکنجے میں کس لیا تھا۔

مگر دونوں اس طرح گرے تھے کہ ذرا سی بے احتیاطی دونوں کو ہی ہزاروں فٹ گہری خوفناک پٹی میں گرا سکتی تھی۔ قدر کے دائیں جانب نگاہ ڈالتے ہی اوسان خطا ہو گئے تھے۔ خوف نے اس کی قوتِ گویائی بھی سلب کر ڈالی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عبدالعلی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ عبدالعلی کے اپنے حواس بھی ہرگز سلامت نہیں تھے۔ اس نے بازو کے حلقے میں اسے دبوچ کر خود کو بائیں جانب لڑھکا دیا۔ دونوں ہی پھسلتے ہوئے نیچے گرنے لگے۔ قدر کا سکتہ ٹوٹا تھا اور اگلے لمحے اس کی دہشت زدہ، خوفزدہ چیخوں سے ماحول لرز اٹھا تھا۔ عبدالعلی نے خود کو روکنے کی خاطر بازو پھیلا کر قدرے ابھری ہوئی چٹان کا سہارا لیا تھا۔ ورنہ اسی صورت پھسلتے رہنے سے ان کے جسم بہرحال ان سفاک چٹانوں کے نوکیلے سروں سے ٹکراتے بالآخر پاش پاش ہوجاتے۔ عبدالعلی کی کوشش کارگر ثابت ہوئی تھی۔ لڑھکنے کا یہ سلسلہ تھم گیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ عبدالعلی اوپر اور وہ پوری اس کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ عبدالعلی حواس بحال ہوتے ہی سنبھل کر تیزی سے اٹھا۔ اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ قدر اس قابل بھی نہیں تھی کہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔ اس کے اعصاب اور حواسوں پہ ہنوز خوف و ہراس کا غلبہ تھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں اس حماقت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ زندگی آپ کے نزدیک اتنی ہی حقیر اور بے مایا ہے کہ کسی بھی غیر مطلق شخص کی معمولی ڈانٹ ڈپٹ پر اسے یوں لٹانے پر تل جائیں۔“

عبدالعلی کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔ دونوں کے حلیے بگڑ چکے تھے۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹے اور جسم پر زخم اور لاتعداد خراشیں تھیں۔ قدر کی چادر اللہ

جانے کہاں رہ گئی تھیں۔ بکھرے ہوئے بالوں اور پیشانی سے بہتے خون کے ساتھ وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ اس پر اس کا سسکنا رونا۔ وہ ناک تک بے زار ہو چکا تھا۔ اس کی چادر کی تلاش میں دور تک نگاہ دوڑائی مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اپنی جیکٹ اتار کر اس کے کاندھوں پر ڈال دی۔

"اگر یہ جوش مدھم پڑ گیا ہے تو گھر چلیں؟" اس کا انداز طنزیہ تھا۔ صاف لگتا تھا اس کے اعصاب کس درجہ مضبوط ہیں۔ اتنے کڑے مرحلے سے گزر کر موت کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھی وہ نارمل انداز میں بات چیت کر رہا تھا۔ قدر جو ابھی تک اس حادثے اور المیے کی زد پر تھی اس کی جلی کٹی طنزیہ باتوں پر جھلس کر رہ گئی۔

"کیوں بچایا مجھے...... کیوں پکڑا......" وہ یونہی روتے ہوئے چیخی اور اس کی جیکٹ اس غصیلے انداز میں اتار کر پھینکی۔

"اپنی تصحیح کر لیں بی بی! بچایا آپ کو اللہ نے ہے۔ میں اتنی ہمت نہیں رکھتا۔ ہاں پکڑا ضرور ہے۔ تو اپنے لیے نہیں۔ بوجانی کا خیال آ گیا تھا۔ لیکن آپ اب یہ شوق پورا کر سکتی ہیں۔ میں ہر گز دوبارہ ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔"

اس نے برہمی سے جتلایا تھا۔ قدر نے غصے میں منہ پھیر لیا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں، کلائیوں پر آنے والی خراشوں کو سہلانے لگی۔

"اٹھیے محترمہ! میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔" وہ قدرے خفا ہوا۔ قدر خلاف توقع وامید اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عبدالعلی نے شکر کا سانس بھرا تھا۔ اور جھک کر اس کی پھینکی جیکٹ اٹھالی۔

"میں جانتا ہوں آپ مجھے پسند نہیں کرتیں۔ لیکن اس وقت یہ کڑوا گھونٹ بھر لیں۔ اس لیے بھی کہ آپ کا حلیہ اس قابل نہیں ہے۔"

اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہتے جیکٹ پھر اس کو پہنا دی۔ اور قدر جو ہمیشہ سے اس احساس سے بے نیاز تھی۔ اس کی بات پر سرتاپا جھلس کر رہ گئی۔ اس کی پلکیں اُٹھ نہیں سکی تھیں۔

"دوپٹہ عورت کی عزت کی علامت ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت خود اس عزت کو سر سے اتار دے تو پھر کوئی بھی مرد اسے عزت کی نگاہ سے نہیں نواز سکتا۔"

وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا۔ مگر مخاطب وہی تھی۔ قدر کو زندگی میں کبھی اتنی خفت محسوس نہیں ہوئی جتنی اس پل ہوئی تھی۔ بے بسی، شرمندگی اور دکھ کے شدید احساس سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سر کچھ اور جھکا کر وہ تیز قدم اٹھانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

وہ دن اور اگلا بھی پورا دن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ یہ سچ تھا اس میں عبدالعلی کا سامنا کرنے کی تاب نہیں تھی۔ وہ صرف اس لیے نہیں علیزے اور عبدالہادی سے بھی چھپی پھرتی تھی۔ بھلا کیا جواز دیتی وہ انھیں ان چوٹوں کا جو وہ اس حماقت کے نتیجے میں لگوا چکی تھی۔ اس نے نم پلکیں جھپکیں اور کروٹ بدل لی۔ مگر سکون نہیں تھا۔ ذہن ہزار کوشش کے باوجود ان سحر آفرین لمحوں سے نکل نہیں پاتا تھا۔ جب عبدالعلی کے ابلتے ہوئے پُرتپش لمس سے زندگی کی حرارت اس کے جسم وجان میں اتر کر ہلچل مچانے لگی تھی اور زندگی کے سب سے خوبصورت احساس سے ہمکنار کر گئی تھی۔ اس لمس نے ہی تو احساسِ زندگی سے واقفیت دی تھی۔ ورنہ وہم وخیال تو سراسر ناآسودگی کے سوا کچھ نہیں۔ مادّی اور اسباب وعلّت کی دنیا میں لمس کا احساس ہی زندگی کی موجودگی کا یقین ہے۔ وہ جو اس کی شخصیت کے سحر سے خود کو نکال لینے کی جدوجہد میں مشغول تھی۔ جیسے کسی ان دیکھے جال میں پھنس گئی۔ یہ احساس کیسا تھا سرخروئی ودلکشی لیے مگر صرف اس کے لیے۔ دوسری جانب تو غفلت وبے نیازی کا وہی عالم تھا۔ اس کا دل سسکنے

لگا...... تڑپنے مچلنے لگا۔
محبت کینسر ہوتی ہے۔ جسم میں گھس جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے بے خبری میں جگہ بناتی ہے۔ تب پتا چلتا ہے۔ جب پورا وجود کینسر زدہ ہو جاتا ہے۔ لاعلاج۔ اسے سمجھ نہ آرہی تھی، وہ کب اس کی اتنی اسیر ہوئی۔ اسے اپنے اندر پلتے ناسور کی خبر ہوئی تو جیسے بالکل لاچار تھی آگے۔ بس یہ معلوم تھا۔ اس ایک شخص کے قدموں کی چاپ وہ اتنے شور میں بھی سن سکتی ہے۔ یہ سب کیا ہوا تھا اور کیونکر...... اسے یہی خیال دکھ کے سمندروں میں غوطہ زن کیے جاتا تھا۔ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری اور پھر کوئی دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ قدر نے چونک کر گردن اٹھائی تھی۔ اور اس دشمن جاں کو روبرو پا کے ششدر ہوتی بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ جو یکدم ٹھٹکا تھا اور خود اس سے بڑھ کر حق دق نظر آنے لگا۔

''آ آپ......؟'' اس کی حیرت تمام نہ ہوتی تھی۔ یا خوشگواریت کا غلبہ چھا رہا تھا۔ عبدالعلی نے ان باریکیوں پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور الٹے قدموں پلٹتے ہوئے بے ساختہ قسم کی سنجیدگی سمیت وضاحت کر رہا تھا۔

''سوری...... بائے مس ٹیک ہوا یہ۔ ایکچو لی آپ کے گھر کی لوکیشن ہی ایسی ہے کہ مجھے یاد نہیں رہ پاتی...... راہداریاں کمرے سب ہی ایک جیسے لگتے ہیں۔''

وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ قدر کچھ نہیں بولی۔ بس اسے تکتی رہی۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ بال پیشانی پہ بکھرے ہوئے اور پسینے سے تر بتر۔

''اس وضاحت کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ اٹس او کے۔''

قدر کی آہستگی سے کہنے پہ عبدالعلی جو دروازہ کھول چکا تھا۔ بے ساختہ قسم کی حیرانی سمیت پلٹا۔

وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ مگر عبدالعلی کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ گلابی نائٹی میں بالوں کو دونوں ہاتھ اٹھا کر سمیٹ کر جوڑے کی شکل دیتی ہوئی وہ اس لباس کی بے باکی اور گہرے گلے کے گھاٹ سے بے نیاز دکھائی دیتی تھی۔ عبدالعلی کو ناگواری کسی برقی رو کی مانند اپنے وجود میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ نگاہ کا زاویہ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں بدل چکا تھا۔

''یہ معذرت اور وضاحت میری ذمہ داری تھی۔ بی کوز میں کبھی بھی نہیں پسند کرتا کہ کوئی میرے متعلق معمولی سا بھی برا گمان رکھے۔''

اس کے لہجے کی ناگواری اور سرد مہری بے حد واضح تھی۔ جسے قدر نے شاید محسوس نہیں کیا۔ اسے دروازے سے باہر قدم رکھتے پا کر وہ پھر تیزی سے گویا ہوئی تھی۔

''آپ کی ایک امانت تھی میرے پاس! وہ لیتے جائیے۔'' وہ وارڈروب کی جانب جاتے ہوئے بولی۔

''یہ بات اتنی اہم ہرگز نہیں محترمہ! آئی وش کہ آپ ان باتوں کی جانب توجہ دے سکیں جو زندگی میں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چلتا ہوں۔''

اس سے نگاہ چار کیے بنا وہ یونہی رخ موڑے، بے مہر سنجیدگی سے کہتا دہلیز پار کر گیا تھا۔ قدر اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر سر جھٹکا اور واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

فون کی بیل تسلسل سے بج رہی تھی۔ اتباع جو وارڈروب کی صفائی میں مصروف تھی۔ شرٹ ہاتھ میں لیے سیل فون تک آئی۔ اسکرین پر بریرہ کا نمبر بلنک کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اسلام علیکم ببو جان!''

اس نے دل سے سلامتی بھیجی تھی۔ موڈ خود بخود خوشگواریت سمیت لایا تھا۔

''وعلیکم سلام! مگر ببو ہٹا دیں۔ صرف جان بہت

مناسب رہے گا۔'' بھاری بھرکم آواز...... شرارت ٹپکاتا ہشاش بشاش لہجہ...... اتباع نے بوکھلا کر سیل فون کان سے ہٹا کر اسکرین کو گھورا۔ نمبر بہرحال بریرہ کا ہی تھا۔ وہ ہکا بکا سی کھڑی تھی۔ عبداللہ تو نہیں ہوسکتا تھا۔ جانتی تھی کئی برسوں سے بغرض تعلیم انگلینڈ میں مقیم تھا۔ کمپیوٹر کی دنیا میں جانے کون کون سے کارنامے انجام دے چکا تھا۔ اور کتنی ڈگریاں حاصل کر چکا تھا۔ اس نے متعدد بار اتباع سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ مگر اتباع کے گریز کی بدولت یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی تھی۔

''اتباع...... اتباع پلیز کال ڈسکنکٹ نہ کیجیے گا۔ آپ سن رہی ہیں؟'' وہ پکار رہا تھا۔ اتباع نے چارو ناچار فون پھر کان سے لگایا۔

''مم...... میں اماں سے بات کراتی ہوں آپ کی۔'' وہ گڑبڑائی۔ رشتے کی نزاکت کا خیال تھا۔ جب ہی رابطہ کاٹ بھی نہیں سکی۔

''نہیں اتباع! مجھے بو سے نہیں آپ سے بات کرنی ہے۔'' اب اس کے اس لہجہ جتلاتا ہوا خفگی آمیز تھا۔ اتباع کا دل دھک سے رہ گیا۔

''ک...... کیا بات......؟'' اس کا سانس اس کے سینے میں اٹک گیا گویا۔

''میں نے امن سے کہا تھا۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے...... مگر معلوم ہوا آپ بات نہیں کرنا چاہتیں...... وائے اتباع......؟ اس کا لہجہ آنچ دیتا ہوا تھا۔ وہ حواس باختہ کھڑی رہ گئی۔

''بولو اتباع۔'' اب کے وہ اچھا خاصا خفا ہوا تھا۔ اتباع اس کی خفگی کے خیال سے ہراساں ہوئی۔

''آپ جانتی ہیں اتباع! آپ نے ہمیشہ سے مجھے اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ میں آپ کے بغیر یہاں کیسے وقت گزار رہا ہوں آپ کبھی اندازہ نہیں کرسکتیں۔''

اس کا لہجہ گھمبیر تھا مگر بے باک بھی۔ وہ کتنی بے نیازی سے اسے اتنی فضول بات بتا رہا تھا۔ اتباع سرتاپا کانپ اٹھی۔ فون کان سے ہٹا کر اس نے لرزتی انگلیوں سے رابطہ منقطع کیا اور موبائل بستر پہ پھینک کر خود باہر بھاگ گئی۔ اس کا دل اتنی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ گویا کسی بھی پل پسلیاں توڑ کر باہر آگرے گا۔ وہ کچن میں آئی تب بھی اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ عبیر نے اسے حیرانی سے دیکھا تھا اور سلاد کاٹنا ترک کر کے تشویش ظاہر کی۔

''خیریت بیٹے! طبیعت ٹھیک ہے؟'' اتباع نے چونک کر انھیں دیکھا۔ گھبراہٹ یکلخت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے بے اختیار نظریں چرالیں۔

''کچھ نہیں امی جان! لائیں یہ میں کر لیتی ہوں۔ روٹی بھی ڈال لوں گی۔ آپ ذرا آرام کرلیں۔''

''ارے نہیں بیٹے! یہ سب کام تو لاریب نے ہی کیے ہیں۔ میں نماز پڑھ کر ابھی آئی ہوں کچن میں۔''

انھوں نے محبت سے جواب دیتے اس کا گال سہلایا۔ وہ سر ہلا کر فریج سے دہی کا باؤل نکال کر رائتہ بنانے کی تیاری کرنے لگی۔

''یہ بھائی جان تو وہاں جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ لگتا ہے دل لگ گیا ہے وہاں۔''

موضوع بدلنے کی غرض سے وہ دانستہ مسکرا کر بولی تھی۔ عبیر کے چہرے پر محبت کا نرم تاثر عبدالعلی کے تذکرے پہ گہرا ہونے لگا۔

''پہلی بار گیا ہے وہاں۔ قدر کو بھی اب ہی دیکھے گا بڑے ہونے پہ۔ اللہ کرے واقعی دل لگ جائے دونوں کا۔ ایک دوسرے سے۔'' ان کے انداز میں محبت تھی۔ اتباع شرارت بھرے انداز میں مسکرانے لگی۔

''فکر کی ضرورت ہی نہیں ہے امی جان! نہ تو بھائی جان میں کوئی کمی ہے۔ نہ ہی قدر ایسی ہے کہ اسے ٹھکرایا جائے۔'' اس کا لہجہ پُریقین تھا۔ عبیر نے

دل ہی دل میں 'آمین' کہا تھا۔

''عبدالعلی بہت سوبر اور میچور ہیں نیچر وائز اور قدر تھوڑی امیچور ہے۔ مگر اللہ بہتر کرے گا انشاء اللہ!'' وہ شفقت بھرے انداز میں دونوں کا تجزیہ کررہی تھیں۔

''بس ٹھیک ہے۔ پھر ذرا جلدی سے ان کی شادی کردیجیے گا۔ تاکہ گھر میں کچھ تو خوشگوار تبدیلی آئے۔'' مسکرا مسکرا کر کہتی وہ ہرا دھنیا کاٹ رہی تھی۔ عبیر نے سر اٹھا کر اسے قدرے شرارت سے دیکھا تھا۔

''عبدالعلی شاید اتنی جلدی شادی پر آمادہ نہ ہوں۔ البتہ تمہاری کرنے میں حرج نہیں۔ عبداللہ بھی آگئے ہیں اب تو پاکستان...... اتباع کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔ اس نے سٹپٹا کر عبیر کو دیکھا تھا۔ جو اپنے کام میں مگن تھیں۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی کیفیت پہ قابو پانا چاہا مگر دل اپنی رفتار بھول رہا تھا۔

''مم...... میں اماں سے پوچھتی ہوں...... وہ چائے پئیں گی؟'' اسے اور کچھ نہ سوجھا تو گھبرا کر کہتی کچن سے نکل گئی۔ لاریب ہال کمرے میں تھیں۔ سیل فون کان سے لگا ہوا تھا۔ گفتگو کا جوش وخروش دوسری جانب کسی خاص اور اہم شخصیت کی گواہی دیتی تھی۔

''ارے میری جان! میرے بیٹے! ایسا کیوں سوچتے ہو۔ میں نے کہا ناں...... تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ ایسا بھلا ممکن ہے؟

''اماں......'' وہ ان کے سامنے آگئی۔

''کون ہیں......؟ بھائی جان......؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''نہیں...... نہیں بیٹے! یہ اتباع آگئی ہے۔ لو اس سے خود بات کرو۔'' لاریب نے مسکراتے ہوئے فون اسے تھمایا۔ جسے اشتیاق آمیز انداز میں لیتے ہی اس نے کان سے لگا لیا تھا۔

''بھائی جان......! آپ وہیں کے ہوگئے ہیں...... واپس کیوں نہیں آجاتے؟''

وہ چھوٹتے ہی شوخی سے بولی تھی۔ دوسری جانب چند ثانیوں کو خاموشی چھا گئی۔

''یہ مختلف اور فضول رشتوں کی بیخ ضرور لگانی ہوتی ہے آپ نے مزا کرکرا کرنے کو...... صرف جان کہیں گی تو ہم بھی تھوڑا سا خوش ہوجائیں گے۔ اور سنیں محترمہ ہم کہیں کے نہیں ہوئے ماسوائے آپ کے اور واپس تو آگئے ہیں۔ مگر آپ کا دیدار پھر بھی نصیب نہیں ہورہا۔''

دوسری جانب بلا کی شوخی اور شرارت، برجستگی اور شکایت کا حسین امتزاج تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس نے گھبرا کر اس قدر غیر یقینی سے لاریب کو دیکھا۔ جو مسکراتی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''کرو نا بات بیٹے!'' ان کی مسکان گہری ہوئی اور اس کا رنگ فق۔

''اماں...... یہ...... یہ عبداللہ ہیں۔ بھائی نہیں۔'' وہ بامشکل کہہ پائی تھی۔ لانبی پلکیں دہکتے گالوں پر لرز اٹھی تھیں۔

''آئی نو بیٹا! جانتی ہوں...... آپ بات کرو...... وہ شکوہ کررہا ہے۔ آپ اس سے بات کررہی ہیں۔'' لاریب کے لہجے میں اصرار بھی تھا۔ نرمی ومحبت بھی۔ اتباع کا دل عجیب سے غبار سے بھرنے لگا۔

''میں نہیں کرسکتی ہوں اماں! مجھے شرم آرہی ہے۔ مجھے اچھا بھی نہیں لگ رہا۔''

اس نے فون انھیں واپس کیا اور خود باہر چلی گئی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی۔ انھوں نے عبداللہ کو کیسے قائل کیا۔ اس کے دل میں عجیب سا احساس کروٹیں لے رہا تھا۔ ان کی تربیت جس انداز میں ہوئی تھی۔ اس میں اس قسم کی باتوں کی نہ خواہش

رہی تھی نہ ہی ضرورت عبداللہ اس کا منگیتر ہے۔ یہ بات وہ ایک عرصے سے جانتی تھی۔ ہر خاص و عام موقع پر بریرہ اور ہارون کا اسے اہمیت و فوقیت دینا، بیش قیمت تحائف سے نوازنا...... امن کا اور عبدالاحد کا بات بے بات عبداللہ کے حوالے سے اسے چھیڑنا اسے کبھی بھی بُرا نہیں لگتا تھا۔ اچھا لگتا تھا مگر جب امن نے اسے یکے بعد دیگرے عبداللہ کے بھیجے ہوئے تحائف یعنی سیل فون اور لیپ ٹاپ دینے چاہے تو اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

"مگر کیوں اتباع! اس میں بھلا کیا حرج ہے؟" امن نے بھرپور احتجاج کیا تھا۔ حالانکہ اتباع اور امن کی سوچوں میں معمولی سا بھی فرق نہیں تھا۔ اتباع اگر عبدالغنی کی بیٹی تھی۔ تو امن بریرہ کی آغوش میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی تھی۔ اس کے خیالات سوچ اور عمل سے بریرہ کی بردباری اور اخلاص جھلکتا تھا۔ وہ بریرہ کا دوسرا عکس تھی۔ مگر شاید یہاں بھائی کی دل آزاری کے خیال سے اسے قائل کرنے میں لگ گئی تھی۔

"حرج ہے امن! بہت حرج ہے۔ انھیں قبول کرنے کا مطلب ہی یہی ہوگا کہ میں نے ان کے ساتھ کانٹیکٹ کو قبول کیا ہے۔ معذرت...... میں نہ تو ان سے فون پر لمبی لمبی گفتگو کر سکتی ہوں۔ نہ ہی اسکائپ پہ آن لائن ہوں گی۔ وجہ تم جانتی ہو۔ سو مجھے سمجھانے کی بجائے یہ بات اپنے بھائی کو سمجھا دینا۔ اگر وہ اس رنگ میں نہ رنگ چکے ہوں گے تو یقیناً قائل ہو جائیں گے۔"

امن خاموش ہو گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے عبداللہ کو کیسے اور کن لفظوں میں اس کی بات پہنچائی تھی کہ عبداللہ اس سے بات کرنے کو مچل اٹھا تھا۔ مگر اتباع نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ اس کے بار بار نمبر ٹرائی کرنے پر اتباع نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔ اگلے دن اس نے موبائل آن کیا تو عبداللہ کا میسج اس کا منتظر تھا۔

"آپ صرف میری فیانسی نہیں ہیں اتباع! آپ میری کزن بھی ہیں۔ ہمارا ڈبل بھی نہیں ٹرپل رشتہ ہے۔ کیسے اگنور کر سکتی ہیں مجھے۔"

اتباع گہرا سانس بھر کے رہ گئی پھر کچھ سوچ کر اس نے ایک میسج اسے ٹائپ کر کے بھیج دیا تھا۔

"بات آپ ان رشتوں کی نہ کریں۔ میں اللہ کی مقررہ حدود کو نہیں پھلانگ سکتی۔ منع کرنے کا سبب اس کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ جائیں گے۔"

اسی لمحے اسکرین عبداللہ کے پیغام سے پھر روشن ہو گئی تھی۔ وہ حیران رہ گئی اتنی جلدی جواب پہ اس نے اسکرین پہ لہراتے خط کے لفافے کو کلک کیا۔ میسج اوپن ہو گیا تھا۔

"آپ بہت ظالم ہیں اتباع! خیر یہ حساب کتاب بعد کے لیے رکھ چھوڑتا ہوں۔ فی الحال آپ کی خواہش کا احترام کر رہا ہوں۔ خوش رہیے۔"

اتباع نے اگلے لمحے میسج ڈیلیٹ کر ڈالا۔ اس کے جسم کا سارا خون اچھل کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ جیسے اسے عبداللہ کی یہ بے باکی بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کے بعد اس کی جانب سے خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ خود دوبارہ بھی اس سے مخاطب نہیں ہوا۔ البتہ لاریب، بریرہ یا پھر امن کے ذریعے اپنی بے قراری یا کوئی بھی شوخ و شنگ فقرہ اس تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ جسے ایک بار امن نے اس سے ایک شرارت سے کہا تھا۔

"بھائی کہہ رہے ہیں اتباع! وہ تمہاری پابندیوں کی وجہ سے پردیس میں بے حد روکھی اور بے رونق زندگی گزار رہے ہیں۔ جس کا پورا پورا حساب تم سے آ کر ضرور کریں گے۔ اور تب تم

کچھ نہ کرسکو گی۔'' اور وہ اتنی شرمسار ہوئی تھی کہ کتنے دن اس سے امن سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ بلکہ وہ الٹا اسی سے اُلجھ گئی تھی۔

''تمھیں شرم نہیں آتی ہے امن! اتنی فضول باتیں مجھ سے کرتے ہوئے؟''

''بھئی مجھے شرم کیوں آئے گی۔ میں تو میسج کنوے کرتی ہوں۔ سمجھ لو ایک مشین ہوں۔ ایک کنوبر ہوں جس کا کام بس فرض نبھانا ہے۔ ہاں بھائی سے پوچھ لوں گی انھیں آتی ہے شرم۔''

اور اتباع اتنا جھلائی تھی کہ اسے مارنے کو دوڑ پڑی۔ اسی قسم کے اور لاتعداد مظاہرے اس کی بے صبر اور بے مہاری کے جن سے اتباع اب تک بس دانت کچکچاتی تھی۔ تلملاتی تھی۔

☆......☆......☆

عبدالعلی کے پہنچنے سے قبل اس کا کارنامہ علیزے کی زبانی ان تک پہنچ گیا تھا۔ ساتھ میں سفارش بھی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

''پلیز بھائی عبدالعلی کو ڈانٹیے گا نہیں۔ اس کا جذبہ تو قابل قدر ہے۔ مجھے تو بہت اچھا لگا۔ ہمارے خاندان میں دور نزدیک کوئی فوج میں نہیں ہے۔ یقین کریں یونیفارم میں اتنا اچھا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔''
اور لاریب گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

''ساسو ماں کی سفارش نہ لاتے تو ہم نے جیسے فوج سے واپس کھینچ لانا تھا۔ حد ہے بیٹے تم سے بھی۔'' عبدالعلی پہنچا تو لاریب نے اسے کان سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ہنستا ہوا ان کے گلے میں بانہیں ڈال گیا۔

''سچی بات ہے ماں جی! اتنی آسانی سے چھوٹتا بھی نہیں۔ بوجانی کو مان لیا ہے میں نے۔'' وہ بات بے بات چہک رہا تھا۔ لاریب اور عبیر کے ساتھ۔ اتباع نے بھی اسے معنی خیزیت سے دیکھا۔

''کس کو مانا ہے یہ بھی صحیح اگلو۔ علیزے کو یا قدر کو......؟'' لاریب نے اس پہ گرفت کی تو وہ اپنی جگہ پر اچھل پڑا تھا اس الزام تراشی پہ۔

''میں کیوں اسے مانوں گا۔ سڑے کریلے جیسی لڑکی ہے۔'' اس نے ناک چڑھائی۔

''جی ہاں! اب تو بھائی جان ایسے ہی کہیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں گئے تو واپس لوٹنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ یہ دل کس سے لگا تھا جیسے ہمیں تو خبر ہی نہیں ناں۔''

اتباع کو اسے چھیڑنے میں مزا آنے لگا۔ عبدالعلی نے کاندھے اچکا دیے۔

''لگاتی رہو الزام۔ جب اس میں کوئی صداقت نہیں تو مجھے دل پہ لینے کی کیا ضرورت۔ کیوں پارٹنر؟'' اس نے عبدالاحد کو ہمنوا کرنا چاہا۔ جو مشکوک انداز میں الٹا دانت نکالنے لگا۔

''اماں میں کہہ رہی ہوں ناں۔ دال میں کچھ کچھ کالا ہے۔ بس بھائی جان کا سہرا سجانے کی تیاری پکڑیں۔'' اتباع نے بات کو طول دیا تھا۔ عبدالعلی نے جواباً اسے شرارتی نظروں سے دیکھا۔

''سہرے کے پھول کس کے سجنے ہیں یہ تمھیں ابھی معلوم نہیں ہے۔ عبداللہ صاحب تشریف لے آئے ہیں پاکستان...... اور سنا ہے شادی کے لیے خاصے اتاولے ہیں۔ آج چائے پہ تشریف لانے والے ہیں کسی ایسے ہی ارادے سے...... تمھیں تو یہ بھی خبر نہیں ہوگی۔''

اس کا انداز تاؤ دلانے والا تھا۔ چھیڑتا ہوا شرارت کا رنگ لیے۔ اتباع نے بوکھلا کر، گھبرا کر پہلے اسے پھر باری باری سب کو دیکھا۔ سبھی چہروں کی بھرپور تائیدی مسکان اس کے اوسان خطا کرنے کو کافی تھی۔

(لفظ لفظ مہکتے اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ جولائی میں ملاحظہ فرمائیے)

راہیں محبت کی

''میں پتھر نہیں ہوں ثناء! تمہاری طرح جیتی جاگتی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی گوشت سے بنا دل دھڑکتا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں اپنی نانی کے ساتھ رہتی ہوں اور اپنے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہوں مما پاپا کو اپنی محبت......

محبت کے رنگوں سے مزین ایک خوبصورت ناولٹ

''لڑکیاں کتنی عجیب ہوتی ہیں؟ اور ان کے دل ان سے زیادہ عجیب وغریب ہوتے ہیں ماں باپ کی عزتوں کو سر عام پامال کرنے والی لڑکیاں محبت کے نام پر جو مشغلہ اپنائے ہوئے ہیں وہ خود ان کی زندگیوں میں کیسا وائرس پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں۔'' وہ سختی سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔

''اُف...... توبہ ہے تم پھر شروع ہوگئیں ۔کیسا وائرس...... تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں تم ہمیشہ ایک ہی رُخ پر کیوں سوچتی ہو۔'' ثناء اپنے نوٹس ایک طرف رکھ کر ہاتھ میں پکڑے برگر کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔۔

''وہ وائرس جو محبت کے نام پر آج نوجوانوں کی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے...... خود کو ضائع کرنے کے لیے اس سے بہتر تفریح ان کے پاس کوئی اور نہیں اب بتول کو ہی دیکھ لو شکل سے کتنی معصوم لگتی ہے باتیں بھی ایسی بھولی بھالی کے دل موہ لیں چار موبائل میں چھ سمیں ہیں اس کے پاس...... کل تم کو کیسے فخر سے اپنی چھٹی محبت کے قصے سنا رہی تھی اور یہ بھی کہ اس نے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے ہونہار طالب عظیم اور اس کے کزن کو بیک وقت اپنی محبتوں کے جال میں پھانس رکھا ہے اور ان سے جو تحائف سمیٹتی ہے وہ الگ...... اب بتاؤ تم اسے محبت کہتی ہو۔'' وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی یہ ایک واحد موضوع تھا جس پر دونوں کا اختلاف ہو جاتا تھا۔

''ایک بتول کے علاوہ اور بھی کتنی لڑکیاں ہیں۔ تم سب کے جذبات کو ایک ہی ترازو میں نہیں تول سکتی یہ تو آفاقی جذبہ ہے جو بن چاہے دل میں اتر جاتا ہے جن لوگوں کا تم ذکر کر رہی ہو وہ محبت نہیں فلرٹ کرتی ہیں۔ وہ بات کو خوشگوار بناتے ہوئے بولی۔

''معلوم نہیں ثناء فلرٹ کرتی لڑکیوں کو دیکھ کر

میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ پھر زبان انگارہ بن جاتی ہے، دل چاہتا ہے لائن میں کھڑا کر کے ایسے لوگوں کو کس کس کے کوڑے لگاؤں۔ جنہوں نے محبت کے نام پر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا شروع کر رکھا ہے...... ویسے تم ہمیشہ محبت کے حق میں دلائل اس لیے دیتی ہو کہ خود اس میں مبتلا ہو۔'' احساس محرومی بوند بوند بن کر اس کے لفظوں سے گر رہا تھا۔ نجانے کیوں اس نے اپنی باتوں کا رُخ بے خیالی میں ثناء کی طرف موڑ دیا۔

''ہاں میں تمہاری طرح کٹھور نہیں، تمہاری طرح میرے سینے میں دل کی جگہ پتھر فٹ نہیں ہے بھلا ان باتوں کا تم پر اثر کیوں ہونے لگا......'' ثناء کو اس کی بات ناگوار لگی اور اُس نے رُخ پھیر لیا۔

پھر وہ رُخ پھیر کر بولی تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد اسے اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا ہالہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئیں تھیں۔ ثنا نے اپنے کندھے پر سر رکھا اور اس کا ہاتھ جلدی سے تھام لیا۔

''کیا ہوا ہالہ! کیوں رو رہی ہو؟''

''میں پتھر نہیں ہوں ثناء! تمہاری طرح جیتی جاگتی انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی گوشت سے بنا دل دھڑکتا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں اپنی نانی کے ساتھ رہتی ہوں اور اپنے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہوں مما پاپا کو اپنی محبت کی شادی کے چار سال بعد احساس ہوا کہ انہوں نے شادی کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے اور پھر دونوں کے متفقہ فیصلے کے بعد پاپا نے مما کو طلاق دے دی۔ ان دونوں کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ دو سال کی بچی پر اِس بات کا کیا اثر پڑے گا۔ میں تو بچپن سے ہی محبت کے سائے سے محروم کر دی گئی ہوں۔ مما پاپا دونوں نے شادیاں کر لی ہیں ان کی اپنی اولادیں ہیں۔ مما انگلینڈ میں اپنے شوہر اور تین بچوں کے ہمراہ نئی زندگی کا جشن مناتی ہیں۔ مجھے نانی کو سونپ کر ان کی اکیلی زندگی پر احسان جتاتی ہیں اور پاپا...... جنہوں نے پلٹ کر کبھی خبر نہیں لی اور مما بس چھ ماہ میں ایک بار فون پر Contact کر لیتی ہیں لیکن پاپا......'' وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی ثناء اس کی کئی دفعہ کی دہرائی گئی باتوں پر غمزدہ ہو گی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا ڈپریشن میں کرتی ہے۔

''چپ ہو جاؤ ہالہ! مجھے معاف کر دو مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''ایسے مت کہو ثناء! تمہارا کیا قصور؟'' اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

''اب اپنے اسائمنٹ کی تیاری شروع کرتے ہیں۔ ورنہ ممی کہیں گی ایک گھنٹے کی کمبائن اسٹڈی کا کہہ کر جاتی ہے اور دو تین گھنٹے بعد واپس آتی ہے۔'' وہ اس کا موڈ بدلنے کی غرض سے بولی۔

''نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا، کل شروع کریں گے۔'' ہالہ سنجیدگی سے بولی۔

''اچھا چلو ایک ماہ بعد ہمارا فائنل سمسٹر شروع ہونے والا ہے اور دو دن بعد اس اسائمنٹ کو جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔ یاد ہے نہ چلو اب میں چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔'' وہ اسے تاکید کرتے ہوئے دروازے تک پہنچی تھی۔ ثناء کا گھر ہالہ کے گھر سے قریب تھا۔ ثناء کے جانے کے بعد وہ بجھے دل سے کتابیں سمیٹنے لگی۔

☆......☆......☆

''کیا...... تم جاب کرو گی۔'' ثناء چیخی۔

''ہاں...... میں MBA کر کے گھر میں بیٹھ کر جھک نہیں مارنا چاہتی۔ وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے اپنی صلاحیتیں استعمال کی جائیں۔'' ہالہ اپنے چہرے پر بکھری مخصوص سنجیدگی سے بولی۔ ساتھ ہی ٹرالی میں رکھی کافی اور دیگر لوازمات اس کی طرف بڑھانے لگی۔

''مگر ہالہ تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے۔ اتنا بڑا گھر، بنک بیلنس، جائیداد سب ہی کچھ نانی نے تمہارے نام کر رکھا ہے۔ پھر جاب کرنے کا کیا جواز بنتا ہے۔ وقت پاس کرنے کے لیے کئی مشاغل پڑے ہیں بلاوجہ جاب کی خواری سر لے رہی ہو۔'' ثناء نے الجھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں جاب پیسوں کے لیے نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اپنی صلاحیتیں آزما کر اپنی پہچان بنانی ہے میں ہالہ علی ربانی...... علی ربانی جیسے بڑے تاجر کی بیٹی۔

یا ایک بڑی ویلفیئر چلانے والی ماہ نور کی بیٹی......

میں ان ناموں سے الگ رہ کر اپنی شناخت بنانا چاہتی ہوں...... بہت رہ لی اپنی نانی جان کے شفقت کے سائے میں۔ اب زندگی کی کڑی دھوپ کا مزہ لینا چاہتی ہوں......'' ثناء نے دیکھا وہ پھر ڈپریشن کی طرف جا رہی تھی۔

''یار فکر کیوں کرتی ہو میں ہوں نا تمہارے ساتھ تمہارا باڈی گارڈ مس ثناء۔ یہ باڈی گارڈ زندگی کی آخری سانس تک تمہیں الوداع نہیں کہے گا۔ وہ سینہ ٹھوکتے ماحول خوشگوار بنانے لگی کہ ہالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''تو پھر اپنی ممی سے اجازت لے لینا میں نے آج اخبار میں کچھ Vacancies دیکھی ہیں کل انہیں جگہوں پر قسمت آزمانے چلیں گے۔ صبح آٹھ بجے تیار رہنا ورنہ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو میں وقت کی کتنی پابند ہوں۔ جس حلیے میں موجود ہو گی اسی میں اٹھا کر لے جاؤں گی۔ اس نے دھمکی دی۔

''کل...... وہ بھی آٹھ بجے...... کچھ تو مجھ غریب پر رحم کرو رزلٹ آئے دو دن تو ہوئے ہیں۔ کم از کم مہینہ بھر آرام تو کر لینے دو۔'' ثناء نے مسکین شکل بنائی۔

''میں تمہاری کوئی فضول بات نہیں سنوں گی۔ بس کل چلنا ہے تو یہ بات ڈن اینڈ فائنل ہے۔ Understand اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

☆......☆......☆

''کیا چیز ہو تم ہالہ! انہوں نے تو تمہیں ساری Qualification دیکھے بغیر رکھ لینا ہے۔ سارا حسن اللہ نے تمہیں سونپ رکھا ہے۔ ہم غریب ذرا لیٹ ہو گئے اس لیے رہ گئے۔ اوپر سے نہ تم نے مجھے ناشتہ کرنے دیا نہ بال بنانے دیے۔ منہ پر ایسی پھٹکار برس رہی ہے کہ الامان!'' ثناء چیخی۔

وہ ثناء کی باتوں کی پروا کیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے تیز تیز قدم پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا رہی تھی۔

''میں نے تمہیں آٹھ بجے تیار رہنے کا کہا تھا یا نہیں۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سکون سے بولی۔

''دوپہر کے ایک بجے اٹھنے والی لڑکی سے محترمہ فرما رہی ہیں کہ آٹھ بجے تیار ہو جانا وہ تو شکر ہے کپڑے بدل لیے تھے۔ ورنہ نائٹ سوٹ

میں انٹرویو دیتی ہوئی حور پری ہی لگتی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر جل کر بولی جو اس کی طرف نگاہ ڈالے بغیر اطمینان سے گاڑی چلانے میں مصروف تھی، پھر اس نے اپنا پرس کھولا اور ہلکا پھلکا میک اپ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

''نماز پڑھی تھی آج تم نے۔'' ہالہ اسے ترچھی نظروں سے دیکھ کر تفتیشی انداز میں بولی۔

''کون...... سی...... نماز وہ ہکلائی۔

''فجر کی نماز۔'' ہالہ نے اپنا ہمیشہ کیا جانے والا سوال دہرایا۔

''کیا کروں یار آنکھ نہیں کھلتی میری۔ وہ لاپرواہی سے بولی۔

''ثناء نماز پڑھنے سے انسان کے اندر بہت سی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نہ صرف خوبیاں بلکہ انسان کی زندگی میں آسانیاں بھی پیدا ہونے لگتی ہیں۔ جیسے وقت کی پابندی۔

آج اگر تم نے فجر کی نماز ادا کی ہوتی تو آج ہونے والی خواری سے بچ جاتی۔ آنٹی کیا سوچتی ہوں گی۔ میں تمہیں یوں ناشتہ کیے بغیر اٹھا لائی ہوں۔

''تمہاری آنٹی میری ہٹلر نما دوست سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہ بھی کہ تم وقت کی کتنی پابند ہو۔ وہ تو مجھے خود تمہاری مثالیں دے دے کر ڈسپلن کی تلقین کرتی ہیں۔ مگر میں کیا کروں نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیشہ ایک افراتفری کا شکار رہتی ہوں۔ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں قصور میرا ہی ہے۔ بے شک نماز انسان میں بے شمار مثبت تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ میں کوشش کروں گی تمہاری طرح نماز کی پابند بن جاؤں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ گاڑی ایک وسیع بلڈنگ کی پارکنگ میں جا پہنچی تھی۔

''یہاں انٹرویو سے فارغ ہونے کے بعد قریبی کسی ریسٹورینٹ میں لنچ کو چلیں گے۔'' ہالہ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی اسے اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔

''اُف خدایا کتنی بڑی تعداد انٹرویو کے لیے آئی ہے۔''

ثناء ہالہ نما کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک کھچا کھچ لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے بولی ان دونوں نے اپنی درخواست کے ساتھ منسلک دیگر لوازمات کاؤنٹر پر موجود شخص کے حوالے کیے اور وہ لوگ کارنر پر جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئیں۔

''ہالہ مجھے تو ابھی سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ جانے اپنی باری کب آئے۔ بھوک کے مارے میرا برا حال ہو رہا ہے۔''

''فی الحال خاموشی سے بیٹھی رہو اور یہ لو۔'' ہالہ نے پرس سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

ثناء کہاں چپ رہنے والی تھی۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی سے گپیں لگانا شروع کر دی۔ ساتھ ہی برے برے منہ بنا کر بسکٹ کھائے جا رہی تھی۔ ساتھ والی لڑکی نے اسے جوس کی آفر کی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا۔

تین گھنٹے بعد ہالہ کا نام پکارا گیا۔

''مے آئی کم ان سر؟''

یس...... پلیز سٹ ڈاؤن!''

ہالہ دھیرے سے قدم اٹھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ سات افراد کو اپنے سامنے موجود پا کر وہ لمحے بھر گھبرا سی گئی تھی۔ سات افراد کے درمیان بیٹھے ایک نہایت پر وقار اور معزز شخص نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

''مس ہالہ! آپ ایک آفیسرز سیٹ کے لیے خود کو کیسے اہل سمجھتی ہیں۔ جبکہ آپ کا تجربہ زیرو ہے اور آپ نے صرف آفیسرز سیٹ کے لیے ہی اپلائی کیا ہے۔ آپ فریش MBA ہیں لیکن نا تجربہ کار ہیں آپ نے آزمائشی طور پر کسی اور سیٹ کے لیے اپلائی کیوں نہیں کیا؟
وہی آدمی دوبارہ بولا تھا۔ کچھ دیر رکنے کے بعد ہالہ نے جواب دیا۔

''سر پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا تجربہ زیرو ہے لیکن میری صلاحیتیں زیرو نہیں ہیں۔ چونکہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسہ ہے۔ اس لیے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میں اس سیٹ کے لیے موزوں ہوں۔''

''اتنی کم عمری میں خود پر اتنا بھروسہ۔'' ایک شخص اور بولا۔

''آزمائش شرط ہے سر۔'' وہ خود اعتمادی سے بولی۔

''یہ بتائیں ایک آفیسر ہونے کی حیثیت سے آپ اپنے ماتحتوں میں سب سے اہم اور پہلی خوبی کون سی دیکھنا چاہیں گی اور کیوں؟ ان میں سے ایک نے سوال کیا۔

''سر! وقت کا احساس...... اس لیے جو وقت کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے تمام کاموں میں ڈسپلین آجاتا ہے۔ یہی احساس انسان کو محنتی اور ایکٹیو بنا دیتا ہے۔ اسی شخص نے ہالہ سے مزید چند سوال کیے اور پھر بولا۔

''ٹھیک ہے مس ہالہ! ہم آپ کو دس پندرہ دن میں انفارم کردیں گے کہ آپ کا سلیکشن ہوا یا نہیں۔ تھینک یو فار کمنگ!''

وہ بھی تھینک یو کہہ کر باہر آگئی۔ باہر آکر اس نے ایک گہرا سانس لیا تھوڑی دیر میں ثناء کو بلایا گیا پھر وہ پندرہ منٹ میں اس کے روبرو تھی۔ وہ دونوں باہر نکل کر ایک قریبی ریسٹورینٹ پہنچ گئیں۔

''اب کہاں چلنا ہے، ایمان سے میرا دل مزید کسی انٹرویو جیسے جن کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔'' ثنا برگر کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے پھر گھر ہی چلتے ہیں۔ ہالہ نے ہاتھ میں پکڑی نیوز پیپر کی کٹنگ واپس پرس میں رکھتے ہوئے بولی، جس کا وہ مطالعہ کررہی تھی۔

''ویسے بائے داوے کیا خیال ہے۔ اتنی بڑی کمپنی میں ہماری دال گلے گی۔''

چانس ہے کھچڑی پک جائے۔ اصل میں اس کمپنی کی دو تین فیکٹریاں ہیں اور وہ اپنی گارمنٹ کی نیو برانچ یہاں کھولنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی برانچ فیصل آباد میں بھی ہے یہ لوگ اپنا مال ایکسپورٹ بھی کرتے ہیں۔ اپنی اس نئی برانچ کے لیے انہیں ایک نئی فریش ٹیم درکار ہے۔ اس لیے چانس ہے...... بہرحال کل ایک دو جگہ اور انٹرویو کے لیے چلنا ہے کہیں نہ کہیں قسمت کھل ہی جائے گی۔ تم ٹائم پر ریڈی رہنا او کے۔'' ہالہ کولڈ ڈرنک ختم کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ اس کی معلومات پر ثناء کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ جانتی تھی ہالہ کے جنون سے...... وہ جس کام کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

شام کو ہالہ گھر پہنچی تو دیکھا ثناء کو بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ ایک ہفتہ اسی میں نکل گیا ثناء کے بغیر ہالہ کا بھی کہیں جانے کو دل نہ مانا...... ہالہ کی طرح ثناء بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔

نازوں سے پلی لڑکی ثناء کو ہالہ کا ساتھ اس قدر بھاتا تھا کہ کسی اور کی طرف دوستی کی نگاہ تک نہ ڈالی۔ دونوں کراچی کے پوش علاقے ڈیفنس میں رہائش پذیر تھے۔ نانی کی محبت کے علاوہ ہالہ نے ثناء کی دوستی کو بھی بہت اپنائیت سے اپنایا تھا۔ چند سال پہلے وہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے تو چلبلی سی ثناء نے ہالہ کی ویران سی زندگی میں سارے رنگ بھر دیے۔ ثناء کے والدین کویت سے یہاں سیٹل ہوئے تھے۔ ثناء اور ہالہ کی پہلی اتفاقیہ ملاقات نے جلد ہی دوستی کا روپ دھار لیا تھا۔ کراچی اس کے لیے انجان شہر تھا۔ ہالہ ڈرائیونگ جانتی تھی۔ وہ اکثر گھنٹوں اسے شہر کے مختلف مقامات پر اسے گھماتی پھراتی رہتی۔ نانی امی بھی ثناء سے بہت خوش تھیں کہ جس کے آنے سے ان کی نواسی کی زندگی میں کچھ خوشیاں در آئی تھیں۔ وہ ہونٹ جو دھیمی مسکراہٹ سے بھی نا آشنا تھے۔ اب کھلکھلانے لگے تھے۔ ثناء کی شوخی، شرارتیں ہالہ کی خزاں آلود زندگی میں بہار لے آئے تھے۔ وہ دونوں کالج کے بعد یونیورسٹی میں بھی ایک ساتھ تھے۔ اب دونوں MBA شاندار نمبروں سے پاس کر چکی تھیں۔ ہالہ ابھی کسی اور جگہ اپلائی کا سوچ رہی تھی کہ ان دونوں کا ہی اپائمنٹ لیٹر آ گیا۔ ایک ہفتہ بعد ان کو آفس جوائن کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔:

''مجھے لگتا ہے ان لوگوں کی آنکھوں میں Defect ...... ہے ویسے بھینگی آنکھوں والا آدمی کوئی نظر تو آیا نہیں لیکن آئی ایم شیور میرے الٹے سیدھے دیے گئے جوابات ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ جاب ...... او مائی گاڈ ...... اور ہاں یاد آیا میں نے تو اپنی درخواست میں کسی بھی سیٹ کے لیے اپلائی نہیں کیا تھا بلکہ لکھا تھا'' جہاں دل چاہے وہاں رکھ لیں'' اور ان صاحبان نے سیکریٹری کی سیٹ ایسے تھالی میں سجا کر دی ہے جیسے میرے علاوہ اس کرہ ارض پر کوئی اور مخلوق اس سیٹ کے لیے موزوں ہی نہیں تھی۔'' ثناء ہاتھ میں لیٹر تھامے شادی مرگ کی کیفیت میں تھی۔

''ہو گئی تمہاری نان اسٹاپ تقریر ختم۔'' ہالہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کی بے تکی باتیں سنتے ہوئے بولی۔ پھر کچھ لمحے بعد اسے شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تمہیں کیا معلوم انہیں تمہاری کون سی ادا بھا گئی ہو...... ویسے بڑے جہاندیدہ لوگ ہوتے ہیں یہ پہلی نظر میں بھی بھانپ لیتے ہیں کہ سامنے والا کتنا صلاحیت مند ہے۔ اب کیوں کفران نعمت کر رہی ہو؟''

''او مائی گاڈ! میرے تمہارے ڈیمیاٹمنٹ تو بالکل الگ ہیں۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔ نہ بابا نہ اگر تم ساتھ نہ ہو گی تو مجھے جاب گوارہ نہیں ویسے بھی اس دن انٹرویو نے ایک ہفتہ کے لیے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔ نہ جانے روز روز یہ جاب کی خواری کیا رنگ دکھلائے گی۔ اس نے اپنا لیٹر دیکھ کر کہا۔

''تم پھر شروع ہو گئیں اب بکومت...... بی بریو! دیکھو وقت کا خاص خیال رکھنا۔ انہوں نے ہمیں لیٹر میں نو بجے سے پہلے آنے کی سخت تاکید کی ہے۔'' ہالہ نے اس کی ہمت بڑھانے کی سعی کی اور ساتھ ہی وقت پر تیار رہنے کی تنبیہ سن کر ثناء اپنا سر ہلا کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

''کیسا رہا آج کا دن...... لگتا ہے میری رانی بہت تھک گئی ہے'' نانی امی اس کے تھکن سے چور چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ پھر پیار سے اس کے

بھرے بھورے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔
ہالہ آفس سے فریش ہو کر سیدھا نانی امی کے کمرے میں آ گئی گئی۔ پھر ان کی گود میں گھس کر آنکھیں موند لیں تو نانی امی کو اس کی معصومیت پر بے حد پیار آ گیا۔ وہ آج بھی نانی کی گود میں سکون پاتی تھی۔ دو سال کی ہالہ جب نانی کی گود میں آتی تھی تو وہ اسی طرح گود میں آنکھیں موندے سو جایا کرتی تھی۔ ہر شے سے بے نیاز...... ہر پل سے بے خبر...... آج بھی وہ ایسے ہی نانی کی گود میں آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی۔ نانی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں اور وہ کچھ ہی لمحوں میں سکون کی وادی میں اتر گئی۔
''کتنی معصوم ہے میری رانی۔'' سوئی ہوئی ہالہ پر نانی کو بے حد پیار آیا وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ ان کی ممتا کے حصار میں ہالہ کو ایک عجیب سی اطمنانیت کا احساس ہوتا تھا۔ تب ہی نانی کو اچانک ہی خیال آیا کہ ہالہ کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو گئی ہے۔
''میری رانی اٹھو کچھ کھا پی لو، پھر سو جانا آج آفس کا پہلا دن تھا نہ تو تھکن سے کیسے بے حال...... بے سدھ پڑی ہے میری بچی۔'' نانی امی پیار سے پکار رہی تھیں۔ اس نے کسمسا کر بغیر آنکھیں کھولے نانی امی کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ مزید تنگ کر دیا۔

☆......☆......☆

''آج تمہاری مما کا انگلینڈ سے فون آیا تھا۔''
فریش پائن ایپل کے کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے اس کا ہاتھ لمحے بھر کے لیے رُکا تھا۔ اس کا وجود سماعت بن کر نانی کا اگلا جملہ سننے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن وہ بظاہر نے نیاز بنی کیک کے باقی بچے ٹکڑے کو مزید انہماک سے کھانے میں مصروف تھی۔ دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور تیز تر۔
''آج آفس کا پہلا دن تھا نہ...... سارا دن تعارف اور کام کی نوعیت سمجھنے میں لگ گیا۔ اس نے کیک کا آخری پیس حلق میں اتارتے ہوئے ہاتھ جھاڑے اب وہ کافی اپنے کپ میں انڈیل رہی تھی۔ بھاپ اڑاتی کافی کا ایک کپ اس نے نانی امی کے سامنے رکھ دیا تھا۔
''وہ تمہارے متعلق کچھ بات کرنا چاہ رہی تھیں انہوں نے تمہاری زندگی کے متعلق کچھ فیصلے کیے ہیں۔'' نانی امی اس کا سرد رویہ نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ بولی۔
''میں فیصلہ کر چکی ہوں نانی امی۔'' گرم گرم کافی کے پہلے گھونٹ نے اس کے حلق تک کڑواہٹ بھر دی۔
''کیسا فیصلہ......؟''
''میں جاب کروں گی''
''جانتی ہو تمہاری مما نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' وہ تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں۔''
''کیوں اچانک ان کو میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ پلیز آپ ان سے آئندہ اس موضوع پر بات مت کیجیے گا۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ نانی امی آپ میرے لیے وہ شجر ہیں جس کے سائے میں اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔'' اب وہ نانی امی کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ اپنے گود میں رکھ کر سہلانے لگی۔
بیٹا یہ شجر اب بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کی ٹہنیں

بھی کمزور ہو چکی ہیں۔ اب مزید تمہیں یہ سایہ دینے سے قاصر ہے۔ اچھا ہے میری زندگی میں ہی تم اپنے لیے کوئی مضبوط سہارا چن لو، جو تمہیں محبت دے سکے......''

''مجھے ڈر لگتا ہے محبت سے......'' اس نے جلدی سے نانی امی کی بات کاٹ دی پھر روتے ہوئے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

''مجھے خود سے الگ نہ کریں ممی پاپا کی شادی بھی تو محبت کی تھی نہ...... پھر محبت کا کیسا انجام تھا۔ جس کی سزا مجھے بھگتنی پڑی۔

''بیٹا ہر شخص کو ایک ہی کسوٹی پر پرکھنا دانشمندی نہیں۔ کچھ باتیں نصیب کی ہوتی ہیں بس اللہ سے ہر نماز میں اپنی بہتری کے لیے دعا مانگو وہ جو تمہارے حق میں بہتر ہو۔

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ نانی امی کی نظریں کھڑکی سے باہر آسمان پر پھیلے سفید بادلوں پر پڑیں۔ ان کا دل ڈھیروں اطمینان سے بھر گیا۔ ایسے جیسے ان کی جھولی میں اللہ تعالیٰ نے ہالہ کے لیے ڈھیروں خوشیاں ڈال دی ہیں۔

☆......☆......☆

مس ہالہ! ویل ڈن! ان تین مہینوں میں جس طرح آپ نے محنت اور لگن سے خود کو منوایا ہے وی آر پراؤڈ آف یور پرفارمنس کاشان احمد اس کی کارکردگی کے متعلق سینئر آفیسرز کے اچھے ریمارکس دیکھ کر خوش دلی سے بولا تھا۔ تمام سینئرز نے اس کی کارکردگی کو سراہا تھا۔

''تھینک یو سر! ہالہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ہمیں امید ہے آپ اپنی کارکردگی سے کمپنی کو ترقی کی سمت لے جائیں گی۔'' اس کا انداز بالکل آفیشل تھا۔ وہ ایک فائل پر سر جھکا کر سائن کر رہا تھا۔ اسا تھ ہی ضروری Data اپنے لیپ ٹاپ میں فیڈ کر رہا تھا۔

''آف کورس سر!''

''آپ کی کارکردگی دیکھ کر بابا جان نے آپ کی تنخواہ میں اضافہ کیا ہے۔ ویسے بابا جان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود آپ کا اعتماد انہیں بے حد پسند آیا۔ جس کی وجہ سے بورڈ نے آپ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

''حالانکہ اتنی کم عمری میں بغیر کسی تجربے اور میچورٹی کے اتنے احسن طریقے سے کام کو سنبھالنا یہ بظاہر آپ کو دیکھ کر ایسا ممکن نہیں لگتا۔'' کاشان اب اس کے نازک وجود کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ہلکے گرین کلر کے پرنٹڈ سوٹ میں اس کی رنگت میک اپ سے بے نیاز دمک رہی تھی اور آنکھوں میں ذہانت اور خود اعتمادی کی وہی جھلک جو وہ پہلے دن سے محسوس کر رہا تھا۔

''سر! اس دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں، مجھے چیلنجنگ کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔'' اس کو وہاں خود پر ہونے والی گفتگو اچھی نہیں لگ رہی تھی وہ وہاں سے جانا چاہتی تھی اِس وقت وہ چند فائلز پر کاشان احمد کے سائن لینے آئی تھی۔

''گڈ۔'' اس نے فائل بند کر کے اس کی جانب بڑھا دی۔

''سر! کیا میں اب جا سکتی ہوں۔'' کاشان کو دوبارہ کسی فائل پر جھکا دیکھ کر وہ بولی۔

''شیور مس ہالہ! کل کی میٹنگ یاد رکھیے گا۔ صبح کمپنی کے تمام آفیسرز کی میٹنگ ہے۔ جس میں آپ بھی شامل ہیں۔'' وہ بغیر نظریں اٹھائے بول رہا تھا۔

''یس سر مجھے یاد ہے۔'' وہ کہہ کر اپنے کیبن میں آ گئی۔ آج اسے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ ثناء نے جاب چھوڑ دی تھی۔ بقول اس کے وہ اتنا بھاری

کام اپنے نازک سے کندھوں پر برداشت نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی وہ کسی پابندی میں رہ کر کام کرنے والوں میں نہیں تھی۔

اسے اپنی بے فکری کی زندگی سے بڑا پیار تھا۔ آج ہالہ کو نانی امی نے جلدی گھر آنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ ان کا کوئی مہمان آنے والا تھا۔ جسے ریسیو کرنے ان دونوں کا ایئرپورٹ جانا تھا۔ وہ اپنے کام نپٹانے میں مشغول ہوگئی۔ کام کے دوران اسے وقت بیت جانے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ نانی امی نے اسے چار بجے تک گھر پہنچنے کا کہا تھا جبکہ اس کی گھڑی میں ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اپنی گھڑی دیکھ کر ٹپٹا گئی آفس بھی خالی ہو رہا تھا۔

''او مائی گاڈ! نانی امی تو میری اس غیر ذمہ داری پر سخت خفا ہوں گی۔'' وہ بڑبڑائی اسے شدت سے نانی امی کی خفگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آگے بکھری فائلوں کو سمیٹنے لگی۔ آصف صاحب کو کچھ ضروری ہدایت دیں، پھر اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی لے کر پارکنگ کی جانب دوڑ لگا دی۔

گھر کے پورچ میں گاڑی سے اترتے ہوئے ہاتھ باندھے سامنے کھڑی نانی امی نے اس کے وجود میں سنسناہٹ دوڑا دی۔

''سوری نانو جانی! نہ جانے آج کیوں میں نے اتنی غیر ذمہ داری دکھائی۔ آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ پلیز آپ خفا مت ہوں۔ آئی پرامس آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ٹائم اتنا ہوگیا تھا کہ میں آپ کو کال تک نہیں کر سکی۔'' وہ وضاحتیں دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی نانی امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو نانی اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

حیرت انگیز کتاب

آزر کیوان، پارسیوں کا ایک پیشوا گزرا ہے۔ اس نے ایک عجیب و غریب کتاب تصنیف کی تھی جس میں کمال یہ تھا کہ اصل نسخے کی زبان خالص فارسی تھی لیکن نقطوں کے رد و بدل سے عربی بن جاتی تھی اور اگر الفاظ کو اُلٹ کر پڑھتے تو ترکی اور مصحف کرنے سے ہندی بن جاتی تھی۔ ایک اُردو مصنف نے لکھا ہے کہ بعض لوگ اس کتاب کو محسن فانی کشمیری کی تصنیف، اور بعض دار الشکوہ کی تصنیف بتاتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ذوالفقار اردستانی کی تصنیف ہے۔

حسنِ انتخاب: اشعر عتیق۔ کراچی۔

''اچھا زیادہ مکھن مت لگاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگواتی ہوں۔ ڈرائینگ روم میں آجاؤ، ہم وہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

وہ سنجیدگی سے کہہ کر اسے ایسا حیران و پریشان چھوڑ کر چلی گئیں اور یہ سوچنے لگی کہ ان تئیس سالوں میں کبھی نانی کا رویہ اتنا عجیب نہیں رہا، جتنا آج لگ رہا ہے۔ یہ بات نانی اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ ہرگز اتنی غیر ذمہ دار لاپرواہ نہیں ہے۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی غیر ذمہ دارانہ رویے کی بناء نانی امی کو یقیناً اپنے مہمان کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ جب ہی ان کا رویہ عجیب تھا۔

وہ فریش ہو کر ڈرائینگ روم میں جب داخل ہوئی تو وہاں نانی امی پہلے سے ہی موجود تھیں اور نہ جانے کن سوچوں میں گم تھیں کہ اس کے بیٹھنے کا احساس بھی انہیں نہ ہو سکا۔ جب اس نے نانی کو پکارا تو وہ چونکیں۔

''کیا ہوا آپ مجھ سے خفا ہیں۔ آپ جو چاہے سزا دے لیکن خفا مت ہوں۔ میں سب کچھ

برداشت کرسکتی ہوں، آپ کی خفگی نہیں۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''پھر وعدہ کرو کبھی مجھے خفا نہیں ہونے دو گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''وعدہ۔''

ہالہ ان قطروں کو ہاتھوں سے رگڑنے لگی جو پلکوں کی چلمن میں قید تھے۔ پھر نانی اور ہالہ نے مل کر کھانا کھایا۔ اس دوران نانی نے بتایا کہ وہ مہمان کو لینے کسی کو بھیجنے والی تھیں کہ وہ خود ہی گھر پہنچ گیا۔ ابھی وہ آرام کر رہا تھا۔

گھر کا ایڈریس اسے معلوم تھا۔ وہ نانی کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ نانی نے اس کا خیال رکھنے کی خاص تاکید کی۔ وہ عرصے بعد نانی سے ملنے یہاں آیا تھا۔ اور پھر وہ اسے رات کے کھانے کے متعلق خاص ہدایت دیتے ہوئے آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''سب چیزیں تیار ہیں نہ!'' ہالہ نے قورمہ کا مسالہ چکھتے ہوئے خانساماں سے پوچھا ساتھ ہی دوسری ڈشز کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔

''ہالہ بی بی آپ کی دوست ثناء آئی ہیں۔'' چوکیدار کے اطلاع دینے پر وہ مڑی۔

''ٹھیک ہے میں آتی ہوں۔ تم بٹھاؤ انہیں۔''

ثناء کا اس وقت آنا اس کے لیے تعجب کی بات نہ تھی۔ وہ اکثر یونہی آجایا کرتی تھی۔ دونوں کی آپس بے تکلفی کا علم گھر کے تمام ملازموں کو تھا۔ وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی، تو حسب توقع قالین پر آڑی ترچھی لیٹی وہ ایک میگزین کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میگزین ایک طرف رکھ کر بولی۔

''کہاں غائب ہو! پورے دو ماہ بعد تمہارا مکھڑا دیکھنے میں خود ہی چلی آئی، تمہیں تو فرصت نہیں۔''

''جی ابھی بہت کام ہیں مجھے۔''

''اچھا...... محترمہ کو ایسا کون سا اہم کام ہے۔ جو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔'' وہ مصنوعی خفگی دکھاتے ہوئے بولی۔

''آج ہمارے ہاں ایک عدد مہمان تشریف فرما ہیں۔ انہی کے کھانے کی خاص تیاریاں ڈنر پر ہو رہی ہیں۔ بس اسی سلسلے میں مصروف تھی۔ آفس کے آنے کے بعد ایک لمحے کو آرام نہیں کیا۔ بس کچھ اس کی تھکن بھی ہو رہی ہے۔'' وہ اپنی تھکن زدہ گردن دائیں بائیں کرتے بول رہی تھی۔ اس وقت اسے شدید آرام کی طلب ہو رہی تھی، لیکن نانی کی مزید خفگی مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ان کی تمام ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

''مہمان!...... یہ اچانک کون سا مہمان تمہارے گھر آ ٹپکا ہے۔ جب سے میں تمہیں جانتی ہوں تب سے اس عرصے میں اس گھر میں اس قسم کی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔ میں تو خود تمہیں کہتی رہی کہیں آجایا کرو۔ کہیں جاؤ گی تو تمہارے گھر بھی لوگ آئیں گے۔ خود تمہارا دل لگے گا گھر کی رونق بڑھ جائے گی مگر مجال ہے تم کہیں جاؤ۔ فقط بے چاری میری واحد ہستی تمہارے دولت خانہ پر قدم انجا فرمانے آجاتی ہے۔ رشتہ دار تمہارا کوئی ہے نہیں...... اب مجھے یہ بتاؤ یہ مہمان کون ہے؟ کس صنف سے تعلق ہے؟ نام کیا ہے؟'' ثناء حسب عادت نان اسٹاپ بے تکے جملے بولے چلے گئی۔

''میں نہیں جانتی کیا نام ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ میں تو ابھی تک ملی بھی نہیں بس اتنا معلوم ہے کہ نانی امی کے دور کے رشتہ دار ہے اور پہلی دفعہ

اپنے کسی کام سے یہاں آیا ہے۔'' وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

''انسان ہی ہے نہ...... ویسے کافی مشکوک مہمان لگ رہا ہے۔

کیا پتا...... گھر کا مہمان بنتے بنتے دل کا مہمان بن جائے......'' اس کا لہجہ شرارتی تھا۔ وہ کن اکھیوں سے ہالہ کو دیکھ رہی تھی جو اسے مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ میری طرف سے تمہاری معلومات کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے دل میں کسی مہمان کے رہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ کیوں؟ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو اب مزید معلومات لینا چاہتی ہو تو مہمان سے خود مل کر حاصل کرلو۔''

''نہ بابا نہ محترم مہمان کے متعلق معلومات حاصل کرنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ اس کے لیے بالمشافہ ملاقات کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے کچھ شیئر کرنے آئی تھی ویسے بھی کافی دن ہو گئے تھے تم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہ جاب نما عفریت جب سے تم نے پال رکھی ہے۔ ملاقات تو دور کی بات ہے تم تو میری کال اٹینڈ نہیں کرتی ہو...... خیر کل خالہ آ رہی ہیں انگلینڈ سے۔'' بات کرتے کرتے خالہ کے ذکر پر اس کا لہجہ محبت سے بھر گیا۔

''او...... اچھا یعنی تمہاری محبت کی تکمیل ہونے والی ہے یہی بات ہے نہ۔'' وہ اس کا محبت بھرا معنی خیز لہجہ سمجھ چکی تھی۔

''ہاں میرا باقاعدہ عدنان کے لیے پرپوزل لے کر آ رہی ہیں۔ منگنی کر کے ہی جائیں گی اور اگلے سال شادی۔''

''اچھا تو بیگم صاحبہ نے سارے پروگرام سیٹ کر لیے۔ یہ تو واقعی گڈ نیوز ہے چلو تمہاری چار سالہ محبت اپنے خوبصورت انجام کو پہنچ رہی ہے۔

ہالہ اس کی بات پر خوش ہوتے ہوئے بولی۔ اس کو اپنی یہ واحد دوست عزیز تھی، وہ جانتی تھی کہ عدنان اور وہ چار سال سے ایک دوسرے کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں۔ عدنان تین بھائیوں میں چھوٹا اور اس کا خالہ زاد کزن تھا، اسے اپنی Study اور Job کے سیٹ ہونے کا انتظار تھا۔ یقیناً دونوں کام مکمل کرنے کے بعد اب وہ باقاعدہ اس کی فیملی کو پرپوزل بھیج رہا تھا۔ ثناء بہت خوش تھی عدنان کے ذکر پر اس کے چہرے پر بکھرے حیاء کے خوبصورت رنگوں کے ہالے کو دیکھ رہی تھی۔ اتنی بولڈ لڑکی محبت کے شکنجے میں جکڑی بے بس تھی اور اب پا لینے کے انوکھے رنگ...... اس کے چہرے پر بکھری دھنک...... واہ رے مولا...... محبت ہو تو ایسی...... اللہ اس کی محبتوں کو ہمیشہ سلامت رکھے آمین وہ دل سے دعا کر رہی تھی۔

''ایک بات کہوں ہالہ!'' وہ اس کے یونہی مسلسل دیکھے جانے پر جھینپ گئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''ہاں بولو۔''

''کبھی کبھی زندگی میں مخلص ساتھی ملے تو اسے اپنانے میں وقت ضائع مت کرنا۔ کبھی کبھی میرے دل میں بھی شکی اور باغی سوچیں ابھرنے لگتی ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس لمحے سے، میں نے عدنان کو بے حد چاہا ہے...... دل سے محبت کی ہے۔ اس کا انجام کبھی برا ہوا تو میں بکھر جاؤں گی...... کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ عدنان مجھے زندگی کے بیچ رستوں پر تو نہیں چھوڑ دے گا۔ میں تو اس کا ہاتھ تھامے بہت آگے جا چکی ہوں۔ اب مجھے اس کے علاوہ کوئی دوسرا چہرہ نظر نہیں آتا۔

شاید یہ میری محبت کی انتہا ہے یہ باتیں عدنان سے کرتی ہوں تو وہ میرے ہاتھوں میں اعتماد کے اتنے خوش رنگ پھول تھما دیتا ہے کہ میں ان کی خوشبو دل میں اتارتے ہوئے مطمئن ہو جاتی ہوں۔ اب کل مما سے خالہ نے اس رشتے پر بات کی تو میرے گھر والے بھی بہت خوش ہوئے اور میں خود بھی اپنی محبت کی تکمیل ہونے پر جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔ اس کی آنکھیں نم تھیں ''ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو سوچا جاتا ہے۔ کبھی جب چاہا جاتا ہے تو ضروری نہیں چاہت بھی مل جائے۔ بارش تو ہر طرف ہی برستی ہے لیکن زمین کے ہر ٹکڑے کو ہریالی نصیب نہیں ہوتی۔ خود زمین کا بھی اچھا ہونا ضروری ہے۔ بس ثناء یہی بات انسانوں پر منحصر ہوتی ہے۔ تم تو ہو ہی اچھی یقیناً تمہارے دل کی زمین پر پھیلی یہ کونپلیں تناور درخت ضرور بنیں گی اور اچھا پھل دیں گے۔ یہ میری دعا ہے۔'' وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں کہ خانساماں نے کھانے کے تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔ ثناء نے اس سے معذرت کر کے گھر واپس جانے کی اجازت لی۔ وہ اسے الوداع کہہ کر نانی امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

کھانا ٹیبل پر چن دیا گیا تھا۔ نانی اور وہ ''مہمان'' کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں بلیو جینز پر بلیک ٹی شرٹ پہنے ایک بلند قامت شخص۔ السلام وعلیکم کہتا ہوا اُس کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وعلیکم السلام! جیتے رہو بیٹا! اشعر یہ میری نواسی ہے ہالہ۔ نانی نے دونوں کا تعارف کروایا۔

''نائس ٹو میٹ یو۔'' وہ سر خم کرتے ہوئے بولا جواباً اس نے بھی سر ہلا دیا۔

''کیا کرتی ہیں آپ...... آئی مین پڑھتی ہیں۔''

''جی نہیں جاب کرتی ہوں۔'' وہ مختصر بولی۔

''کہاں؟''

''کمپنی میں۔'' وہ جھنجھلاتے لگی۔

''کون سی کمپنی میں؟'' وہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محفوظ ہو رہا تھا۔

''آپ کھانا کھائیں پلیز!'' وہ اکتانے لگی۔ بے تکے سوالات پر اسے شدید غصہ آنے لگا۔

''کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے چلو بیٹا باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی کھانا شروع کرو۔''

نانی امی ہالہ کے مزاج سے واقف تھیں۔ وہ اجنبیوں سے گھلتی ملتی نہیں تھی، وہ بات کو مزید طول دینے سے بچاتے ہوئے کھانا سرو کرنے لگیں۔

اشعر بریانی میں چمچہ چلاتے ہوئے کن انکھوں سے ہالہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بظاہر اس لڑکی کے چہرے پر اعتماد تھا۔ لیکن وہ اعتماد اسے مصنوعی لگا کیوں کہ وہ اس کے کانپتے ہاتھ اور جھکی کانپتی پلکیں دیکھ چکا تھا وہ مسکرانے لگا۔ اور اپنی پلیٹ پر جھک کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ہی نانی کے ساتھ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن اب باتوں کا رُخ ہالہ کے بجائے Currant Affair پر تھا۔

☆......☆......☆

آفس ٹائم پانچ بجے ختم ہو جاتا تھا۔ پانچ بجے وہ اپنے تمام کام سمیٹنے لگی۔ آصف صاحب کو کل کے لیے کچھ ضروری ہدایات دیں اور اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھا کر نکلنے ہی والی تھی کہ پیون نے بتایا۔

''آپ کو صاحب اندر بلا رہے ہیں۔''

وہ اوکے کہتی سر کاشان کے کمرے کی طرف بڑھی۔

''پلیز سٹ ڈاؤن مس ہالہ!'' کاشان اپنی فائل پر تیزی سے اپنا قلم چلاتے ہوتے اس کی طرف دیکھے بغیر بولا تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے وہ فائل بند کر کے اب اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''مس ہالہ آپ سے ایک امپورٹنٹ پرابلم پر ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ If you dont mind میں کہیں چل کر اس سلسلے میں ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیسی پرابلم ہے سر؟''

''آپ جانے کے لیے تیار ہیں؟'' وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''یس سر!'' اس نے گھبراہٹ میں جلدی سے کہا۔

کاشان کی گاڑی میں وہ دونوں PC ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ یہاں کئی بار کمپنی کے دیگر آفیسرز کے ساتھ میٹنگ اٹینڈ کرتی تھی۔ اسے پریشانی اس بات کی تھی کہ اس ارجنٹ میٹنگ کی وجہ سے اسے آج خاصی دیر ہو سکتی تھی۔ اگر اسے کاشان پہلے بتا دیتے تو وہ نانی کو اطلاع کر دیتی لیکن سر کی سنجیدگی اور رعب کہ زیر اثر وہ کچھ کہنے سے معذور سی ہو گئی تھی۔ کسی روبورٹ کی مانند وہ ان کے حکم کی تکمیل کر رہی تھی۔ وہ لوگ اب پہلے سے ایک ریزو ٹیبل کے سامنے رُک گئے۔ سر کاشان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ بیٹھتے ہوئے سوچنے لگی کہ پہلے سے اس میٹنگ کے لیے ٹیبل ریزو کرائی گئی تھی تو اسے پہلے مطلع کیوں نہیں کیا گیا۔ آفس کے بعد وہ کہیں شاذو نادر ہی جاتی تھی۔ اس کے چہرے کا زاویہ بگڑنے لگا لیکن سر کاشان کسی بات کی پرواہ کیے بغیر ہلکے پھلکے کھانے کا آڈر دے رہے تھے۔

دونوں کے درمیان طویل خاموشی تھی۔ آس پاس آنے والے لوگوں کی تعداد معمول سے کم تھی۔ اکثر فیملیز آئی ہوئی تھیں۔ ایک نو بیاہتا جوڑا خوش گپیوں میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ ہلکی موسیقی نے ماحول کو رومانٹک بنا رکھا تھا۔

''مس ہالہ! کیا آپ بتا سکتی ہیں میری عمر کیا ہوگی؟''

وہ خاموشی توڑتا ہوا بولا جو کچھ دیر سے ان کے درمیان حائل تھی۔ ہالہ سر کاشان کی طرف سے بات شروع کرنے کے انتظار میں بیٹھی تھک ہار کر اپنے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی کہ ان کی بھی اچانک اس بات سے وہ انہیں عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''سر! اس میٹنگ کی یہی اہم بات مجھے ڈسکس کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔'' وہ کچھ الجھ سی گئی۔

''آپ میری بات کا صحیح جواب دیں۔'' وہ اس کی بدلتی کیفیت کو دیکھ کر نرمی سے بولا۔

''سر یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ معاف کیجیے گا میں اس احمقانہ سوال کا جواب نہیں دے سکتی پلیز وہ بات کریں جس کے لیے میٹنگ رکھی گئی ہے۔

''میں وہ بھی کر لوں گا۔ ابھی میں آپ سے جو احمقانہ سوال کر رہا ہوں اس کا جواب دیجیے۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ عجیب پاگل شخص ہے بلاوجہ رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے کہ جو دیا پھر بھی احمقوں کی طرح اپنی عمر گنوانے بیٹھا ہے وہ دل ہی دل میں خود سے سوال

جواب کرتی رہی۔ ......کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسی وقت ریزائن دے دے اور خوب سنائے۔ لیکن سامنے بیٹھے رعب دار شخصیت سے وہ دل سے مرعوب تھی چاہتے ہوئے بھی کہہ نہیں پا رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا یہاں سے خوب تیز دوڑ لگائے لیکن جانے کیوں بیٹھی رہی۔ پھر اس نے جیسے خود ہار مان لی وہ کسی احتجاج کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر وہ بہ غور سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھنے لگی تا کہ اس کے کیے گئے بے تکے سوال کا جواب دے سکے۔

بلیو جینز پر بلیو دھاری شرٹ پر سفید رنگت نمایاں ہو رہی تھی۔ گھنے بالوں کو جیل سے سنوارا گیا تھا۔ بلند قد و قامت کے مالک ان کی پرسنالٹی شاندار تھی گھنی مونچھوں تلے مسکراہٹ کاشان کے لبوں پر دوڑ رہی تھی۔ وہ اس کا ایسے جائزہ لے رہی تھی جیسے سامنے رکھے بے جان مجسمے کو اپنی نظروں سے پرکھ رہی ہو۔

''سر! 30 سال سے زیادہ عمر نہیں ہوگی۔'' وہ سٹپٹا کر بولی تب کاشان نے مسکرا کر بولا۔

'......نو مس!' آپ کا اندازہ غلط ہے۔ آئی ایم 38 ایئر اولڈ!''

کاشان کی بات پر وہ حیرت زدہ ضرور ہوئی کیونکہ کاشان کی پرسنالٹی اتنی شاندار تھی کہ وہ تیس برس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ وہ بظاہر ایسے بیٹھی رہی جیسے اسے اس بات کی پرواہ نہیں کہ وہ عمر کی حصے میں ہیں۔ اس کے چہرے سے بے زاری ٹپک رہی تھی۔ اسے یہ باتیں زیر بحث لانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سر کاشان کی طرف ایسے ہی دیکھنے لگی جیسے کہنا چاہ رہی ہو کہ اب وہ مزید کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟ ان کا یہاں بیٹھنے کا کیا مقصد ہے؟ وہ اپنے ذہن میں کئی سوالات لیے

کبھی ان کی طرف اور کبھی اپنی بند مٹھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو پسینے سے شرابور تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی سر کاشان اس کی جھنجھلاہٹ کا جائزہ لے چکے تھے۔ بولے۔

''میں چاہتا ہوں آپ یہ جاب چھوڑ دیں۔ میں آپ کو دوسری جاب آفر کرنا چاہتا ہوں۔

''مگر کیوں سر؟ کیا میری کارکردگی میں کوئی کمی رہ گئی ہے اگر ایسی بات ہے تو آپ مجھے بتا سکتے ہیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے آپ میں کوئی کمی نہیں۔''

''آپ مجھے کون سی دوسری جاب آفر کرنا چاہتے ہیں سر!'' وہ ضبط کر کے بولی۔

''ہاؤس جاب۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب آپ کا۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔

''پہلے میری بات کول ڈاؤن ہو کر سنیے پھر جو مرضی فیصلہ کیجیے گا۔'' اس نے اشارے سے ہالہ کو بیٹھنے کا حکم دیا جب وہ بیٹھ گئی تو دوبارہ بولا۔

''میں کاشان حمد اپنے گھر کا اکلوتا چشم و چراغ ہوں۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد صرف اور صرف کئی سال اپنے والد کے بزنس سنبھالنے اور اسے ترقی دینے کے لیے گزار دیے۔ ممی کی خواہش تھی کہ جلد از جلد شادی کر لوں۔ لیکن میں خاصا پریکٹیکل بندہ ہوں۔ زندگی پریکٹیکل گزاری اور اپنا لائف پارٹنر بھی ایسا چاہتا ہوں۔ جیسا میں خود ہوں جبکہ ممی میرے لیے خاندان سے جو لڑکیاں دیکھ رہی ہیں ان کا مزاج الٹرا ماڈرن ہے۔ اور مجھے خود کو شو آف کرنے والی لڑکیوں سے سخت چڑ ہے۔ جو خوبیاں اور جیسا مزاج میں اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ آپ کو اس طریقے اپنی عمر بتانے کا یہی مقصد تھا کہ میں جاننا چاہتا

تھا۔ آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں اور باقی لڑکیوں کی طرح آپ میری توجہ پا کر کیسا ری ایکٹ React کرتی ہیں۔ آپ کی سنجیدگی مجھے اپنے متعلق پوچھنے پر آمادہ نہیں کر سکی، ورنہ میں خود طے کر کے آیا تھا آپ سے اپنے متعلق ضرور رائے لوں گا۔ بہرحال اس نشست کا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ کے گھر اپنے والدین کو بھیجنے سے پہلے آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ ہمارے درمیان خاصا ایج ڈیفرینس ہے لیکن میرے نزدیک یہ بات غیر اہم ہے۔ اصل بات ذہنی ہم آہنگی کی ہوتی ہے۔ دل خود بخود مل ہی جاتے ہیں۔ باقی آپ کی مرضی ہے۔

جو آپ کہیں گی، ویسا ہوگا۔ کل آپ آفس نہ آئیں تو شام کو میرے والدین آپ کے گھر آ جائیں گے۔

کاشان احمد کی یہ طویل گفتگو وہ سر جھکائے سنتی رہی کچھ بول نہ پائی۔

اس دوران آرڈر سرو ہونے لگا۔

''سر! آپ میرے متعلق کچھ نہیں جانتے۔''

وہ ہمت کر کے بولی۔

''میں سب جانتا ہوں مس ہالہ! میں نے اپنی زندگی کا فیصلہ آپ سے جوڑنے کا ایسے ہی تو طے نہیں کر لیا بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ کے والدین میں طلاق سے لے کر آپ کی نانی کے ساتھ گزارنے والی زندگی...... یہ سب جانتا ہوں۔''

ہالہ اس کی بات سن کر حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ اس دوران ان کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ کاشان احمد اسے خود گھر چھوڑنے گیا بعد میں آفس سے ہالہ نے گاڑی منگوائی تھی۔

☆......☆......☆

''کبھی زندگی میں مخلص ساتھی ملے تو اسے اپنانے میں وقت ضائع مت کرنا۔''

اس کے کانوں میں ثناء کی بات گونجنے لگی۔

پھر اس نے نانی امی کو ساری بات بتا دی۔

لیکن بیٹا! جانتی ہو یہ مہمان کون ہے؟ اشعر کو تمہاری مما نے بھیجا ہے یہ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک دوسرے سے ملو اور یقینی بندھن میں بندھ جاؤ۔''

''نہیں نانی امی! میں اس ماں کی خواہش کا کیسے احترام کر لوں جس نے کبھی ماں ہونے کا فرض ادا ہی نہیں کیا۔ آپ نے خود ہی ایک بار کہا تھا کہ مما صرف اور صرف اپنی ضدیں منوانا جانتی ہیں۔ دوسروں کی رائے کو اہمیت نہیں دیتیں پھر میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں محض ان کی انا کی تسکین کی خاطر میں خود کو قربان نہیں کر سکتی۔ اشعر لاکھ اچھا سہی لیکن میری پسند نہیں۔ پھر بھی آپ جو کہیں گی میں وہی کروں گی کیوں کہ آپ ہی میری ماں ہیں اور آپ ہی باپ۔'' وہ رونے لگی۔

''نہیں...... اب نہیں...... اب ویسا ہوگا جیسا تم کہو گی...... جیسا تم چاہو گی۔''

نانی امی کچھ سوچ کر مضبوط لہجے میں بولیں اور ہالہ کسی معصوم بچے کی طرح ان کی گود میں سمٹ گئی۔ اس نے اب تک کی زندگی احساس کمتری کی گھٹن میں رہ کر گزاری تھی۔ اب اسے لگا اس کے آس پاس تازہ ہوا چلنے لگی ہے۔ جس میں رہ کر وہ آزادی سے سانس لے سکتی ہے۔ محبت کی شاہراہ پر اس کا یہ پہلا قدم بے حد مضبوط تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

ثمینہ طاہر بٹ

میرے نصیب کی بارشیں

''لوگ......؟ کون لوگ؟ کن لوگوں کی بات کر رہی ہو آپ حرمت۔ یہ راہ چلتے لوگ ہمارے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ یہ اجنبی لوگ ہمیں جانتے ہی کتنا ہیں اور جب وہ ہمیں جانتے ہی نہیں۔ جب وہ ہمارے لیے اور ہم ان کے لیے سراسر اجنبی ہی......

زندگی کے اندھیروں میں آس کے دیپ جلاتا ایک خاص ناولٹ

کچھ شرم ہے کہ نہیں آپ کو۔ ارے اور کچھ نہیں تو اپنے نام کا ہی پاس رکھ لیا ہوتا۔ اگر اس کا بھی خیال نہیں تھا تو اس غریب کی عزت کا ہی سوچ لیا ہوتا جو آپ کو ماں کہتا ہے۔ آپ کی ہر ضرورت بنا کہے پوری کرتا ہے آپ کے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ ارے کچھ تو سوچا ہوتا۔ کچھ تو۔!'' یوں تو پچھلے کئی گھنٹوں سے فارحہ وقفے وقفے سے ان پر برس رہی تھی۔ اس کے بولنے واویلہ کرنے اور مغلظات بکنے کی رفتار پہلے سے کچھ کم تو نہ تھی مگر جیسے ہی ان کے بیٹے نے گھر میں قدم رکھا، اس کے بولنے کی رفتار گولی جیسی تیز اور زبان کی دھار تلوار سے بھی زیادہ تیکھی ہو گئی تھی۔

''فارحہ بیٹا! میں نے ایسا کیا گناہ کر ڈالا ہے۔ جس کی سزا ختم ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔ ارے بیٹی! کچھ تو لحاظ کرو۔ ماں نہیں ہوں تمہاری، مگر ماں جیسی تو ہوں۔ تمہاری ماں ہی کی عمر کی ہوں اور تم مجھے ایسے گالیاں دے رہی ہو، جیسے میں نادان بچی ہوں۔ اور یہ...... یہ میرا بیٹا۔ یہ بھی چپ چاپ......؟

کیا......؟ کیا کہا آپ نے میری ماں؟ اور آپ جیسی؟ ہمت کیسے ہوئی آپ کی میری ماں کا نام اپنے ساتھ لینے کی۔ ارے میری ماں صوم صلوۃ کی پابند، نیک پرہیزگار، تہجد گذار، شریف خاتون ہیں۔ ''آپ جیسی'' نہیں۔ خبردار! جو آج کے بعد میری ماں کا نام بھی لیا آپ نے اپنی زبان سے تو، حشر خراب کر دوں گی۔ سمجھی آئیں بڑی اور ہاں نادان بچی نہیں آپ۔ لیکن بہت تیز خاتون ہیں۔ ایک بار پھر ان کی بات کاٹ کر فارحہ نئے سرے سے ان پر الٹ پڑی تھی اور منٹوں سیکنڈوں میں انہیں بے بھاؤ کی سنا کر اب روئے سخن اپنے شوہر نامدار کی جانب گھما چکی تھی۔

''سنو جی! میں کہے دے رہی ہوں آپ کو۔ میرا گزارا اِس عورت کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ بس

بہت رو لی، ان کے ساتھ بڑی سنوار لی اپنی
عاقبت میں نے۔ اور بڑا نام کرلیا دنیا میں۔ خوب
واہ، واہ بھی کروالی شریکوں میں۔ بس اب میں بھر
پائی۔ اب کچھ دنیا اور آخرت سنوارنے کا موقع
اپنے بھائی بہن کو بھی دے دیں۔ میں نے ٹھیکہ
نہیں لے رکھا۔ ساری زندگی ''ایسے ایسوں'' کو
پالنے پوسنے کا۔ اٹھاؤ ان کا بوریا بستر اور پھینک کر
آؤ اپنے لاڈلے بھائی کی طرف۔ مجھے نہیں
چاہیے اس بھیک کے چند اوپلی۔ ہونہہ! کتنی
آسانی سے وہ دونوں چند روپوں کے عوض اپنی
جان چھڑا کر چلتے بنے ہیں اور یہاں ہر طرح کی
ہزیست ہمیں اٹھانا پڑتی ہے۔ بس کہہ دیا میں
نے، اب نہیں رکھنے والی میں آپ کی اماں کو......
جہاں مرضی چھوڑ کر آؤ انہیں میری بلا سے۔!''
اپنے شوہر نامدار کو منہ کھولتے دیکھ کر اس نے بے
حد غصے سے اسے بھی لتاڑ دیا تو وہ بے بسی سے کبھی
اماں اور کبھی بیوی کو دیکھ کر رہ گیا۔

''گلناز اری او گلناز! فارحہ کی تیز پکار پر گلناز
پھولی سانسوں سے بھاگتی ہوئی وہاں آئی تھی اور
اب حیران حیران سی روتی ہوئی اماں سر جھکائے
بیٹھے بھائی اور غصے میں بھری باجی کو دیکھ رہی تھی۔

''چل ری گلناز جلدی کر اور اماں کا سامان
اٹھا کے لا یہاں۔ دیکھ سب کچھ لے آئیں کچھ
باقی نہ رہے۔ کپڑے جوتے سب لے آ۔'' فارحہ
باجی کا نیا حکم سن کر گلناز چونکی تھی مگر کچھ بھی کہہ کر
طوفان کا رُخ اپنی طرف موڑنے کا حوصلہ نہیں
رکھتی تھی۔ لہٰذا چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اور پھر
اگلے چند گھنٹوں میں وہ اپنے ہی گھر سے کچھ بے
سروسامانی اور بے عزتی کے ساتھ نکالی جا رہی تھی
کہ اردگرد دیوار کو رونے کا اختیار ہوتا تو اس کی
حالت دیکھ کر شاید وہ بھی دھاڑیں مار مار کر
روتے۔ اگر جو بے زبان زمین و آسمان کو دل و
زبان عطا کردی جاتی تو شاید زمین چیخ مار کر پھٹ
جاتی اور آسمان دولخت ہو جاتا۔ مگر نہیں جب جیتے
جاگتے انسانوں کے دل پتھر اور زبانیں ڈنک بن
جائیں تو پھر شاید درودیوار زمین آسمان کا ساکن
رہنا ہی ٹھیک رہتا ہے۔

اس خوبصورت کوٹھی کے پورچ میں گاڑی
روک کر اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر آٹومیٹک
لاک کھول دیے۔ جس کا مطلب تھا۔ انہیں اب
اس گاڑی سے نکل جانا چاہیے اور باقی کا وقت
لان میں بیٹھ کر اس مکان کے مکینوں کا انتظار کرنا
چاہیے کہ دونوں ابھی آفس سے نہیں آئے تھے۔

''بیٹا! وہ میں...... میں کیسے کہوں تم سے
بیٹا۔ میرا قصور تو بتا دو مجھے بیٹا...... وہ ......!''
انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کے بجائے
روتے ہوئے اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ
کر کہنا چاہا مگر۔

''گلناز! اٹھاؤ ان کا سامان اور اندر لاؤنج
میں رکھ دو جا کر۔ میری بات ہوگئی ہے آ رہے
ہیں۔ وہ لوگ تھوڑی دیر میں اور بٹھاؤ انہیں اندر
لے جا کر۔ صغریٰ دیکھ لے گی انہیں جلدی کرو۔
میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ اور سنیں آپ بھی چلیں
اب جلدی واپس۔ بھائی سے پھر کبھی مل لیجیے گا
آ کر۔ فی الحال ہمیں جلد از جلد واپس جانا ہے
بچوں کو اکیڈمی سے چھٹی ہونے والی ہے، اور ہمیں
انہیں پک بھی کرنا ہے راستے سے۔ بس کریں
اب یہ میلو فیملی ڈرامہ اور چلیں اب واپس!'' ان
کی بات ایک بار پھر سختی سے کاٹتے ہوئے فارحہ
نے اپنی ہڑبونگ جمائی، انہیں چاروناچار گاڑی
سے نکلنا پڑا۔

☆......☆......☆

لاؤنج میں لگے خوبصورت آرائشی آئینے پر جیسے ہی ان کی نظر پڑی وہ پتھرا سی گئیں۔ سامنے سجے دیوار گیر شیشے میں نظر آنے والا عکس ان کا تو ہرگز نہیں تھا۔ یہ کون سی حرمت النساء تھی جو ان کے سامنے کھڑی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انہیں یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ اس نظر آنے والی شبیہ میں انہیں ڈھونڈنے سے بھی اس پرانی حرمت النساء کا نام ونشان بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جسے وہ جانتی تھی، جو انکا اپنا وجود تھیں جو وہ خود تھیں کہاں گئیں تھیں۔ وہ حرمت النساء اور یہ سامنے نظر آنے والی اجنبی عورت کون تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی یا سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

ان کے والدین نے بڑے چاؤ سے ان کا نام رکھا تھا۔ ان کے ابا میاں گورنمنٹ ہائی اسکول فار بوائز کے ہیڈ ماسٹر تھے اور بے حد علم دوست انسان تھے۔ حرمت النساء نے علم سے دوستی اپنے ابا میاں سے لی تھی اور سگھڑاپا، ہنرمندی اماں بی سے چرائی تھی۔ ہمت ابا میاں کی طرف سے ملی تھی تو معاملہ فہمی اور خوش اخلاقی اماں بی نے سکھائی تھی۔ غرض یہ کہ وہ اپنے والدین کی اُمیدوں اور تمناؤں کا واحد مرکز تھی۔ حرمت النساء کی زندگی کی گاڑی اپنے محبت کرنے والے والدین کے زیر سایہ بڑی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔ حصول علم اور امور خانہ داری کے گرد گھومتے گھومتے کب ان کا بچپن اور لڑکپن چپکے سے الوداع کہہ گیا اور کب شباب نے ان کے آنگن میں ڈیرے ڈال لیے۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی مگر ان کے والدین تو ان کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ اماں بی نے تو کب سے چپکے چپکے ان کے جہیز کی تیاریاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ سو ان کے بی اے کرتے ہی ان کے ابا میاں نے ان کا رشتہ اپنے دور پرے کی کزن کے بیٹے حسن ضیاء کے ساتھ طے کر دیا۔ جو ان کا بھتیجا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا ہونہار اور فرمانبردار شاگرد بھی تھا۔ حسن ضیاء کے ساتھ ان کا نیا رشتہ کیا جڑا، آنکھوں نے نیندوں سے ناطہ توڑ، خوابوں کے سنگ رشتہ جوڑ لیا۔ اور پھر جلد ہی یہ سب خواب پورے ہوگئے۔ دونوں خاندانوں کو باہمی رضامندی کے ساتھ دھوم دھام سے ان کی شادی ہوگئی۔ اور حرمت النساء اپنا بچپن، اپنا لڑکپن، اپنی گڑیاں اپنے کھلونے، کتابیں سب بابل کے آنگن میں چھوڑ کر پیا دیس سدھاریں۔ حسن ضیاء کا آبائی گھر ظفروال کے قریبی گاؤں میں تھا جبکہ وہ خود نوکری کے سلسلے میں لاہور میں ہی رہتے تھے۔ شادی سے پہلے تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرتے تھے مگر اب چونکہ ان کی خود کی فیملی تھی لہذا انہیں رہائش کا بندوبست کرنا تھا۔ وہ CA کرنے کے بعد ایک ویل نون کمپنی میں بڑی اچھی پوسٹ پر تھے اور ابھی ترقی کرنے کے بھی چانسز تھے۔

حرمت النساء شادی کے چند ماہ اپنے سسرال میں ہی رہیں۔ انہیں مجبوری کے عالم میں لاہور منتقل طور پر آنا پڑ گیا۔ ایک تو حسن کی جاب دوسرے اماں بی کی وجہ کہ وہ سیڑھیوں سے گر کر اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوا بیٹھی تھیں گو کہ حسن ضیاء کو سسرال شفٹ ہونے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے داماد کا سسرال میں رہنا معاشرے میں ہمیشہ ناپسندیدہ ہی عمل سمجھا جاتا ہے۔ چاہے بوڑھے بیمار تنہائی کے مارے ساس سسر دیوروں سے ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں یا اندھیری رات کو ڈاکو لٹیروں کے ہاتھ زخمی ہو جائیں۔ مگر

بیٹی کے والدین ہونے کے ناطے وہ اکلوتی بیٹی، اکلوتے داماد کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ کیوں کہ لوگ کیا کہیں گے۔

اور شاید اپنی جھجک کی وجہ سے حسن ضیاء کوئی گھر وغیرہ لے ہی لیتے، مگر اس سے پہلے ہی اماں بی نے اپنا بیر تڑوا کر ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ پھر سب کے سمجھانے پر وہ لوگ ابا میاں کی طرف اٹھ آئے۔ اماں بی جو کبھی معمولی نزلے کبھی بخار میں مبتلا ہو ہوئیں تھیں۔ اب جو بستر پر پڑیں تھیں دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو گئیں۔ قدرت نے ان کی حساس طبیعت کا خوب بھرم رکھا اور وہ کسی سے بھی زیادہ خدمت کروائے بغیر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔ حرمت النساء کے لیے یہ سانحہ بہت بڑا تھا۔ اماں بی کی نرم نرم آغوش ان سے ہمیشہ کے لیے چھن گئی تھی۔ وہ جانے کب تک اس صدمے کے زیر اثر بولائی بولائی پھرتیں کہ قدرت کو ان پر رحم آیا اور ان کی دل بستگی کا سامان زید کی صورت میں ان کی گود میں اتار دیا۔ وہ تو ان ننھے کھلونے کو پا کر بہلی تھی۔ ابا میاں کے بے رونق چہرے پر بھی جیسے رونق دوڑ گئی۔ زید ان کا سب سے زیادہ لاڈلا شہزادہ تھا۔ اور حسن کی تو اس میں جان تھی۔ پھر جلد ہی جلد زید کی محبتوں میں حصہ بٹانے، ان کے گلشن کو مہکانے کے لیے انعم بھی چلی آئی۔ اب اور انہیں زندگی سے کیا چاہیے تھا۔ حسن ضیاء کی پرموشن بھی ہو گئی تھی۔ ان کی سیلری میں ہینڈسم اماؤنٹ کا اضافہ ہوا تھا۔ اُدھر انعم کی پیدائش کے فوراً بعد حسن کے ابا جی نے اپنی ساری جائیداد اپنی زندگی میں ہی اپنے یتیم بچوں کے میں تقسیم کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں بھی خاصی رقم ملی، جس سے انہوں نے جوہر ٹاؤن میں پلاٹ لے لیا۔ زندگی بڑی پرسکون گزر رہی تھی نہ کوئی جھنجھٹ نہ کوئی فکر۔

''حرمت! ہم اپنے بچوں کو شہر کے بہترین اسکول میں داخل کروائیں گے۔ ہم اپنے بچوں کے فیوچر کو سیکور کرنے کے لیے ان کے نام سے پراپرٹی بھی لیں گے، میں چاہتا ہوں حرمت کہ بچوں کو کوئی کمی، کوئی احساس کمتری کبھی نہ ہو انہیں سوسائٹی میں موو کرنے کے لیے ان کی تگ و دو نہ کرنی پڑے جتنی کہ مجھے کرنی پڑی ہے۔!'' حسن ضیاء نے کچھ اس طرح کہا کہ وہ چونکتے ہوئے بولی۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں اور کس طرح کی تگ و دو کرنی پڑی آپ کو؟ آپ نے مجھے بتایا نہیں کبھی؟!''

ہاں نہیں بتایا کسی کو بھی نہیں بتایا۔ حتیٰ کے بہت پیار کرنے والے اپنے والدین کو بھی نہیں بتایا۔ بہت سال پہلے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ایک جوشیلا اور باہمت جوان حصول علم کے لیے اپنا آپ منوانے کے لیے اپنا نام خود پیدا کرنے کے لیے اس بڑے شہر میں آیا تو، وہ باہر سے جتنا مرضی بہادر، اسٹرانگ اور جوشیلا لگ رہا تھا، مگر اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں خوف کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ ہار جانے کا خوف پیچھے رہ جانے کا خوف اپنے باپ کا اونچا شملہ اور کسی غلطی، کسی نادانی کے سبب مٹی میں رول دینے کا خوف، وہ نوجوان سارا دن قہقہے لگاتا۔ اونچا اونچا بولتا، خوب جم کر پڑھتا، اور شہری لڑکوں کو پیچھے چھوڑنے کے لیے مسلسل جہد و جہد کرتا۔ مگر جیسے ہی رات اپنے پنکھ پھیلاتی وہ اپنے خوف سے لپٹ کر روتا راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے آپ کو ہمت دلاتا اور ہر صبح اٹھ کر سب سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ایک سیڑھی اور اوپر

چڑھنے کے لیے تیار کرتا۔ تم نہیں جانتیں حرمت! یہ سب کس قدر مشکل تھا۔ وہ دور وہ جہدو جہد وہ کامیابیوں کی راہ میں اندھا دھند دوڑنا اور راستے میں ہی کھو جانا۔ مگر شکر ہے کہ مجھے ابا میاں کا سایہ شفقت میسر آ گیا اور میں بالآخر اپنی منزل کو پا ہی گیا۔ مگر حرمت! میں نہیں چاہتا کہ زید کو کسی بھی قسم کی کوئی پرابلم ہو اس لیے انہیں ہم فل سپورٹ کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں!'' انہوں نے حرمت النساء کے ہاتھ تھامتے ہوئے مضبوطی سے کہا تو وہ بھیگی پلکوں سے مسکرا دیں۔

☆......☆......☆

ابا میاں کی دعاؤں کے سائے تلے وہ اپنے بچوں کی بہترین پرورش کرتے انہیں ہر سرد و گرم سے بچائے ہوئے تھے۔ ان کے بچے، ان کے خوابوں کی حسین تعبیر ان کی آرزوؤں میں رنگ بھرنے کے لیے پڑھائی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ اول نمبر پر رہے تھے۔ زندگی اگر اسی طرح چلتی رہتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ نہ کوئی اتار چڑھاؤ، بس ہموار راہیں اور سبک رفتار سفر...... مگر نہیں! یہ زندگی ہے۔ پوری کی پوری زندگی۔ کوئی دو گھنٹے کا سفر نہیں کہ اس میں ہموار چلتا چلا جائے اور کوئی اسٹریٹ بریکر نہ آئے اور ان کی زندگی کی سیدھی رواں سڑک پر بھی بریکر آ گیا۔ ابا میاں کی وفات کا زبردست جھٹکا لگا انہیں۔ اس دنیا میں ہر آنے والے کو جانا بھی پڑتا ہے۔ ''کل نفس ذائقۃ الموت۔'' اور ابا میاں بھی انہیں چھوڑ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ جھٹکا ان سب کے لیے بہت بڑا تھا۔ اماں بی کی طرح ابا میاں بھی بہت کم بیمار پڑے تھے۔ بہت فٹ اور فعال زندگی گزار کر بڑے سکون سے اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوئے تھے۔ اس جھٹکے سے سنبھلنے میں انہیں وقت بھی لگا اور دقت بھی ہوئی مگر بہر حال وہ اس فیز سے بھی نکل آئے کہ غم کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو آہستہ آہستہ اس کا اثر زائل ہو ہی جاتا ہے۔ سو وہ لوگ بھی آہستہ آہستہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے اور یہ تو ہے جہاں غم ہوتے ہیں، وہیں خوشیوں کا پھیرا بھی پڑتا ہے۔ ان کے در پر بھی خوشیوں نے ایک بار دستک دی۔ انعم کے کلاس فیلو حمزہ کے والدین اس کے سوالی بن کر چلے آئے اور حمزہ کا فیملی بیک گراؤنڈ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کے والد کا اپنا بزنس ایمپائر تھا اور حمزہ سمیت اس کے دونوں بھائی بھی اپنے فیملی بزنس میں انوالو تھے اور جلد ہی حمزہ کا MBA کی ہائر اسٹڈی کے لیے USA جانے کا ارادہ تھا اور اس کے والدین چاہتے تھے کہ وہ جانے سے پہلے اس کی شادی کر دیں۔ اب یہ الگ بات تھی کہ وہ خود چاہتا تھا کہ وہ انعم کو بھی اپنے ساتھ امریکہ لے جائے۔ اور اس کے لیے تو ظاہر ہے شادی ہونا لازمی تھی۔

آپ کیا کہتے ہیں، کیا آپ کا خیال ہے اس رشتے کے بارے میں سچ پوچھیں تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اُن کے اور ہمارے ماحول میں بہت فرق ہے ان کا اسٹیٹس بہت ہائی ہے۔ کہیں کل کو ہماری بچی کو کوئی مشکل نہ ہو۔ آپ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے گا۔''

''ہوں!'' کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں مگر یہ بھی تو دیکھیے ناں! کہ انعم اس رشتے سے کتنی خوش ہے اور بیگم صاحبہ اگر حمزہ کے گھر والوں کا اسٹیٹس ہائی ہے تو ہم بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ ماشاء اللہ زید بھی کتنی اچھی جاب پر لگ گیا ہے۔ بہت اچھی پوسٹ پر اور زین کا لاء بھی مکمل ہونے والا ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ وہ بھی بہترین وکیل کے روپ

میں نظر آئے گا اور پھر میں کون سا ابھی ریٹائر ہو گیا ہوں جو آپ فکر مند ہو رہی ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہی ہوگا۔! حرمت کی فکر بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی ماں ہونے کے ناتے اپنے اکلوتی بیٹی کا اپنے سے اتنی دور چلے جانا انہیں ڈرا رہا تھا۔ مگر حسن ضیاء نے انہیں کچھ اس طرح مطمئن کیا کہ ان کے ساتھ ساتھ دروازے کے باہر کھڑی انعم کو بھی اپنی اور حمزہ کی آنے والی خوشگوار زندگی کی پوری امید بندھ گئی۔

☆......☆......☆

''امی جان آپ اس طرح کیوں کھڑی ہیں؟ کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے ناں آپ کی طبیعت تو......؟ وہ ابھی جانے کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی اپنے ماضی کی چلتی فلم کو دیکھے چلی جاتیں کہ سونیا نے آ کر انہیں ان کے کندھوں سے تھاما اور اپنی طرف ان کا رُخ کرتے ہوئے چونک گئی۔

کیا ہوا امی جان؟ آپ رو رہی ہیں کسی نے کچھ کہا ہے آپ سے یا صغری۔ صغری ...... صغری!'' اس نے اپنی بات درمیان میں چھوڑ کر صغری کو پکارا۔

''ارے نہیں بیٹا! صغری نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ اس غریب کو مت ڈانٹو تم۔ میں خود ہی اِدھر کھڑی ہوں وہ تو مجھ سے کہہ رہی تھی کہ گیسٹ روم میں جا کر آرام کرو مگر میرا دل نہیں مانا بیٹا! میں تو بس یہ سوچ رہی تھی کہ اگر کل کو تم بھی فارحہ کی طرح مجھ سے تنگ آ گئیں تو میرا اگلا ٹھکانہ کون سا ہوگا؟ کہاں جاؤں گی ایدھی ہوم...... کسی اولڈ ہوم یا پھر کسی شیلٹر ہوم میں۔'' جو مجھ جیسی عورت کو کون پناہ دے سکے گا۔ بھلا جس کے بیٹے گھر بدر کر دیں!'' کیا تھا ان کے لہجے میں، کیسا ٹوٹا بکھرا انداز تھا ان کا سونیا کی روح تک کانپ گئی۔

''امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔'' اور خدانخواستہ کیوں نکالیں گے۔ مجھے بتائیں کیا فارحہ بھابی نے...... آپ کے بیٹے آپ کو گھر سے۔ یہ آپ کا گھر ہے امی جان! آپ کا اپنا گھر ہے۔ مالک ہیں آپ یہاں کی ہر شے کی۔ کیا ہم بھول گئے کہ آپ نے اور ابا جان مرحوم نے کس محبت سے محنت سے اس مکان کو گھر بنایا تھا۔ کیا ہم بھول گئے کہ کس قدر عزت اور مان کے ساتھ آپ نے ہمیں یہاں بسایا تھا۔ نہیں امی جان! ہم کچھ نہیں بھولے نہ بھول سکتے ہیں۔ کیسے بھول جائیں آپ کی محبت، شفقتوں کو کیوں اتنا ڈی گریڈ کیا آپ نے خود کو...... مجھے بتائیں...... ہوا کیا ہے آپ کے ساتھ......؟ مگر کیوں......! سونیا کو حیرت کے ساتھ ساتھ شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ ان کی باتیں جیسے اس کا کلیجہ چیر گئیں تھیں۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں ہوں بیٹا! آج کل تو فارحہ کا مزاج ہر وقت سوا نیزے پر رہتا ہے۔ مجھے خود سمجھنے میں بے حد دقت ہو رہی ہے کہ وہ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ ٹھیک ہے ساس بہو کا جھگڑا ہر گھر میں ہو جاتا ہے اور یہ رشتہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس میں بھی کبھار تلخی آ جاتی ہے مگر اس طرح کا سلوک میری تو عقل نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ پہلے تو چلو پھر بھی کوئی لحاظ مروت کر لیتی تھی، مگر اب پچھلے چند ہفتوں سے تو اس سے بھی گئی۔ جانے کیوں اتنی بدتمیزی کے ساتھ مجھ سے بات کرتی ہے۔ میں اپنی نگاہوں میں خود گر جاتی ہوں یہاں تک کہ نوکروں کے سامنے بھی مجھے ذلیل کرنے میں اسے کوئی لحاظ نہیں ہوتا بچے تو پھر بچے ہیں۔ ایسی صورت حال کے بعد تو میرا حوصلہ بالکل ڈھے گیا ہے اور آج تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ

مجھ جیسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے میرا بیٹا مجھے یہاں چھوڑ گیا۔ اب اس نے ایسا کیوں کہا یہ وہ زیادہ بہتر جانتی ہے میں نہیں۔!''

''ہوں آپ فکر مت کریں ہم خود پوچھ لیں گے ان سے۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی آپ پر شک کرنے کی، ماں ہیں آپ ہماری۔ کوئی اٹھارہ سال کی ٹین ایجر لڑکی نہیں۔ اور آج کل تو اتنی پابندیاں ٹین ایجر بھی برداشت نہیں کرتے۔ بہر حال آپ بے فکر رہیں آرام کریں ہم آج ڈنر باہر کریں گے اور وہ بھی آپ کے فیورٹ ریسٹورنٹ میں!'' سونیا نے انہیں ساتھ لگا کر تسلی دی اور پھر انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

☆......☆......☆

گھر میں شادی کی تیاریاں زور شور سے ہو چکی تھیں۔ اور انہیں مصروف ترین اور ہنگامہ پرور دنوں میں ایک خوشگوار واقعہ پیش آیا۔ ایک شام زید کے ساتھ ایک خوبصورت اور معصوم سی لڑکی ان سے ملنے چلی آئی۔

''ابا جان! یہ فری ہے۔ میرے دوست فرحان کی کزن۔ اور فری یہ ہیں میرے امی ابو۔ امی ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اور آج میں ملوانے آپ سے اس لیے لایا ہوں تا کہ آپ ایک دوسرے سے مل لیں۔ ابا جان آپ انعم کے ساتھ ہی ہماری شادی کروا دیں کیوں کہ آج کل فری کے گھر والے اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ......'' حسن ضیاء نے بغور ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہر انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ شادی تو وہ کر کے رہیں گے اور اگر اس وقت ان کی بات نہ مانی تو وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں شاید کورٹ میرج تک۔ مگر حسن ضیاء اتنے نادان نہیں تھے کہ جوان بیٹے سے اختلاف کر کے اسے ہاتھوں سے نکال دیتے۔

''ٹھیک ہے بیٹا! زندگی آپ کی ہے اور اس کے لیے ساتھی منتخب کرنے کا اختیار بھی آپ کو ہونا چاہیے۔ اور آپ نے اپنے لیے فری بیٹی کو چنا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض کیوں ہونے لگا۔ اور پھر آپ لوگ سمجھدار بھی ہیں باشعور بھی ہیں اپنا برا بھلا سب جانتے ہیں آپ بس ہمیں یہ بتا دیں کہ ان کے والدین سے ان کا ہاتھ مانگنے کب جانا ہے۔ ہم خوشی خوشی جائیں گے اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے۔'' زید کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ حسن نے بہت خوش دلی سے فری کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اور کیا! آپ کے ابا جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ آپ کی خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے۔ اللہ آپ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ اور ہمارے بچوں کے سارے دلی ارمان پورے کرے آمین۔ حرمت نے اپنی کلائی سے کنگن اتار کر فری کی کلائی میں پہناتے ہوئے بہت محبت اور مان سے کہا تو وہ پہلی بار مسکرا دی۔ شاید اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا بغیر کسی رکاوٹ کے اس نے اپنی محبت کی جنگ جیت لی۔ مگر اب زین کے نام کے کنگن اپنی کلائی میں سجے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا۔

اور پھر پروگرام میں تھوڑی تبدیلی سے دونوں شادیاں بخیر خوبی انجام پا گئیں۔ ایک بیٹی کو انہوں نے دعاؤں کے ساتھ گھر سے رخصت کیا تو دوسری کو محبتوں کی چھاؤں میں گھر لے آئے۔ زین کی پڑھائی بھی زور شور سے چل رہی تھی۔ اس نے ایک مشہور معروف وکیل کے ساتھ جونیئر کے طور پر کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اُدھر انعم

اور حمزہ کے کاغذات بھی مکمل ہوئے اُدھر حسن ضیاء نے اپنے والد محترم کے نقش وقدم پر بھی چلتے ہوئے، اپنی زندگی میں ہی اپنی ساری جائیداد اپنے بچوں کے نام کر دی تھی۔ انعم کے حصے کے پلاٹ اور کاغذات اس کے حوالے کر دیے اور باقی دونوں بیٹوں اور بیوی کے نام کر کے ایک طرح سے فارغ ہوئے۔

انعم اور حمزہ کے امریکہ چلے جانے کے بعد ان کی زندگی واپس روٹین کی طرف لوٹ آئی اور پھر جیسے ہی وہ ریٹائر ہوئے انہیں زین کے لیے خریدے گئے پلاٹ پر کنسٹرکشن کا شوق چرایا۔ انہوں نے بڑے شوق سے محبت سے زین اور اس کی منگیتر جو کہ انکی بھتیجی تھی کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید انداز کا خوبصورت بنگلہ تعمیر کروایا۔

ان کا زیادہ تر وقت کنسٹرکشن سائٹ پر گزرتا اور حرمت النساء گھر سنبھالنے اور سنوارنے میں مصروف رہتی کہ فری کے اور تلے کے دو بچوں نے تو اس کی خاصی مت مار دی تھی۔ ایسے وہ اس پر گھر داری کا مذید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے اس قدر ہمدردرویے اور خیال رکھنے کے باوجود فری جانے کیوں اکھڑی اکھڑی خاموش رہا کرتی بظاہر تو اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ نہ کوئی ظالم سماج، نہ روک ٹوک...... مگر پھر بھی ان دیکھا کچھ ضرور تھا۔ جو اسے گھر والون سے کھلنے ملنے نہ دیتا تھا۔

جلد ہی زین کا گھر مکمل ہو گیا اور ساتھ ہی انہوں نے اس کی شادی کی تاریخ رکھ دی بڑے دونوں بچوں کی طرح اپنے سب سے چھوٹے لاڈلے بیٹے کی شادی بھی انہوں نے خود دھوم دھام سے کروائی انعم اور حمزہ بھی ان کی شادی میں بڑے جوش وخروش سے شریک ہوئے تھے۔ اور پھر اسی محبت کے ساتھ نئے جوڑے کو نئے گھر میں شفٹ کر دیا گیا۔

یہ بھی دستور زندگی ہے۔ جہاں نئے جوڑے بنتے ہیں وہیں پرانی جوڑیاں ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ کوئی آ رہا یہ کوئی جا رہا ہے ہر کوئی یہ ریت نبھائے جا رہا ہے۔ حسن ضیاء بھی اس روز اچھے بھلے صبح اپنے پوتوں کو روز کی طرح پیار کر کے، حرمت اور فری کو اللہ حافظ کہہ کر اپنے شاپنگ پلازہ کا چکر لگانے گئے تھے۔ جہاں ان کی دوکانیں تھیں۔ مگر شام کو واپس اپنے پیروں پر چل کر نہ آ سکے۔ وہ تو اپنے دھیان اپنی لین میں مناسب رفتار پر بائیک پر چلے جا رہے تھے۔ مگر موت جوان کے تعاقب میں تھی اس کی رفتار بڑی تیز تھی گولی سے بھی زیادہ تیز۔ اور کیوں نہ ہوتی انہیں لے جانے ہی تو آئی تھی۔ سو انہیں لے جائے بغیر کیسے واپس جاتی سو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور درمیانی رفتار سے چلنے والی بائیک صرف ایک خالی جوس کاٹن پہیے کے نیچے آنے سے لہرائی اور سیدھی اپنی سوار سمیت نہر میں جا گری۔ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ اور بازی تھپ۔ سب ٹھاٹھ دھرا کا دھرا رہ گیا اور بنجارہ چلتا بھی بنا۔

☆......☆......☆

"یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابی آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔...... ایسے کیسے...... کس طرح......؟!"

نا بھابی ناں! کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہمیں۔ وہ لوگ خود آئے۔ عثمانی صاحب اور ان کا بیٹا اور بہو۔ اور وہ لوگ کیوں آئے کیسے آئے؟ کس کے کہنے پر آئے۔ اتنی نادان تو تم بھی نہیں ہو ناں۔ آخر کو اتنی بڑی وکیل ہو کچھ تو اندازہ ہو گا ہی

تمہیں بھی ناں؟'' سونیا کی بات بڑے غصے سے کاٹتے ہوئے فارحہ نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ سلگ کر رہ گئی۔

''بھابی پلیز! اول تو میں مان ہی نہیں سکتی کہ ایسا ویسا کچھ ہے اور اگر ہے تو کیا برا ہے۔ آپ خود ہی بتائیں وہ عثمانی انکل کی بہو بھی تو بہو ہی ہے ناں۔ وہ اگر ایسا سوچ سکتی ہیں تو آپ اور میں کیوں نہیں؟

''ارے ہٹاؤ! توبہ ہے تمہیں میں ہی نظر آئی ہوں ان خرافات کے لیے جاؤ بی بی بخشو مجھے۔ میں بھر پائی۔ تم بھی تو بہو ہو ناں تم سوچ لو تمہارا تو رشتہ ویسے بھی بڑا مضبوط ہے ان کے ساتھ آخر کو ان کی چہیتی بھتیجی بھی تو ہو ان کے مرحوم شوہر کی۔ سو، جو کرو گی بہتر کرو گی مجھ سے کوئی توقع نہ رکھنا تم بالکل بھی......!'' فارحہ نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے لٹھ مار انداز میں کہا تو سونیا کھڑی ہو گئی۔

ٹھیک یہ بھابی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ جو میں آپ سے اکیلے بات کرنے کے لیے آ گئی اور وہ بھی اس وقت جب آپ اکیلی تھیں۔ مجھے آپ کے دیور کے ساتھ ہی آنا چاہیے تھا۔ اور بھیا کی موجودگی میں ہی بات کرنی چاہیے تھی۔ غلطی ہو گئی اب چلتی ہوں۔ مگر آپ سے اب ان دونوں کے سامنے ہی بات ہو گی۔ اور اگر کسی انتہائی فیصلے تک ہمیں پہنچنا پڑا، جس میں امی کی بہتری ہوئی تو ہم آپ کے کسی اعتراض کو ذرہ برابر خاطر میں نہیں لائیں گے یاد رکھیے گا آپ۔!'' بیگ کندھے پر ڈالتی گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کر رہی تھی۔ اور وہ بھی فارحہ ہی کیا جو کسی کی وارننگ برداشت کر لے۔ اور وہ بھی سونیا کی۔

''اگر یہ بات ہے تو تم کان کھول کر سن لو اگر تم لوگوں نے کوئی ایسا ویسا کارنامہ سرانجام دیا تو یاد رکھنا تم لوگوں سے ناطہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں جینا مرنا ختم کر دوں گی تم لوگوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے، اسی کے انداز میں اسے وارن کرتی فارحہ بھی فل جارحانہ موڈ میں تھی۔

معاف کیجیے گا بھابی! ناتے تو آپ نے پہلے بھی کچھ خاص نہیں چھوڑے اور رہی بات مرنے جینے کی تو، وہ سب نے اپنے لیے ہی جینا اور اپنی ہی موت مرنا ہوتا ہے۔ اس کی آپ ٹینشن نہ لیں چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔

بڑے سکون سے کہتی سونیا باہر نکل گئی اور فارحہ کو مزید پتنگے لگا گئی۔ وہاں سے آنے کے بعد سونیا نے اپنے طور پر تحقیق کی تو بہت کچھ اس کے سامنے آیا اس نے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اپنے شوہر کے ساتھ ساس اور نند کو بھی شامل کر لیا۔ اور پھر کافی روز کی جستجو اور سوچ بچار کے بعد وہ لوگ بلآخر ایک منطقی نتیجے پر پہنچ ہی گئے۔

☆......☆......☆

جوہر ٹاؤن بی بلاک کے اس خوبصورت بنگلے میں اس وقت بڑی خوشگوار سی رونق تھی۔ زین اور سونیا کے ساتھ انعم اور حمزہ بہت خوشگوار انداز میں مہمانوں سے مل رہے تھے۔ ان کے بہت قریبی عزیزوں کے ساتھ ان کے دوست احباب بھی موجود تھے۔ اور جن دو لوگوں کے اعزاز میں یہ محفل سجائی گئی تھی۔ وہ بہت پروقار انداز میں سامنے سجے ہوئے صوفے پر بیٹھے مہمانوں سے مبارک باد وصول کر رہے تھے۔ سب کے چہرے بے حد کھلے کھلے اور اندرونی خوشی سے جگمگا رہے تھے اور یہ علیحدہ بات تھی کہ اس خوشی کو حاصل

کرنے اور اس تقریب با سعید کو منعقد کرنے کے سلسلے میں ان لوگوں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

زین اور سونیا نے سارے حالات کا بڑی گہری نظر اور ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیا تھا۔ فارحہ کی طرح جذباتی اور زید کی طرح بے حس ہوئے بغیر...... اور یہ تو الگ داستان تھی کہ وہ کیسے کیسے مرحلوں سے گزرے تھے، پھر جیسے ہی انہوں نے انعم اور حمزہ سے بات کی تو خلاف توقع وہ ان کے ہم خیال ہی نکلے اور ان کی مدد کرنے کے لیے وہ فوراً چھٹی لے کر پاکستان آ گئے جس سے انہیں کافی سہارا ملا، لیکن اس کا کیا علاج کے جس مقصد کے لیے یہ سب اکٹھے ہوئے تھے اور جس فرض اور جس سنت کو دل سے ادا کرنا چاہتے تھے اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو وہ خود ہی تھیں جن کے لیے فکر مند ہوتے ہوئے وہ اتنے ہفتوں سے خوار ہو رہے تھے سب کے، سمجھانے، زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''ان کی'' طرف سے ان سب کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیے جانے کا اعلان صادر ہو گیا تھا۔ اب ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ فریق ثانی کو فریق اوّل کے مقابل لا کھڑا کیا جاتا۔ اور باقی سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا جاتا۔ سو انہوں نے باہمی رضامندی سے ایسا ہی کیا۔

''آپ مجھے بتانا پسند کریں گی حرمت النساء کہ آپ کو کوئی اعتراض کس بات پر ہے۔ بچوں کی خواہش پر، یا میری ذات پر آخر آپ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہیں۔ یہ بچے آپ کا فائدہ ہی تو سوچ رہے ہیں آخر کیا برائی ہے اس میں؟'' وہ جانے کن سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ ان کے قریب سے آواز ابھری جس پر انہوں نے چونک کر سنگی بینچوں پر اپنے سے قدرے فاصلے پر بیٹھے شخص کی طرف دیکھا تھا۔

''عثمانی صاحب! آپ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ میں تو سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ مگر آپ بھی ان بچوں کے ساتھ مل کر بچہ بن گئے ہیں۔ بڑے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ پھل موسم کا بات وقت پر اچھی لگتی ہے اور ہر کام کے لیے ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور جیسی خواہش آپ لوگ کر رہے ہیں وہ اب...... اس عمر میں......؟ ناممکن ہے...... بھلا لوگ کیا کہیں گے۔ زمانہ تھوتھو کرے گا وہ تو سب ناسمجھ، نادان ہیں مگر میں اور آپ تو دانا و بینا ہیں ناں...... تو پھر کیسے......!؟''

''لوگ......؟ کون لوگ؟ کن لوگوں کی بات کر رہی ہو آپ حرمت۔ یہ راہ چلتے لوگ ہمارے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ یہ اجنبی لوگ ہمیں جانتے ہی کتنا ہیں اور جب وہ ہمیں جانتے ہی نہیں۔ جب وہ ہمارے لیے اور ہم ان کے لیے سراسر اجنبی ہی ہیں۔ تو پھر ان کو کیا ضرورت ہے ہمارے بارے میں باتیں بنانے کی۔ اور اگر آپ کا اشارہ اپنے رشتہ داروں، اپنے بچوں کی طرف ہے تو وہ باتیں کیوں بنانے لگے۔ وہ تھوتھو کیوں کریں گے۔ جب کہ وہ تو خود دل سے ہی ایسا چاہتے ہیں۔ آپ کی بیٹی داماد جو امریکہ سے صرف آپ کی خوشی اور آپ کو خوش دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ اپنا سب کام دھندا چھوڑ کر۔ اور آپ کا بیٹا بہو کتنے دنوں سے اپنی ساری مصروفیات چھوڑے صرف اور صرف آپ کے پیچھے خوار ہو رہے ہیں اور میرا بیٹا اور بہو، جو ہر دن رات آپ سے التجائیں کر رہے ہیں۔ آخر کس لیے۔ مجھے بتائیں نا حرمت...... آخر کس لیے۔ صرف اور صرف آپ کو اس عذاب سے بچانے

کے لیے ہی ناں، جو حسن کی جدائی کے بعد آپ کا مقدر ہو گیا ہے بتائیں ناں حرمت۔ جب وہ لوگ اتنے فکرمند ہیں آپ کے لیے تو وہ کیوں باتیں بنائیں گے آخر کیوں......؟'' عثمانی صاحب نے ان کی بات کاٹ کر کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دل ہی دل میں قائل ہو چکی تھیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے عثمانی صاحب! مگر میرے لیے حسن ہی سب کچھ تھے۔ کل بھی اور آج بھی۔ میں نے اپنی ساری زندگی ان کے نام کر دی تھی، ان کے علاوہ کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تب بھی نہیں جب پانچ سال پہلے وہ مجھے اچانک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور مجھے خود کو یقین دلانے میں اتنے برس گزر گئے کہ اب میں اکیلی رہ گئی ہوں تو اب تو میں تسلیم کر چکی۔ اور خود کو ان کی یادوں کے سہارے جینے کی عادی بھی بنا چکی تو اب یہ کیسے ممکن ہے میں ان کی جگہ کسی اور کو دے دوں ناممکن...... یہ مجھ سے نہیں ہوگا کبھی بھی نہیں۔''

''تو آپ کو کون کہہ رہا ہے۔ آپ حسن کی جگہ کسی اور کو دیجیے کوئی کسی کی جگہ کیسے لے سکتا ہے حرمت۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ ہماری زندگی سے جڑے ہر شخص کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہر رشتہ، ہر ناطہ اپنے مقام پر ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ نے تو حسن کی بھرپور اور خوشگوار رفاقت میں زندگی گزار دی مگر میں...... میں اپنی ادھوری رفاقت دینے والی ادھوری رفیق حیات کی یادوں سے اب تک خود کو بہلاتا رہتا ہوں۔ میرا بیٹا شائق صرف پندرہ سال کا تھا، میٹرک کا اسٹوڈنٹ جب میری محبوب بیوی شائقہ دس سالہ طویل بیماری سے جنگ کرتے کرتے آخر کار ہار گئی۔ موت جیت گئی اور میری شائق کی محبت روتی سسکتی رہ گئی شائقہ نے اپنی زندگی کے آخری سال بیماری میں بستر کی ہی ہو کر گزارے۔ اس کے باوجود میری اس سے محبت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ روز بروز اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ گھر کا سارا انتظام میری دور کی بیوہ اور بے اولاد چچی بی دیکھتی تھیں۔ شائقہ کی دیکھ بھال کے لیے کل وقتی نرس ہونے کے باوجود میں بھی اپنا سارا فارغ وقت اس کے ساتھ اور شائق کے ساتھ گزارتا۔ ہمیں علم تھا کہ وہ ہمیں کسی بھی وقت چھوڑ کے جا سکتی ہے۔ کینسر نے اس کے سارے جسم میں اپنے زہریلے اور نوکیلے پنجے بڑی مضبوطی سے گاڑ رکھے تھے۔ مگر پھر بھی جانے وہ کون سی کوشش میں تھی کہ وہ ایک طویل عرصے تک اپنی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہماری محبت ہمیں اسے پچھاڑے چلی جا رہی تھی مگر پھر مہلت ختم ہوئی جتنا وقت اسے دیا گیا پورا ہوا...... جتنا عرصہ ہم نے مل بیٹھنا تھا، ہنسنا بولنا تھا تمام ہوا اور وہ باتیں کرتی کرتی اچانک خاموش ہو گئی۔ ہمیشہ کے لیے یہ بھی جانتے ہوئے کہ ایسا ہونا ہی تھا۔ یہ تو طے تھا۔ ہم باپ بیٹا بے یقینی کی سولی پر لٹک گئے۔ چچی بی ہماری حالت دیکھتی رو زار زار روتیں...... اور پھر اس بوڑھی غمگسار خاتون اور معصوم سہمے ہوئے بچے کے لیے مجھے چھوڑ کر خود کو سنبھالنا پڑا۔ واپس زندگی کی طرف آنا ہی پڑا۔

حرمت! آپ جانتی ہیں جب شائقہ کا انتقال ہوا میں جوان تھا اور شائق کی عمر کم تھی میں چاہتا تو دوسری شادی کر سکتا تھا۔ اپنی زندگی کی ویرانیاں اور اپنے خاموش گھر کی خاموشیاں بڑی آسانی سے ختم کر سکتا تھا۔ کسی بھی رنگین آنچل کے خوبصورت رنگوں سے اپنی ظاہر ویران اور اجاڑ

زندگی کو رنگ سکتا تھا۔ کہ میرے مالی حالات بھی شاندار تھے اور مجھے قائل کرنے اور فورس کرنے والے بھی بہت تھے۔ مگر حرمت! میری زندگی اجاڑ اور ویران کہاں تھی۔ میرے گھر میں اگرچہ خاموشی اور سناٹا وقتی طور پر چھا گیا تھا۔ میرے اندر بڑی رونق تھی۔ شائقہ دنیا کے لیے جا چکی تھی۔ مگر میرے لیے تو آس پاس ہی موجود تھی۔ اس کے ہونے کے احساس ہر وقت میرے ساتھ رہا پھر میں اکیلے کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لیے جب چچی کے پرزور اصرار پر بھی میں نہ مانا تو وہ خاموش ہو گئیں میں نے اپنی پوری توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کر دی اور الحمد اللہ آج میرا بیٹا ایک مکمل اور بھرپور زندگی گزار رہا ہے۔

اریبہ! میرے بچپن کے دوست کی اکلوتی بیٹی تھی اور میں نے ان دونوں کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دوستی کو رشتہ داری میں بدل دیا۔ مگر ایک فضائی حادثے میں اریبہ کے ساتھ ساتھ میں نے بھی اس دوستی، اس رشتہ داری کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا اریبہ بری طرح سے بکھر گئی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والدین کی بہت لاڈلی تھی۔ ان کی اچانک وفات نے اسے عظیم ترین نقصان سے دوچار کیا۔ پھر ہم سب کی محبتوں نے اسے واپس زندگی کی آنے میں مدد کی۔ پھر ننھے عیان، شایان اور ریان کی آمد نے بھی ہماری زندگیوں میں کئی نئے اور خوبصورت رنگ بھر دیے۔ مگر حرمت النساء ایک بیٹی اور ایک بہن کی کمی مجھے اور شائق کو ہمیشہ محسوس ہوتی رہی اور میں اب یہ کمی اپنے پوتوں کی آنکھ میں بھی ضرور دیکھتا ہوں وہ ہم سے اپنے دوستوں کی باربی ڈولز جیسی بہنوں کی چھوٹی چھوٹی شرارتوں کا ذکر اس قدر اشتیاق بھرے انداز میں کرتے ہیں کہ ان کے دل میں پلنے والی خواہش صاف نظر آتی ہے مگر اب شاید ایسا ممکن نہیں رہا، کیوں کہ ریان کی ولادت کے دوران اریبہ کچھ ایسی کمپلیکیشنز کا شکار ہوئی کہ پھر دوبارہ ماں بننے کا چانس ہی نہیں رہا۔ لیکن جب سے وہ حبہ اور مشعل سے ملے ہیں لگتا ہے جیسے انہیں بہن مل گئی ہیں۔ اور صرف انہیں ہی کیوں شائق اور اریبہ کو بھی تو بہن اور بھائی جیسے پیارے رشتے مل گئے ہیں۔ مجھے ان تمام بچوں کی آنکھوں میں سچی خوشیوں کا سمندر ٹھاٹیں مارتا نظر آرہا ہے۔

کیا آپ انہیں دیکھ پا رہی ہیں یا دیکھ کر بھی ان دیکھا کر رہی ہیں!'' عثمانی صاحب کے اس طرح اچانک پوچھنے پر وہ گڑبڑا سی گئی۔

حرمت النساء! کیا آپ میری درخواست قبول کریں گی......؟ پلیز حرمت ان بچوں کی خوشیاں ان سے مت چھینیں۔ ایک فارحہ جیسی خود غرض بہو اور زید جیسے بے حس بیٹے کو خوش کرنے کے لیے آپ اتنے سارے دلوں میں بسی اتنی ساری خوشیاں اور ان آنکھوں میں سجائے سپنوں کو کیسے توڑ سکتی ہیں۔

آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں حرمت؟ بتائیں مجھے پلیز کچھ تو بولیں آپ......؟ عثمانی صاحب نے کچھ اس انداز میں کہا کہ ان کی کہی ہر بات حرمت النساء کے دل میں اترتی چلی گئی۔ انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے لگیں۔

حرمت النساء! میں پھر پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ اپنی زندگی کا باقی ماندہ سفر میں مجھے ہمراہی کا شرف بخشنا پسند کریں گی۔

یقین مانیں! میں آپ کو بالکل بھی اُداس نہیں ہونے دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ حسن کو بھلانا آپ کے لیے اور شائقہ کو بھلانا میرے لیے کچھ

ایسا آسان بھی نہیں...... اور سچ پوچھیں تو میں ایسا
چاہتا ہی نہیں اب اس عمر میں ''جیون ساتھی'' کا
مطلب سچے اور اچھے دوست کا ہوتا ہے جس سے
ہم اپنے دل کی باتیں کر سکیں۔ جس کے دل کی
باتیں بن کہے جان سکیں۔ جو ہمارا خیال رکھے ہم
اس کا خیال رکھیں اور آنے والے دائمی وقت کے
لیے خود کو بہتر طور پر تیار کر سکیں۔ ساری زندگی جو
کھیتی بوئی، اس کی فصل کاٹیں اور اپنے لگائے
ہوئے پھلدار درختوں کی چھاؤں میں آرام سے
بیٹھ کر ان میٹھے رسیلے پھلوں کا مزہ لیں۔ تو حرمت!
کیا آپ میرے ساتھ ان گھنے درختوں کی چھایا
میں بیٹھنا پسند کریں گی وہ اپنی چوڑی ہتھیلی ان کے
سامنے پھیلاتے ہوئے سوالیہ انداز میں انہیں
دیکھ رہے تھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے عثمانی صاحب مگر......!'' وہ
ابھی بھی تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھیں۔

''دیکھیں حرمت! آپ کی جھجک اور
تذبذب کو میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے دل میں
بھی ابھی بھی لوگوں کا خوف ہے، دنیا کا ڈر ہے۔
تو آپ اسے نکال پھینکیں اللہ اور اس کے رسول کا
فرمان یاد کریں آپ، کیا ہمارے نبی ﷺ دو
جہاں کی ہدایت نہیں کہ بیوہ کا نکاح ثانی کرنے
میں جلدی کرو۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے
جن کاموں میں جلدی کرنے کا حکم دیا ہے کیا ان
میں بیوہ عورت کی دوسری شادی کا حکم نہیں؟ جب
یہ حکم ہے اور اللہ پاک کو یہ عمل پسند ہے، تو پھر آپ
دنیا کے ڈر سے اسے کیوں کرنے سے روکنا چاہتی
ہیں۔ دنیا کا، فارحہ کا، زید کا خوف اللہ کے حکم سے
بڑا ہو گیا ہے کیا؟'' اور اب حرمت النساء کے
پاس انکار کا جواز ہی کہاں بچا تھا کہ قائل تو شاید وہ
پہلے ہی ہو گئی تھی۔ بس ذرا جھجک سی تھی جو عثمانی
صاحب کے اس بیان نے دور کر دی۔

ہوں...... ٹھیک ہے عثمانی صاحب! اگر آپ
سب کی یہ ہی خوشی ہے اور اللہ کی اسی میں رضا ہے
تو میں کیا کہہ سکتی ہوں سوائے اس کے کہ میں بھی
راضی ہوں۔ مگر میری بھی ایک شرط ہے! انہوں
نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تو عثمانی صاحب
کھل کر مسکرائے۔

''آپ کی جو بھی شرائط ہیں ہمیں سنے بغیر
منظور ہیں۔

تھینک یو امی...... شکریہ امی......!'' ان کی
بات ختم ہونے سے پہلے ہی جانے وہ کہاں سے وہ
سب نکل کر یک زبان کہتے ان سے لپٹ گئے۔

☆......☆......☆

اتوار کا دن تھا اور چھٹی ہونے کی وجہ سے
ناشتا بھی دیر سے ہوا تھا اور پھر سارے کام خواہ
مخواہ تاخیر کا شکار ہوتے چلے گئے تھے۔ اس وقت
سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ وہ چاروں حسب
معمول لان میں موجود تھے۔ بظاہر سب کچھ ویسا
ہی تھا روزمرہ جیسا...... مگر کچھ بھی پہلے جیسا نہ تھا۔

زید صبح کا پڑھا ہوا اخبار ایک بار پھر سے
کھولے اس میں سر دیے بیٹھا تھا۔ جبکہ فارحہ اس
کے سامنے بیٹھی مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ کبھی ہلکی تو
کبھی تیز آواز میں اپنی قسمت کو رونے کے ساتھ
ساتھ زید کے پچھلوں کو بھی کوسے جا رہی تھی۔ سنی
اور شیری ان سے کچھ فاصلے پر بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے
خود کو اس ساری بک بک سے لاتعلق ظاہر کرنے
کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے اور رہی گلناز وہ
تو بیچاری پچھلے کچھ دو دنوں سے ویسے ہی فارحہ
کے زیر عتاب آئی ہوئی تھی اور اس وقت بھی وہ
گیراج اور پورٹیکو کو پائپ لگائے دھونے میں
مصروف تھی۔ فارحہ باری باری سب کو دیکھتی اور

پھر کوئی نئی بات یاد آنے پر پھر سے شروع ہو جاتی۔ اور اس وقت بھی اس کا پارہ جانے اور کتنا چڑھتا کہ اچانک کال بیل چیخ اٹھی۔

''میں دیکھتا ہوں......؟'' کہتا ہوا سنی دروازے کی سمت بھاگا۔ اور ایک جھٹکے سے آہنی گیٹ وا کر دیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اندر آنے والی شخصیات کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئی۔ یہی حال گلناز کا بھی ہوا اس کے ہاتھ سے پائپ اور جھاڑو ایک ساتھ گرے، جس کی وجہ سے فارحہ کے ساتھ ساتھ زید اور شیری بھی چونک گئے تھے۔

''کون ہے سنی باہر، ایسے کیوں کھڑے ہو تم؟'' سنی کو بت بنا دیکھ کر فارحہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی، مگر اندر آتے ہستی کو دیکھ کر اس کا غصہ ایک دم عود کر آیا۔

''تم......؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟ اتنا سب کچھ کر گزرنے کے بعد...... اتنے ''گل کھلا'' چکنے کے بعد بھی اتنی ہمت ہے کہ تم اپنا مکروہ وجود لے کر ہمارے سامنے آ کھڑی ہو۔ کون ہے اب تمہارا یہاں......؟ کس کے لیے آئی ہو اب اِدھر۔ نکل جاؤ۔ ابھی اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے باہر۔

میں تمہارا ناپاک وجود اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی!'' چٹاخ سے زوردار آواز کے ساتھ پڑنے والے تھپڑ نے نہ صرف فارحہ کی قینچی کی طرح چلتی زبان روک دی بلکہ اس کا منہ بھی پھیر کے رکھ دیا۔

''بس! بہت سن لی تمہاری بکواس، بس اب اس سے زیادہ ایک بھی لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو زبان گدی سے کھینچ کر تمہارے ہاتھ میں رکھ دوں گی۔ جتنا سہنا تھا سہہ چکی۔ اب نہیں اب ایک لفظ اور نہیں...... سمجھی!'' حرمت النساء نے فارحہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بے حد سرد اور کٹیلے لہجے میں کہا تو وہ ان کے اس دبنگ انداز پر، منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''مجھے کل بھی تم لوگوں سے کوئی غرض، کوئی مطلب نہ تھا اور آج بھی تم جیسے بے حس خود غرض لوگوں کے سامنے آنا پسند نہ کرتی مگر کیا کروں تم لوگوں کا کچھ قرض تھا مجھ پر، جو مجھے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ آج وہ قرض اتارنے آئی ہوں ورنہ تم جیسی نافرمان، منہ پھٹ اور حاسدی عورت کے منہ لگنا بھی پسند نہ کروں!'' ایک ایک لفظ برف میں ڈھلا نیزے کی اَنی جیسا نوکیلا تھا۔ دل کو چھیدتا ہوا، روح میں خراشیں ڈالتا ہوا مگر تھا تو سچ ہی۔ اور سچ سے نظریں ملانا ہر کسی کے بس کی بات کہاں۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جن کی زندگی میں جھوٹ، عناد اور بغض کی مکمل اجارہ داری ہو۔ اس لیے فارحہ اور زید بھی نظریں چرائے کھڑے تھے، کیوں کہ اس وقت ان کے سامنے حرمت النساء حسن نہیں، حرمت النساء عثمانی کھڑی تھیں۔ بے حد نفیس اور قیمتی لباس میں ملبوس، بہت پر وقار اور ڈیشنگ پرسنالٹی والے عثمانی انکل کے پہلو میں۔ پر وقار اور رعب دار جوڑا، جن کے رعب کی وجہ سے ہی فارحہ کی بولتی بند ہو گئی تھی اور زید کی نگاہیں زمین میں گڑی جا رہی تھیں۔

حرمت النساء! ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ آپ وہ کام پورا کریں ہمیں واپس بھی جانا ہے، بچے ہمارا بے صبری سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ عثمانی صاحب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ان کی توجہ اپنے ہاتھ میں پکڑی فائلز کی طرف

دلائی تو وہ بھی جیسے کہیں دور سے واپس آئیں۔

''تم اس قابل ہو تو نہیں مگر کیا کروں میری مجبوری ہے کہ زید ہمارے گلشن میں کھلنے والا پہلا پھول میرا اور حسن کا بے حد لاڈلا بچہ...... اور تم اس کی پسند، اس کی چاہت اور محبت اور پھر سب سے بڑھ کر ہمارے پوتوں سنی اور شیری کی ماں ہو۔ اور ماں تو جیسی بھی ہو ماں ہی ہوتی ہے اس لیے اپنے پوتوں کے صدقے تمہاری ازلی خواہش پوری کر دی ہے میں نے۔ جو تم چاہتی تھی وہ تمہیں مل گیا۔ حالانکہ یہ سب تمہارا ہی تھا اگر تم صبر اور حوصلے سے کام لیتی تو اس گھر کے ساتھ ساتھ اس خاندان سے بھی بہت عزت پاتیں۔ کہ بڑی بہو کا رتبہ اور مقام تو ہمیشہ سے بہت اعلیٰ رہا ہے۔ مگر یہ سب تم جیسی کم حوصلہ اور بے صبری کے نصیب میں ہی نہ تھا۔ اس لیے عزت ذِلت کو مارو گولی۔ اور جس گارے مٹی کی عمارت کی چاہ میں اپنا اعمال نامہ سیاہ کرتی رہی ہو...... لو اس کی ملکیت کے کاغذات بھی آج میں نے تم دونوں کے نام کر دیے۔ یہ جو ابھی ابھی تم بڑے کروفر سے میرا گھر کہہ رہی تھیں ناں تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا یہ گھر میرے جہیز میں مجھے میرے ابا میاں نے دیا تھا۔ جو آج میں اپنی خوشی سے اپنے پوتوں کی خاطر تمہیں دان کر رہی ہوں۔ لو سنبھالو۔ اب کہتی پھرنا زمانے بھر میں میرا، میرا گھر،!'' سبز رنگ کی فائل حرمت النساء نے فارحہ کا ہاتھ تھام کر، اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا تو وہ جیسے کھڑے کھڑے اسی جگہ دفن ہو گئی۔ مگر نہیں، ابھی تو اسے اور جھٹکے لگنے باقی تھے۔

''سنی، شیری اِدھر آؤ بیٹا!'' انہوں نے اپنے پوتوں کو بلایا تو وہ ایک ٹرانس میں چلتے ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ حرمت نے دونوں کو ایک ساتھ بانہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا اور باری باری ان کی کشادہ پیشانیاں چوم لیں۔

''یہ لو بیٹا سنی، میں نے شاپنگ پلازہ والی گارمنٹ شاپ تمہارے نام کر دی ہے اور شیری بیٹا سپر اسٹور تمہارے نام بیٹا، یہ تمہاری دادو کا تم لوگوں کے لیے تحفہ ہے۔ میں تم لوگوں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہمیشہ دعا کرتی رہوں گی۔ انہوں نے دونوں کو ہلکی گلابی اور نیلی فائلز پکڑاتے ہوئے ایک بار پھر سے گلے لگا کر پیار کیا۔

''او کے ینگ مین! دروازہ بند کر لو۔ چلتے ہیں ہم اب، اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ! عثمانی صاحب نے بھی آگے بڑھ کر ان دونوں بھائیوں کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔

گلناز! اِدھر آؤ! جاتے جاتے حرمت النساء کی نظر پتھر بنی گلناز پر پڑی تو انہوں نے اسے آواز دے کر پاس بلایا اور پھر ہاتھ میں پکڑے خوبصورت اور نفیس سے کلچ میں سے کئی ہرے اور نیلے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔

تم نے میری بڑی خدمت کی ہے گلناز۔ اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ یہ میں تمہیں اپنی خوشی سے تحفہ دے رہی ہوں تمہارے خدمت کا اجر نہیں۔ اپنے بچوں کے لیے سردیوں کے کپڑے بنا لینا۔ گلناز کے تشکر سے بندھے ہاتھ کھولتے ہی اور اس کے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے انہوں نے پیار سے کہا اور زید کی طرف ایک نظر بھی ڈالے بغیر واپس مڑ گئیں۔

☆......☆......☆

انعم اور حمزہ کی سیٹیں کنفرم ہو چکی تھیں۔ اور انہیں کل شام کی فلائٹ سے واپس چلے جانا تھا۔ اسی وجہ سے عثمانی ہاؤس میں صبح سے بڑی رونق لگی

ہوئی تھی۔ شائق اریبہ، زین اور سونیا، حمزہ اور انعم اور ان کے بچے، سب مل کر انجوائے کر رہے تھے چچی بی نے جو بہت ضعیف ہو چکی تھیں، مگر اس کے باوجود بے حد خوش قہقہے لگا رہی تھیں۔ شائق اور اریبہ کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا، ایک دم سے جیسے زندگی مکمل اور پر رونق لگنے لگی تھی۔ اس وقت بھی وہ سب وسیع وعریض لاؤنج میں بیٹھے مسلسل باتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری چائے سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب باری باری اپنی زندگی میں پیش آنے والے عجیب وغریب اور مزے دار واقعات سنا رہے تھے۔ سب کتنا مکمل لگ رہا تھا خوبصورت، مکمل اور مطمئن۔

لاؤنج کی بڑی سی وکٹورین طرز کی گلاس ونڈو کے پار لش گرین گھاس اور خوش رنگ پھولوں سے سجا لان۔ اور اس خوبصورت لان کے پار، خوبصورت بڑا سا آہنی گیٹ نظر آ رہا تھا۔ حرمت النساء کھڑکی کے پاس رکھی ایزی چیئر پر بیٹھی سب کی باتیں مسکراتے ہوئے سن رہی تھی۔ عثمانی صاحب کے چٹکلے بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سب کتنا مکمل، کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ مگر اندر کہیں کمی سی تھی۔ اور یہ کمی صرف انہیں ہی نہیں، لاؤنج میں بیٹھے ہر فرد کے اندر دور کہیں، بہت دور کھل رہی تھی۔ اور اس کمی کے احساس کو چھپانے کے لیے ہی شاید وہ سب اتنا ہنس بول رہے تھے۔ ان سب کی باتوں پر ہنستے، ان کی شرارتوں پر مسکراتے ہوئے بھی ان کی نگاہیں بار بار جانے کیوں گیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جیسے کوئی نا محسوس ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے جھجکتا ہوا چلا آ رہا ہو۔ وہ بے چینی سے داخلی دروازے کو دیکھنے لگیں۔ ان کے آس پاس پھیلا شور گھرے سناٹے میں بدل گیا ہو۔ چہار اطراف خاموشی چھا گئی۔ سب کے ہلتے ہاتھ اور بولتے لب دکھائی تو دے رہے تھے۔ مگر سماعتیں شاید سُن ہو گئی تھیں اور پھر اس خاموشی اس ساکن سناٹے کو ایک معصوم سہمی ہوئی آواز نے توڑ ڈالا۔

دادو جان! کیا ہم آپ کے پاس آ سکتے ہیں! دروازے میں کھڑے سنی، شیری اندر افراد کی موجودگی سے گھبرا کر وہیں کھڑے کھڑے اجازت طلب کر رہے تھے۔

میرے بچے! میرا سنی، میرا شیری آ جاؤ! میری جان میرے پاس آؤ۔ وہاں کیوں کھڑے ہو اندر آؤ اپنی دادو کے پاس۔ وہ ایک دم بے تابی سے کھڑی ہو گئیں اور بانہیں پھیلا دی وہ دونوں تو دوڑتے ہوئے ان کی کھلی بانہوں میں سما گئے۔

''امی جان! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کا نا فرمان بیٹا! آپ کی معافی کا حقدار تو نہیں، مگر آپ مجھے معاف نہیں کریں گی، تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ذلیل اور رسوا ہو جاؤں گا۔ جہنم کی آگ میں جلایا جاؤں گا۔ امی کیا چاہتی ہیں کہ۔''

''نہیں! نہیں بیٹا! کوئی ماں کس طرح برداشت کر سکتی ہے اس کی نگاہوں کے سامنے اس کے بچے جھلسائے جائیں سنی اور شیری کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے، روتے بلکتے زید کی بات پوری ہونے سے پہلے کی حرمت النساء نے اسے بھی کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

''امی! آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں! وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ان سے لپٹا بچوں کی طرح منہ اٹھائے ان سے پوچھ رہا تھا۔

ہاں بیٹا! میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرا اللہ بھی تمہیں معاف فرمائے اور تم پر اپنی رحمت

کرے۔ وہ مسکرا کر بولیں اور انہیں اٹھا کر ساتھ لگالیا۔

''کیا آپ کی معافی میں تھوڑا سا حصہ مجھے بھی ملے گا۔ گوکہ میں اس کی حقدار تو نہیں، مگر پلیز امی، مجھے......!''

فارحہ ابھی تک لاؤنج کے دروازے سے باہر کھڑی تھی حرمت النساء نے اسے اس قدر شرمندہ اور پشیماں دیکھا تو ان کا دل پسیج گیا۔ اور انہوں نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

آجاؤ! فارحہ بیٹی! میں تمہیں بھلا کیسے معاف نہیں کروں گی۔ تم تو میری بڑی بہو ہو۔ میرے پوتوں کی ماں اور بڑی بہو کا مقام بھی تو بڑا ہوتا ہے آجاؤ میں نے تمہیں دل سے معاف کیا۔ انہوں نے اپنے گلے سے لگی بلک بلک کر روتی فارحہ کو بانہوں میں بھرتے ہوئے بڑے جذب اور پیار سے کہا تو وہ کمرہ ایکدم ''یاہو'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے تھے۔ باتیں شرارتی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور اب اس محفل کی رونق بڑھانے میں وہ بھی شامل ہو چکے تھے۔

''شکریہ عثمانی صاحب! میں آپ کی دل سے ممنون ہوں آپ کے دم سے مجھے جو عزت جو مقام اور رتبہ ملا ہے میں چاہ کر بھی اس کا احسان نہیں چکا سکتی۔ واقعی آپ ٹھیک کہتے تھے اللہ کی رضا میں راضی رہنے والوں کو ہی سچی خوشیاں ملتی ہیں اور آج اپنے سارے بچوں کے چہروں پر ان خوشیوں کا عکس دیکھ کر میں اپنے دل میں ایسا اطمینان اترتا محسوس کر رہی ہوں کہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔

حسن، شائقہ آپ جہاں کہیں بھی ہیں، یقیناً اچھے مقام پر اچھے حال میں ہوں گے انشاء اللہ میرا آپ سے بھی وعدہ ہے آپ کی جگہ اور آپ کا مقام ہمارے دلوں میں ویسا ہی بلند اور اعلیٰ رہے گا جیسا کہ پہلے تھا۔ اور یقیناً آپ بھی اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے ہے ناں۔

حسن! آپ گواہ رہیے گا میں نے آپ سے اور اپنے آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ آپ جس جائیداد کا مجھے نگران بنا گئے تھے۔ وہ میں نے پوری ذمہ داری اور خلوص سے اس کے اصل وارثوں تک پہنچا دی۔ آپ کی محنت اور حق حلال کی کمائی، آپ کے پوتوں پوتی، نواسے، نواسی کے نام منتقل کر کے آج میں سرخرو ہوئی اور آپ جانتے ہیں ناں یہ میری شرط تھی اور یہ ہی میرا قرض اور فرض بھی۔ اور شائقہ میں آپ سے بھی وعدہ کرتی ہوں، زید، زین اور انعم میں بھی کبھی فرق نہیں کروں گی۔ مجھے عیان، شایان اور ریان بھی اتنے ہی عزیز ہیں جتنے کہ شیری اور سنی، میرے لیے اریبہ بھی اتنی ہی معزز اور اتنی ہی پیاری ہے جتنی کہ سونیا اور فارحہ۔ آپ بھی دعا کیجیے گا اور میں بھی اپنے رب سے التجاء کرتی ہوں کہ وہ مجھے ہمت و استقلال دے آمین۔ اور ویسے بھی ابا میاں ہمیشہ کہتے تھے کہ ہم نے اپنے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ آگے اب اللہ کی مرضی وہ جیسا چاہے ہم راضی بہ رضا ہیں۔'' حرمت النساء نے آسودگی سے مسکراتے ہوئے پہلے عثمانی صاحب اور پھر سامنے دیوار پر لگی شائقہ اور حسن کی تصاویر کو دیکھتے ہوئے مخاطب کیا اور پھر اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہوگئیں کہ اب ان کے دل کو اطمینان واثق ہو چکا ہے کہ دکھ کی دھوپ ڈھل چکی ہے اب ہر طرف سکھ کی چھایا ہی چھایا ہے۔

☆......☆......☆......☆

رات کے بارہ بجے تک میری نئی نویلی دلہن اپنی ساس کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ ولیمہ کی صبح جس نرالی دلہن نے ناشتا اپنی ساس کے ساتھ بیٹھ کر کیا ہو اُس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ میرا کمرہ تو اس کے لیے قید خانے کے مترادف......

ہر گھر کی کہانی، ایک یادگار افسانے کی صورت

سب کہتے ہیں جب میں پیدا ہوا تھا۔ آپ کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ مجھ سے پہلے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی مگر میری آمد تو آپ کے لیے بہار کا ایک جھونکا تھی۔ جب میرے بعد پانچ بیٹیاں یکے بعد دیگرے آئیں، تو میں تو میں ہی میں رہ گیا۔ آپ کے لیے میری جگہ کوئی اور نہ لے سکا۔ آپ کے لیے تو میں ہی سب کچھ تھا۔ میرے لیے خاص طور پر دیسی چوزے پالے جاتے اور جب وہ تھوڑے سے بڑے ہو جاتے تو آپ میرے لیے بھونتیں۔ جس دن گھر میں دال پکی ہوتی اس دن بھی آپ میرے لیے گوشت ضرور بناتیں۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا میرے لیے آپ کی محبت بھی بڑھتی گئی۔ بچپن ہی سے مجھے پڑھائی کا شوق نہ تھا۔ آپ نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی، جب میں کسی بھی طرح پڑھائی کے لیے تیار نہ ہوا تو میرا پہلا بزنس پارٹنر بھی آپ ہی تھیں۔ مجھے لکڑی کے آرے لگانے کے لیے آپ ہی نے پیسے دیے تھے۔ فرنیچر بنانے کے بعد بچی ہوئی لکڑیوں کی حفاظت آپ ہی کرتی تھیں۔ میرے پیسوں کا حساب کتاب رکھنے کے ساتھ ساتھ میرے کھانے پینے سے لے کر میرے دن رات کا حساب رکھنا بھی آپ ہی کا کام تھا۔ مجھے یاد ہے تو آپ کو تو ضرور یاد ہوگا۔ جب بھی مجھے محلے کے دوستوں میں بیٹھ کر دیر ہو جاتی، تو آپ میری ریوالور جو آپ ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھا کرتی تھیں۔ اس سے فائر کرتیں تو گولی کی آواز سارے محلے میں گونج جاتی۔ تب مجھے معلوم ہوتا مجھے میری ماں یاد کر رہی ہے۔ میں نے جب لکڑی کا کام چھوڑ کر اپنی ویگن لی' تب آپ ہی نے تو اپنے سونے کے کنگن بیچ کر ایک بار پھر میرے بزنس پارٹنر کی حیثیت حاصل کی تھی۔ صرف بزنس میں ہی کیا زندگی کے ہر موقعہ پہ آپ نے میری خوشیاں اور غم بانٹے۔ ہمارا رشتہ سب سے نرالا تھا۔ جہاں آپ کے پاس آنے سے مجھے سکون ملتا تھا۔ وہاں میرے آنے سے آپ کے چہرے پر بھی رونق آجاتی تھی۔

جب ابو جان بیرون ملک ملازمت کے لیے چلے گئے، تو آپ کا اور میرا تعلق تو اور بھی گہرا ہو گیا۔ ہم ماں بیٹا سردیوں کے دنوں میں رضائیوں میں گھس کر اُبلے ہوئے انڈے اور مونگ پھلی بھی کھاتے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ میں جب بھی بیمار ہوتا تھا بلکہ کبھی معمولی سا بھی سر میں درد ہوتا تو آپ کی گود میں سر رکھتے ہی مجھے سکون مل جاتا تھا۔ میرے لیے خاص باداموں والا دودھ بنایا جاتا تھا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا میرے اندر سنجیدگی پیدا ہوتی گئی، لیکن آپ کے پاس آتے ہی میرے اندر وہی ننھا مُنھا سا مُنو جاگ جاتا تھا۔ جو اپنی ماں کی گود میں چھپ جانے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ آپ کی اسی محبت و چاہت کی وجہ سے باقی سب بہن بھائی مجھ سے جلنے لگے تھے۔ آپ سب ہی بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں لیکن وہ لوگ اس فرق کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ جو آپ ان کے اور میرے مابین رکھتی تھیں۔ آپ کے لیے تو میں

پوری کائنات تھا۔ میری ضرورت، میری طلب، میرے کہنے سے پہلے ہی پوری کر دی جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے میرا کوئی راز آپ کے سامنے راز نہ تھا۔ آپ تو میرا آئینہ تھیں۔ اسی لیے تو جب میرے دل میں حنا کے لیے خیال آیا، تو آپ نے مجھ سے پہلے ہی میری آنکھوں میں اُس کی تصویر دیکھ لی تھی۔

حنا! ہاں حنا...... آپ کی بہو وہی حنا جو مجھ سے چھوٹی بہن فوزیہ کی کلاس فیلو اور سہیلی تھی۔ جسے میرے دل نے اپنے جیون ساتھی کے طور پر چُن لیا تھا۔ وہی حنا آپ بھی جسے اپنی بہو بنانے کے لیے بے تاب تھیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اپنی شادی پر دولہا سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے، لیکن میری شادی میں معاملہ الٹ تھا۔ آپ تو مجھ سے بھی زیادہ خوش تھیں۔ سب مہمانوں نے کہا تھا کہ میری شادی پر آپ کے چہرے پہ ایک الگ ہی نور تھا۔ اور حنا بھی نرالی تھی جو شادی تو مجھ سے کر کے آئی تھی، لیکن لگتا تھا رشتہ آپ سے جوڑ کر آئی ہے۔

رات کے بارہ بجے تک میری نئی نویلی دلہن اپنی ساس کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ ولیمہ کی صبح جس نرالی دلہن نے ناشتا اپنی ساس کے ساتھ بیٹھ کر کیا ہو اُس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ میرا کمرہ تو اس کے لیے قید خانے کے مترادف تھا۔ سارا دن میری بہنوں اور آپ کے ساتھ ہی ہنسی مذاق کرنا ہی اس کا شوق تھا۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے لیے نہیں، آپ لوگوں کے لیے ہی آگئی ہو۔

شادی کے ایک ہفتے بعد اس نے کالج جانا دوبارہ شروع کر دیا۔ وہ تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی۔ اور اپنا بی اے مکمل کرنا چاہتی تھی۔ یہ اُسی دن کی بات ہے، جب حنا کالج گئی ہوئی تھی میں نے اپنی چھوٹی بہن راحیلہ کو اپنے ضروری کاغذات، شناختی کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ اور کپڑے بھی دینے کے لیے کہا کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ میری تمام ضروری چیزیں اب میرے پاس میرے کمرے مین رہیں اب میری غیر موجودگی میں حنا ان کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اور پھر جلد ہی تو راحیلہ کی شادی ہونے والی تھی۔ پتا نہیں میرا مطالبہ غلط تھا، یا درست، مگر راحیلہ کا انداز بہت غلط تھا اس نے وہ تمام چیزیں نکال کر صحن میں پھینک دی اور بولی۔

’’تمہاری بیوی نے پٹی پڑھائی ہو گی‘‘ آپ ذرا خود سوچیں ایک ہفتے کی دلہن جو اپنے شوہر سے نظر ملا کر بات بھی نہ کر سکی ہو، اسے پٹیاں کیا پڑھائے گی۔ راحیلہ مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ اس کی اس بدتمیزی پہ میں نے اسے ایک تھپڑ مار دیا، بس تو پھر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ آپ نے پہلی بار میرا ساتھ نہ دیا بلکہ راحیلہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور مجھ سے زیادہ حنا کو برا بھلا کہا۔ مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی ایک بیٹا بیس، پچیس سال ماں، باپ، بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی تمام اچھی اور بری عادتوں کو تمام بہن بھائی اور ماں باپ جانتے ہیں پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ شادی کے بعد ان سب عادتوں کا ذمہ دار بیوی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

اس دن جب حنا کالج سے گھر واپس آئی، تو گھر کا ماحول ہی بدل چکا تھا۔ گھر میں کوئی اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی بیسٹ فرینڈ فوزیہ اور رضیہ جن کے بغیر حنا کی صبح نہیں ہوتی تھی اور حنا کے بغیر جن کی رات نہیں ہوتی تھی، اب اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کر رہی تھی۔ اس صورتحال سے گھبرا کر اپنی غلطی نہ ہونے کے باوجود حنا نے آپ

سے معافی مانگی۔ تب آپ نے غصے سے اُس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

''چل ہٹ پرے۔ جہاں گئیں بیڑیاں (کشتیاں) وہاں گئے ملاح۔''

اس واقعے کے چند دن بعد کی بات ہے ایک روز میں آپ کے قریب بیٹھا کینو کھا رہا تھا۔ ایک کینو کھانے کے بعد جب میں دوسرا لینے لگا تو آپ نے میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر روکا اور کہا۔ بس اپنے حصے کا کھاؤ۔'' میں جسے اٹھائیس سال تک آپ نے بلاشراکت غیرے اپنی محبت کا مالک بنائے رکھا۔ آج آپ ہی اس کو اُس کے حصے کا احساس دلا رہی ہیں بس تو پھر دوریوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔

آپ نے کیا مجھ سے ہاتھ کھینچا میں پیچھے پیچھے بہت پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ پھر آپ نے میرے لیے باداموں والا دودھ بھی رکھنا بند کر دیا۔ مجھے یاد ہے کچھ عرصے بعد آپ کی حنا سے دوبارہ بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ آپ اکثر حنا سے کہتیں۔

''منو کے لیے باداموں والا دودھ بنا کر دیا کرو دماغ کے لیے اچھا ہوتا ہے۔'' تیس سال کا ہونے کے باوجود میں آپ کے لیے سعد نہیں ''منو'' ہی تھا میرے کھانے پینے کا آپ اب بھی خیال رکھتیں۔ مگر اب حنا سے کہہ دیتیں، مجھ سے براہِ راست نہ کہہ سکتیں۔ میرا سر درد ہوتا تو میرا دل کہتا میں آپ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاؤں اور آپ مجھ پہ دم کریں۔ پہلے کی طرح میرا سر دبائیں، لیکن میں منہ سے اپنی خواہش کا اظہار نہ کرتا۔

میری تکلیف دیکھ کر آپ بھی بے چین ہو جاتیں، مجھ سے کچھ نہ کہتیں بلکہ حنا سے کہتیں، وہ والی آیت پڑھ کر منو پر دم کرو، سر میں سرسوں کے تیل کی مالش کرو۔ مجھے یاد ہے جب ابو کی خواہش پر شہر سے کچھ دور ایک اسکیم پر گھر بنا رہا تھا۔ تب واپس آتے آتے مجھے رات کے دو بج جاتے میں نے اکثر دیکھا تھا آپ جاگ رہی ہوتی تھیں، لیکن میں جیسے ہی آپ کے قریب سے گزرتا آپ منہ پر چادر تان کر اپنے آپ کو سوتا ہوا ظاہر کرتیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے باہر جاتے ہوئے آپ ہمیشہ کی طرح آیت قرآنی کا حصار کھینچتی پھونک مارتی، لیکن میری نظر پڑتے ہی آپ انجان بن جاتیں۔ میں ہر پل آپ کی پکار کا منتظر رہتا تھا، جو کبھی بھی میرے کانوں نے نہ سنی تھی۔ کاش صرف ایک بار آپ مجھ سے اپنے دل کی باتیں کہہ دیتیں ''منو'' کہہ کر آواز دیتیں تو میں بھی تمام گلے شکوے بھلا کر آپ کی گود میں سر رکھ کر پوچھتا۔

''امی کیا آپ ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟'' کاش صرف ایک بار......''

☆......☆......☆

میں تو آپ کا لاڈلا بھی تھا۔ بچپن ہی سے آپ بڑے بھائی سے زیادہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ میری رائے کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جب میٹرک کے بعد میں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی تو آپ کو بہت دُکھ ہوا تھا، لیکن آپ نے مجھ سے پیار سے پوچھا کہ اگر پڑھنا نہیں ہے تو پھر کیا کرنا ہے؟'' تب میں نے کہا۔

''میں کاروبار کروں گا۔'' آپ نے نا صرف مجھے کاروبار کی اجازت دی بلکہ ہر قدم پہ میرا ساتھ بھی دیا۔ جب آپ بیرون ملک ملازمت کے لیے گئے تھے۔ سارے گھر کی ذمہ داری مجھ پر ڈال گئے تھے۔

ایئر پورٹ پر آپ کو خدا حافظ کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ آپ بھی اپنی پُرنم آنکھوں کے سے بار بار پلٹ کر مجھے دیکھتے رہے۔ آپ کے جانے کے بعد میں

ایک دم ہی بیس سال کا ایک ذمہ دار مرد بن گیا۔ پورے گھر کی ذمہ داری میں نے خاموشی سے اپنے کندھوں پر اٹھالی۔ پانچوں بہنوں کا خیال رکھنا، اُن کو کالج اور اسکول لانا اور لے جانا غرض گھر کا کون سا کام ایسا کام تھا جسے میں نے اپنی ذمہ داری نہ سمجھا ہو۔ بڑے بھائی کو تو شروع ہی سے کبوتر بازی کے علاوہ کسی اور چیز میں دلچسپی نہ تھی۔ گھر کے بارے میں تو اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ آپ کو مجھ پہ مکمل بھروسہ تھا۔ اُسی بھروسے کی وجہ سے تو آپ نے اپنی غیر موجودگی میں کاروباری معاملات کے لیے پاور آف اٹارنی لکھ کر بھیجا تھا۔ ایک پل کو آپ کے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ میرا بیٹا اس کا غلط استعمال نہ کرے اور ایک پل کو میرے دل میں بھی یہ خیال نہ آیا کہ میں اس پاور آف اٹارنی کو اپنی پاور بنالوں۔ یہ تو صرف ایک امانت تھی جو میرے ابو جی نے مجھے سونپ دی تھی۔ یہ تو صرف ایک اعتبار تھا جو میرے والد نے مجھ پر کیا تھا۔ آپ ہر ماہ صرف چند ہزار روپے باہر سے بھیجتے تھے۔ جس میں میں اپنی کمائی شامل کر کے آپ کی غیر موجودگی میں تمام ذمہ داریاں ادا کرتا تھا۔ گھر کا خرچ، بجلی کے بل، بہنوں کی پڑھائی یہ سب کچھ ان چند ہزار میں ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود بہنوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا۔ کہ ہمارے ابو تو باہر سے لاکھوں روپے بھیجتے ہیں جو ہمارا بھائی کھا جاتا ہے۔ امی کی محبت جو میرے لیے تھی اُسے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اب آپ کا اعتبار اور شفقت کو بھی برداشت کرنا اُن کے لیے ناممکن ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد آپ میری شادی کے دنوں میں واپس آئے۔ ان ہی دنوں آپ کی خواہش پہ میں نے شہر سے دور نئی اسکیم پر نئے گھر کی تعمیر شروع کر دی۔ آپ چاہتے تھے کہ اسی جگہ پر سکونیت اختیار کریں جہاں آپ مکمل سکون سے اپنا لکھنے لکھانے کا کام کرسکیں۔

اس نئے مکان کی تعمیر کے لیے آپ نے مجھے نو لاکھ روپے دیے تھے جبکہ اُس دس مرلے کے ڈبل اسٹوری مکان کی تعمیر پہ نو لاکھ سے کہیں زیادہ لگا تھا، لیکن میں نے آپ سے کچھ نہ مانگا وہ گھر بھی آپ کے نام ہی تھا۔ وہاں قیام کے بعد کے بعد آپ نے اور میں نے مل کر چاروں بہنوں کی شادیاں کر دی۔ شادی کے نے دنوں میں بھی بڑا بھائی کبوتر اڑا رہا ہوتا اور میں انتظامات میں مصروف پسینے میں بھیگا اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا ہوتا۔ میری حالت دیکھ کر حنا چڑ جاتی اور کہتی آپ کپڑے ہی بدل لیں، لیکن مجھے اس کی بھی کہاں فرصت تھی؟

اس مکان میں چند سال قیام کے بعد ہی آپ کو یونیورسٹی کی طرف سے دوسری زمین ملی، تو آپ کی خواہش پہ میں نے پرانا مکان بیچ کر نئے مکان کی تعمیر شروع کروادی۔

ایک کنال پہ ڈبل اسٹوری گھر پرانے مکان کی قیمت سے کہیں زیادہ پیسوں میں بنا تھا، لیکن میں نے پھر بھی آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا اور چپ چاپ آپ کی خواہش کی تکمیل کرتا رہا، لیکن پھر اچانک کیا ہوا آپ کا وہی بیٹا جو آپ کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ قابل اعتبار تھا، نا قابل اعتبار ہوگیا۔ جس بیٹے کی تعریفیں کرتے کرتے آپ کی زبان نہ تھکتی تھی اسی بیٹے میں بے شمار برائیاں نظر آنے لگیں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم نئے گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ ایک دن چھوٹی بہن پنکی کا حنا سے جھگڑا ہوگیا۔ پنکی حنا سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی۔ پھر بھی اُس نے حنا سے

بہت بدتمیزی کی جس کا حنا کو بہت دُکھ ہوا۔ بس اتنی سی بات پر آپ نے چھوٹی بہن کے کہنے پہ اپنا کچن الگ کر لیا۔ صرف ایک بار آپ مجھ سے اور حنا سے بھی پوچھتے کہ ہم الگ ہونا بھی چاہتے ہیں یا نہیں...... اور اگر چاہتے ہیں تو کیوں؟ مگر آپ نے کچھ نہ پوچھا مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ اسی خاموشی نے دوریاں بڑھا دیں۔ آپ میرے چاروں بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر جب بچے آپ سے ملنے آتے تو آپ کی نظر بچا کر پنکی اُن کو ڈانٹ کر اوپر بھیج دیتی۔ جب آپ بچوں سے نیچے نہ آنے کا گلہ کرتے، تو وہ کہتی حنا نے روکا ہوگا۔ بچے بھی تو پھول ہوتے ہیں۔ جس طرح پھول موسموں کے سرد اور گرم رویے کو ہم انسانوں سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح بچے بھی بڑوں کے رویے کو ہم سے کہیں زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بچے آپ سے دور ہوتے چلے گئے وہ کہتے پھوپھو ہمیں ڈانٹتی ہیں اور دادا ابو بھی کچھ نہیں کہتے۔ اُن ہی دنوں شاید خدا کو ہم پر رحم آ گیا جب پنکی خود سے بڑی بہن ثمینہ سے ملنے (جو بیرون ملک میں بیاہی تھی) چلی گئی۔

وہ دن تو گویا ہمارے لیے نعمت تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے آپ ہمارے پاس چھٹیاں گزارنے آئے ہیں۔ آپ حنا سے کہتے کھانا نیچے مت لانا، آپ اوپر بچوں کے ساتھ آ کر کھانا کھاتے۔ اُن کے ساتھ ٹی وی دیکھتے۔ آپ کو بچوں کے پسندیدہ پروگراموں کے نام تک یاد ہوتے۔ بچوں کو پڑھاتے اور میرے بیٹے سنی سے کہتے۔

’’میں تو تمہارے بچوں کو بھی پڑھاوں گا‘‘

لیکن خوشیوں کے یہ پل جلد ہی ختم ہو گئے اور پنکی ایک ماہ بعد واپس آ گئی۔ اب تو وہ دروازے کو بھی لاک لگا کر رکھتی تا کہ بچوں کا اور میرا آپ سے سامنا نہ ہو۔ حنا نے تو غصے میں بچوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ نیچے ہی نہ جائیں۔ مگر میں تو بیٹا تھا نا میں ہر پل اس دروازے کے کھلنے کا انتظار کرتا۔ میں دعا کرتا کاش یہ دروازہ ٹوٹ جائے اور میں اپنے والد کے گلے لگ کر پیار کروں، اُن کی خدمت کروں۔ میں جانتا تھا آپ تھک جاتے ہیں، تو میرے دبانے سے آپ کو سکون ملتا ہے۔ بچوں اور میری دوری نے آہستہ آہستہ آپ کی صحت برباد کر دی۔ پتا نہیں بہنیں یہ بات کیوں نہیں سمجھتیں کہ جیسے شادی کے بعد ان کے لیے ماں باپ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ایسے ہی ایک بیٹے کے لیے بھی ماں باپ اور بھی اہم ہو جاتے ہیں۔ شادی بیٹے کی محبت میں کوئی کمی نہیں کرتی کمی تو محبتوں میں تب ہوتی ہے جب ہمارے اردگرد رہنے والے ہماری محبتوں میں شک کا زہر گھول دیتے ہیں۔

کاش! صرف ایک بات میں نے بڑھ کر امی جان آپ کا ہاتھ تھام لیا ہوتا یا آپ ہی ایک بار صرف ایک بار ہی مجھے آواز دے دیتیں یا میں ہی پلٹ کر آپ کے سینے سے لگ کر پوچھ لیتا۔

’’امی جان آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟‘‘ کاش صرف ایک بار ابو جی میں آپ کے گلے لگ کر پوچھ لیتا کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے یا آپ ہی مجھے اپنے پاس بُلا کر مجھے بتا دیتے کہ آپ کس بات پر مجھ سے ناراض ہیں۔ صرف ایک بار یہ خاموشیاں ٹوٹ جاتیں۔ صرف ایک بار یہ بند دروازے کھل جاتے......‘‘

سعد نے چیخ چیخ کر روتے ہوئے کہا اور اپنے دائیں، بائیں بنی ہوئی قبروں سے مٹی اپنی مٹھیوں میں بھر کر اپنے سر پر ڈالنے لگا۔

☆☆......☆☆

اس پوری رات وہ صبح سے سو بھی نہ پائی۔ جب آنکھ لگتی۔ خواب میں ہونے والی بھاوج سے لڑنے لگتی۔ صبح تک نورین شوہر کی باتوں کی قائل ہوگئی۔ ''ازل چندا اب تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں۔ اپنا گھر خالی کروا کر......

محبت کو فتح سے ہم کنار کرتا، ایک خوبصورت ناولٹ

اسٹڈی روم کی فضاء کی خنکی ناقابلِ برداشت تھی، پھر بھی وہ بغیر کوئی گرم کپڑا پہنے، اپنے ارد گرد تصاویر بکھیرے بیٹھے تھے۔ باہر کی ٹھنڈی ہوائیں، ان کے وجود میں اٹھنے والے آتش فشاں پر رتی برابر اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں، ناصر علی نے ایک تصویر اٹھائی، جس میں مہر النساء دلہن بنی اتنی حسین لگ رہی تھی کہ وہ ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ تصویر بلیک اینڈ وائٹ ہونے کے باوجود ان کے حسین چہرے کے نقوش بڑی دل آویزی سے اجاگر کر رہی تھی۔ شرم سے جھکی آنکھیں، مسکاتے نازک لب، گھونگٹ میں چھپی شفاف مانگ، جس پر افشاں چھڑکی گئی تھی، انہیں وہ ساعتیں یاد آنے لگیں، جب وہ ان کی زندگی بنادی گئی تھی۔

مہر النساء کے حسین چہرے کے نین نقش انہیں ازبر تھے، وہ بھولتے بھی کیسے اسی کے دم سے تو ان کی تنہائیوں میں چراغاں ہوتا۔ محفل بجتی۔ وہ محبت کی عجیب منزل تک جا پہنچے تھے جہاں وصل کی لذت کشید نے کے بعد ہجر کی تنہائی کا جہان بھی اسی کی یادوں سے آباد کر رکھا تھا۔ انہیں زندگی نے ایک ہی رمز سکھایا، صرف پانے کا نام ہی سب کچھ نہیں، محبت کھونے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔

رات دوسرے پہر میں داخل ہونے لگی، مگر انہوں نے پلک بھی نہ جھپکی۔ حالاں کہ۔ نیند پتلیوں میں کنکر کی طرح چبھ رہی تھی۔ کھڑکی سے آتی سرد ہوا نے ان کی ہڈیوں کے پرانے درد کو جگا دیا، مگر وہ ''پرواہ نہیں'' کی تفسیر بنے، دلہن بنی مہر کی تصویر کو ہی تکے جا رہے تھے۔ کچھ دیر یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھے رہے پھر ٹھنڈی آہ بھر کر ارد گرد پھیلی تصاویر کو جمع کر کے واپس لفافے میں ڈالنے لگے۔

یہ ان کا ہر دوسرے دن کا معمول تھا۔ اگر اس وقت باقی گھر والے ان کی حالت دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے۔ جس گھر میں دن کے روشن اجالوں میں ناصر علی کے سامنے مہر النساء کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا، وہ رات کی تنہائی میں اسی کی یادوں سے اپنے دل کو آباد کرتے۔

وہ سیاہ رات بھی اتنی ہی بھاری تھی جتنی مہر النساء کے ان کی زندگی سے جانے کے بعد سے دوسری راتیں ان پر کڑی گزری تھیں۔ دل میں درد سا اٹھا تو بے قراری سے ٹہلنے لگے، کمرے کی ہر چیز آنکھوں کی نمی میں دھندلا گئی، دور خلاؤں میں کھو گئے، جہاں ماضی کے سہانے لمحے جاگ اٹھے جو انہوں نے اپنی محبت اپنے پیار کی سنگت میں گزارے تھے۔

'کاش! مہر...... ایک بار صرف...... ایک بار تم مجھے دوبارہ مل جاؤ، تو میں ایک بات ضرور پوچھوں گا۔ میری محبت میں ایسی کیا کمی تھی، جو تم سیف حسن کی طرف راغب ہوئیں؟'' ناصر علی نے ہاتھ ملتے ہوئے اسے پکارا۔ آج پھر ان کا وجود پرخچوں میں اڑنے لگا، اپنے ٹھکرائے جانے کا احساس بہت تکلیف دہ ہے۔ خاص طور پر جب ایسا اپنی محبت کے ہاتھوں ہوا ہو۔ اذیت کی انی تا عمر وجود میں گڑی رہتی ہے۔ انہوں نے انگلیاں سر کے بالوں سے گزار کر مٹھی بند کر لی۔ درد کی شدت ناقابل بیان ہونے لگی۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... کوئی تو آجاؤ'' تاریکی کو چیرتی ہوئی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک کر حواسوں کی دنیا میں لوٹ آئے۔

''اوہ...... لگتا ہے اماں جی کو پھر دورہ پڑا ہے'' بخت بی بی کی چیخیں سن کر ناصر علی ننگے پاؤں بھاگے۔

ناصر علی تیزی سے اسٹڈی روم سے باہر نکلے، کاریڈور میں پھیلی زیرو پاور کی سرخ روشنی ان کے منتشر اعصاب پر گراں گزری۔ وہ سر جھٹک کر ماں کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

''اتنا حبس کیوں ہو رہا ہے۔ کوئی ہے...... ارے کوئی تو آؤ جو مجھے اس سے بچائے، وہ دیکھو، وہ آ رہی ہے۔ مجھے مار دے گی'' بخت بی بی نے سوتے میں ہاتھ پاؤں چلائے، ہاتھوں پر بندھی ڈوریاں بھی ان کے جنون پر قابو پانے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ ان کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں، جیسے کسی معصوم بکری کا نرخرہ کاٹ کر اسے تڑپتا چھوڑ دیا گیا ہو۔

دیوار پر ٹنگی بڑی سی وال کلاک کے گھنٹے نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا تھا، اسی لیے گہری تاریکی اور خاموشی میں اچانک گونجنے والی آواز سے خوف کی لہر پیدا ہوئی۔ گھر کے باقی مکین گہری نیند میں تھے۔ صائمہ جو پانی پینے اٹھی تھی وہ بھی دادی کی درد بھری پکار پر باپ کے پیچھے تیزی سے ان کے کمرے کی طرف بھاگی۔

اس نے ایک جھرجھری لے کر دروازے سے اندر کا منظر دیکھا۔ ناصر علی ماں کو سنبھالنے کی کوششوں میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ اسے باپ پر بہت ترس آیا۔ ان کی ناآسودہ زندگی کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے اور کسے معاف کیا جائے؟ عام دنوں میں چپ چاپ پڑی رہنے والی دادی کو جب دورہ پڑتا تو ان میں بلا کی طاقت بھر جاتی، اپنے ساتھ ساتھ دوسرے کو بھی نوچ کاٹ ڈالتیں۔

''اماں میں آگیا۔ یہاں۔ آپ کا ناصر ہے۔ کیوں ڈر رہی ہیں''۔ انہوں نے ماں کو چھوٹے سے بچے کی طرح چمٹا کر نرمی سے کہا، بخت بی بی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''منا! تو مجھے چھوڑ کر نہ جانا...... نہیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا کر مار دے گی'' بخت بی بی نے چھوٹی سی بچی کی طرح سہمی ہوئی آواز میں بیٹے سے التجا کی۔ صائمہ نے دادی کو بغور دیکھا، وہ ہوش و حواس کی دنیا سے دور دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے فوراً ڈاکٹر کی ہدایت یاد آئی، جلدی سے اعصاب کو سکون پہنچانے والی دوا، سائیڈ دراز سے ڈھونڈنے لگی۔

''منا! اس کو بول دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دے''

بخت بی بی ایک دم زور زور سے رونے لگیں، ناصر علی افسردہ ہوگئے۔ انہیں مہر النساء سے ایک دم نفرت محسوس ہوئی جس کی وجہ سے اس کی ماں اتنے سالوں بعد بھی ذہنی ابتری کا شکار تھیں۔ کتنی عجیب بات تھی وہ اس سے پاگلوں کی طرح محبت بھی کرتے تھے اور شدید نفرت بھی۔

پاپا! یہ دوا کھلا دیں، دادی سو جائیں گی۔'' صائمہ نے سلور پنی میں سے سفید چھوٹی سے گولی باپ کو دی تو انہوں نے منتیں کر کر ماں کو کھلا دیں۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا، جہاں سے ٹھنڈک اندر آرہی تھی۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' وہ بھنویں اچکا کر تشویش سے گویا ہوئے، بختی ان کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔''

''جی۔ پانی پینے اٹھی تھی پاپا! کیا باقی گھر والوں کو اٹھادوں؟۔'' صائمہ نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا اور دادی کا سر دبانے لگی۔

''نہیں بیٹا! یہ تو ہر دوسرے دن کا معمول ہے۔ سب شادی کی تیاری کی وجہ سے دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ تھک کر سوئے پڑے ہیں۔ آپ بھی آرام کرو میں جاگ رہا ہوں۔'' ناصر علی نے چشمہ اتار کر ٹشو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ بخت بی بی دوبارہ بڑبڑانے لگیں۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھوڑی دیر بعد ہی وہ دواؤں کے زیر اثر سو گئیں۔

''پاپا! آپ جائیں، میں آج رات یہیں پر سو جاتی ہوں۔'' صائمہ نے دادی کے ہاتھ اور پاؤں پر بندھی ڈوری کو ڈھیلا کیا اور اس پر موئسچرائزنگ کریم ملنا شروع کیا سرخ سرخ نشان نحیف بازوؤں پر دیکھ کر اس کا دل دکھوں کے سمندر میں ڈولنے لگا، مگر وہ اس معاملے میں مجبور تھی۔ بلکہ سب ہی اس منزل پر آکر مجبور ہوگئے تھے۔ عام حالات میں بخت بی بی چپ چاپ اپنے کمرے میں دواؤں کے زیر اثر پڑی رہتیں، مگر جب بھی ان پر دورہ پڑتا تو جیسے خاموشی کے سارے بند ٹوٹ جاتے۔ صائمہ نے چادر اوڑھاتے ہوئے بغور دیکھا، ان کے جھریوں سے بھرے چہرے کے تاثرات بہت عجیب ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے خون کی جگہ ان کی رگوں میں خوف دوڑتا ہو۔

''دادی نے ایسا کیا کیا ہے جو پچھتاووں کے ناگ انہیں ڈستے رہتے ہیں'' صائمہ سوچتے سوچتے بہت دلگیر اور الجھی الجھی سی وہیں پاس پڑے صوفے پر لیٹ گئی۔

☆

چیں چیں چیں۔ روزانہ کی طرح، چڑیوں کی چہکار سے اس کی آنکھیں کھل گئیں، سستی سے کروٹ بدلی، نیند تو ٹوٹ ہی چکی تھی، اس نے اپنا سر اٹھا کر مندی مندی آنکھوں سے دریچے سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ رات کی سیاہی نے دن کے اجالے میں اپنا منہ ایسے چھپایا کہ سورج پورے آب و تاب سے بیدار ہوگیا، ہر شے کا سیاہ گہن سے آزادی حاصل کرتے ہی چار سو روشن سویرا پھیل گیا۔ زندگی کی ایک اور صبح مکمل امید کے ساتھ طلوع ہوگئی۔

آئمہ ناصر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بلا کی سحر خیز واقع ہوئی تھی۔ دلچسپی سے کھڑکی پر ٹنگے سفید جالی کے پردے کو دیکھا جو ہوا کی شرارت پر محو رقص تھا۔ اس کا دل باہر جانے کو بے قرار ہوا۔ دلفریب موسم دعوت نظارہ جو دینے لگا تھا۔

وہ فطرت کی دلدادہ پیڑ پودوں سے مزید دوری برداشت نہیں کر پائی۔ فوراً کمبل ہٹا کر بستر سے اتری اس نے جیسے ہی اپنے سفید موم سے بنے پیر ٹھنڈے فرش پر دھرے تو نرم گلابی تلوؤں میں گدگدی ہونے لگی، دلکش مسکراہٹ نے حسین

چہرے کو حصار میں لے لیا۔ آئمہ نے اپنے لہریے دار بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے کی ناکام کوشش کی، پیروں میں کالا جوتا اٹکایا۔ اور باہر کی طرف بھاگی۔

سورج کی نارنجی شعاعوں نے ہر چیز پر اپنا سرخی مائل ڈیرہ جمایا ہوا تھا، آئمہ ایک لحظہ مبہوت رہ گئی۔ فرحت انگیز جھونکوں نے اسے سرور بخشا، وہ زوردار سانس لے کر تازہ ہوا اپنے اندر اتارنے لگی۔ فضا میں مٹی کی سوندھی سی مہک پھیلی ہوئی تھی، لہراتے پودے، رنگ برنگ کے پھول، پتوں پر سجے شبنم کے قطرے، وہ ایک خوشگوار کیفیت سے دوچار ہونے لگی۔ ایک دم اس ماحول سے بچھڑنے کا قلق من میں جاگا تو چہرہ اتر گیا۔

''میرے پیاروں میرے راج دلارو!۔ چندا، گڈو، پنکی اور تارو۔ چند دنوں بعد میں تم سے دور جانے والی ہوں۔ مگر میرا وعدہ ہے تم سب کو کبھی بھی نہیں بھولوں گی۔ جب بھی یہاں آؤں گی۔ تم سے ضرور ملوں گی۔ ویسے بھی میکے کی یادوں کے ساتھ میں نے تمہیں بھی دل کے ایک گوشے میں محفوظ کرلیا ہے'' آئمہ نے افسردگی سے باری باری اپنے پودوں کو چھوا اور ہمیشہ کی طرح ان سے باتیں کرنا شروع ہوگئی۔

روح میں پھیلی تنہائی کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس نے لاشعوری طور پر یہ مشغلہ اپنا لیا اور۔ اپنے پودوں کے نام بھی رکھ دیے۔ وہ ان سے یوں لاڈ دکھاتی جیسے وہ اس کے نخرے سمجھتے ہوں۔ پورا گھر اس بچپنے پر ہنستا، مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

''اوئے...... مجھے بھولنا نہیں گڈو۔ تم بہت شرارتیں کرتے ہو۔ اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا'' آئمہ نے سفید گلاب کو چھوتے ہوئے دھیرے سے سرگوشی۔ کیاری میں لگے پھول اس کی محبت پر گنگنا اٹھے۔ وہ کیاری کے قریب ہی بنی سنگ مرمر کی بنچ پر پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے بڑے سے گھر کو دیکھا، جس میں بڑے بڑے روشن اور ہوادار کمرے، ڈرائنگ اور ڈائننگ روم، جدید سہولتوں سے سجا ہوا کچن، پاپا کی اسٹڈی روم، مہمانوں کا کمرہ۔ سب کچھ تو تھا، مگر اسے اگر کسی گوشے سے دلچسپی تھی تو وہ پچھلے حصے میں واقع اس کچی زمین اور بڑے سے لان سے تھی۔ اس نے بڑی محنت سے کچے رقبے کو کیاری میں ڈھال لیا۔ جس میں اس نے گلاب، موتیا، بنفشہ، چنبیلی اور رات کی رانی لگائی تھی، یہاں آکر وہ بہت سکون محسوس کرتی۔

آئمہ ناصر شروع سے ہی ایسی تھی کچھ الگ، کچھ منفرد سی، انسانوں سے بچتی اپنے پیڑ پودوں سے ہی سارے دکھ سکھ شیئر کرلیتی۔ اس کی بس ایک ہی دوست تھی ثمرہ۔ وہ بھی اب دنیا کے میلے میں کھوگئی تھی۔ اسی لیے آئمہ نے ان پھولوں سے دوستی کرلی تھی۔ لان کے ساتھ بنی کیاریوں کو آباد رکھنے میں اس نے وقت بھی بہت لگایا، اب ان میں اگنے والے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتی، تو اس کے اندر خوشیاں مور کی طرح رقصاں ہوجاتیں۔

''کاش! میرے ساتھ ازل بھی یہاں موجود ہوتا'' آئمہ کی سوچ کی رو ایک دم دوسری طرف مڑ گئی۔ موسم کی خوبصورتی سے مزاج انہونیوں کی طرف مائل ہونے لگا۔ خیال یار کیا آیا، چہرہ گل و گلنار ہوگیا۔ وہ اس کی اور اپنی پہلی ملاقات میں کھوگئی۔

......☆......

''شکر ہے ان میٹنگوں سے تو جان چھوٹی۔ آج فری ہوں تو ضروری خریداری کر ہی لوں'' ازل کے آفس میں سالانہ کارکردگی کے جائزہ کے لیے کئی دنوں سے میٹنگز جاری تھیں، اسے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ آج دوسرے شہروں سے آئے افسران کی واپسی ہوئی تو اس نے

سکھ کا سانس لیا۔ آفس سے جلدی اٹھ گیا، راستے میں خیال آیا تو مال کی طرف گاڑی موڑ لی۔

''اشرف بھائی! پلیز میرا شیونگ کا سامان ختم ہوگیا ہے۔ سب چیزیں پیک کر دیں'' یہ شاپنگ مال ازل کے آفس کے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہیں سے سامان خریدتا تھا۔ اسی لیے اس شاپ کے مالک اشرف خان سے اس کی بہت اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ وہ شیونگ ریزر خریدنے آیا تو پتا چلا کہ اس کے پاس سے مطلوبہ برانڈ ختم ہوگیا تھا۔

''ازل بھائی! آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ مال میں ہی میرے چھوٹے بھائی کی شاپ ہے، وہاں سے آپ کی مطلوبہ کمپنی کا ریزر مل جائے گا''۔ اشرف نے کچھ سوچ کر اسے ٹھہرنے کا کہا۔ وہ اپنے پرانے گاہک کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

''ایسا ہو جائے تو کیا ہی اچھی بات ہو۔ ورنہ مجھے کہیں اور سے خریدنا پڑے گا'' ازل کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

''آپ کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔ آئیں دکان میں اس طرف بیٹھ جائیں۔ آج کام والے لڑکے نے چھٹی کر لی ورنہ اتنی مشکل پیش نہیں آتی۔'' جاتے وقت اُس نے زبردستی ازل کو شاپ کے اندر رکھے اسٹول۔ پر بٹھایا اور بڑبڑاتا ہوا تیز قدموں سے لوگوں کے ہجوم میں گھس گیا۔ ازل وقت گزاری کے لیے شیلف میں سجی اشیاء اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ ابھی شکر ہی ادا کر رہا تھا کہ کسی گاہک نے یہاں کا رخ نہیں کیا کہ آئمہ وہاں پہنچ گئی۔

''سنیں...... اس لسٹ کے مطابق سارا سامان پیک کر دیں'' آئمہ نے جنرل آئٹمز کی شاپ پر لمبے قد کے خوش شکل اور مضبوط مردانہ شخصیت کے مالک ازل کو کھڑا دیکھا، تھوڑا حیران ہوئی، اس کے بعد کندھے اچکا کر جلدی سے بیگ سے سفید کاغذ کی لمبی سی لسٹ ڈھونڈ کر نکالی اور۔ اس کے سامنے کاؤنٹر پر پھیلا دی۔

اچھا۔ میم۔ آپ جب تک دوسری شاپنگ کر کے آجائیں، میں مطلوبہ سامان نکال دیتا ہوں'' ازل اس کی غلط فہمی پر خوش ہوا۔ بوریت دور کرنے کے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس کی بے چین آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ آئمہ دیکھتی رہ گئی

واؤ۔ بندہ تو۔ بڑا ڈیشنگ ہے'' آئمہ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور دل میں اعتراف کیا۔

''لڑکی۔ تو بڑی پیاری ہے'' ازل نے سوچا۔ گلابی ہونٹوں پر ہنسی کی کرن چمکی۔ خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ کریم کرتے پر بلیک سوئیٹر پہنے اپنی اونچی اٹھان کی وجہ سے نمایاں ہو رہی تھی، سنہری رنگت، چہرے پر سوٹ کرتی چھوٹی سی کھڑی ناک اور سیاہ گھنگریالے بالوں کی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ شام کے ڈھلتے سائے، اس کی آنکھوں کی سحر انگیزی کو دو آتشہ بنا رہے تھے۔

وہ اس کی طرف دیکھتا رہ گیا، جو اسے دکان والا سمجھ رہی تھی۔ جب کہ وہ تو خود یہاں خریداری کرنے آیا ہوا تھا۔ دونوں کے ایک دوسرے کے بارے میں خیالات کافی ملتے جلتے تھے۔

''نہیں، مجھے جو چیزیں چاہییں وہ ساری آپ کی شاپ پر موجود ہیں۔ پلیز جلدی سے پیک کر دیں'' آئمہ اپنی محویت پر شرمندہ ہوئی، اس کے مشورے پر تھوڑا روڈ ہو کر جواب دیا۔

''اصل میں۔ میم۔ میں صرف شاپ پر آنے والوں پر نظر رکھنے کا کام کرتا ہوں۔ باقی سامان وغیرہ دوسرا بندہ رکھتا ہے۔ وہ بس آنے والا ہی ہے'' ازل نے مسکرا کر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ آئمہ کو اس کی بات پر پتنگے لگ گئے۔

''عجیب آدمی ہیں۔ کیا آپ کو ہم چور اچکے دکھائی دے رہے ہیں، جو نظر رکھ رہے ہیں۔ ویسے

اس دکان کے مالک کی تو۔ بڑی عیاشی ہے۔ ایک آدمی صرف نظر رکھتا ہے۔'' آئمہ نے بھنا کر اپنا بیگ اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور بولی۔

''کیا کریں مس۔ ہم ٹھہرے نایاب لوگ۔ تو ہمارے رولز بھی کچھ انوکھے ہی ہیں'' ازل کو اس کے ساتھ بحث کرنے میں مزا آنے لگا۔ آئمہ اپنے گلابی چہرے پر ٹشو پیپر پھیرنے لگی۔

''مسٹر آپ نایاب تو خیر کیا ہوں گے؟ پکے نظر باز ہیں۔ لگتا ہے آپ کا مالک آپ کو۔ فالتو بحث کے پیسے دیتا ہے۔ بٹ۔ پلیز میں بہت مصروف ہستی ہوں۔ دوسرے صاحب کو بلائیں۔ ورنہ میں دوسری شاپ سے سامان خرید لیتی ہوں''۔ آئمہ نے بیزاریت سے کہا۔ وہ ہمیشہ اجنبیوں کے معاملے میں محتاط رہتی تھی۔ مگر جانے کیوں...... اس اسمارٹ سے لڑکے سے بحث برائے بحث اسے مزہ دے رہی تھی۔

''ہا...... ہا۔ واہ۔ صاحب آپ نے تو ہمارا نام ہی بدل دیا۔ ویری فنی'' ازل کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

''اچھا۔ ازل بھائی۔ یہ لیجیے۔ آپ کا ریزر۔ بڑی۔ معذرت مجھے تھوڑی دیر لگ گئی'' کرتا شلوار میں ملبوس دکان کا مالک لوٹا تو ازل سے معافی مانگنے لگا۔ آئمہ حیرانی سے اپنی سحر انگیز آنکھوں سے ان دونوں کو گھورنے لگی۔ جب اسے بات سمجھ میں آئی تو پیشانی ایک دم عرق آلود ہوگئی۔

''سو۔ سوری۔ میں نے آپ کو غلط سمجھا'' جتنی دیر میں اس کا من چاہا سامان پیک ہوا آئمہ ازل کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس جیسی اکڑو لڑکی کو معافی طلب کرتے بنی۔

''ہونہہ۔ ایک شرط پر۔ یہاں کے فوڈ کورٹ کا پائن ایپل جوس بہت مزیدار ہوتا ہے۔ ایک ایک گلاس ہوجائے۔'' ازل کی شرارتیں عروج کو چھونے لگی۔ ہاتھ آئے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

''او کے لیکن بس...... دس منٹ۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے'' آئمہ نے ازل کو بھرم دیا۔ اس کے بھرے ہوئے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ ابھری۔ آئمہ کے کزن کی شادی تھی۔ اسے شاپنگ مال کے باہر اتار کر سارہ بھابی اپنے ٹیلر کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے نند کو آدھا گھنٹہ میں اپنی شاپنگ ختم کرنے کی گھنٹی دی تھی۔ مگر آئمہ کا تجربہ اس معاملے میں ہمیشہ برا ہی ثابت ہوا۔ مین مارکیٹ میں واقع اس ٹیلر کی دکان پر پورا سال رش رہتا تھا۔ بھابی کو آرام سے گھنٹہ لگ جانا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ازل کی بات پر حامی بھرلی۔

''ٹھیک ہے، گیارویں منٹ پر میں خود آپ کو وہاں سے اٹھا دوں گا'' ازل نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے پیش کش کی۔

آئمہ جب اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوئی تو اس کی خوشگوار کمپنی میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ انتہائی شستہ اطوار اور نرم مزاج کا حامل لڑکا تھا۔ گو ازل نے کئی بار اسے جتاتے ہوئے شرارتی انداز میں گھڑی دکھائی مگر...... وہ صائمہ کے انتظار میں ڈھیٹ بنی گھونٹ گھونٹ پائن ایپل شیک پیتی رہی۔

......☆......

دونوں میں پہلی ملاقات میں ہی اپنائیت کا ایسا احساس جاگا کہ باتیں ختم ہونے کا نام ہی لے رہی تھیں۔

''جی بھابی۔ میرا کام مکمل ہوگیا۔ او کے میں کار پارکنگ میں آتی ہوں۔'' سارہ کی کال آئی تو اسے جانے کی سوجھی۔

''مس...... آئمہ! اگر برا نہ مانیں تو اپنا نمبر دیں گی۔ اچھے لوگوں سے کبھی کبھی رابطہ رکھنے میں کوئی برائی نہیں۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔ مایوسی کا موقع

نہیں دوں گا'' آئمہ نے اجازت طلب کی تو ازل پر اداسی کی چادر تن گئی۔ اس نے یہ موقع گنوانے سے اجتناب برتا اور فوراً ہی سوال کیا۔ وہ ایک لمحہ اس کو دیکھتی رہی۔ چہرے کے تاثرات لہجے کی سچائی کے گواہ بن گئے۔ اس نے اپنی ہار پر گہری سانس بھری۔

''پلیز۔ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کیجیے گا۔ میں یوں ہی ہر ایک سے فری نہیں ہوتی مگر۔ آپ ایک اچھے انسان لگے تو۔ آپ کی سنگت بہت اچھی لگی۔'' آئمہ نے خود کو تسلی دی یا اس کو پتا نہیں تھا۔ دونوں کے بیچ نمبروں کا تبادلہ ہوا۔ وہ ہاتھ ہلاتی، شاپنگ بیگز سنبھالتی کیپسول لفٹ کی طرف بڑھ گئی، ازل اسے شیشے کے پار سے نیچے جاتا دیکھتا رہا۔

......☆......

دونوں ایک دوسرے سے اپنے جذبے یوں چھپاتے جیسے وہ سونے کے بنے ہوں اور چوری ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو۔ من میں لپیٹ کر دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر ان کی محبت، دن بہ دن شدت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے گھنٹوں باتیں کرتے مگر لفظ 'محبت' منہ سے نہیں نکلتا۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں لمحے گلاب ہو جاتے، غنچے کھل اٹھتے، پور پور خوشی سے بھر جاتا

شاپ پر آئمہ سے ہونے والی اتفاقیہ ملاقات ان دونوں کی زندگی میں ایک نئی تبدیلی لے آئی۔ رابطے بڑھے تو۔ اندازہ ہوا کہ دونوں کے خیالات میں کتنی مماثلت ہے۔

''ازی! میں ایسے بے نام رشتے سے ڈرنے لگی ہوں۔ بابا بہت سخت ہیں، کبھی ان کے کانوں میں ہماری دوستی کی بھنک بھی پڑ گئی تو ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے'' آئمہ ایک دن اپنے خیالات کی یورش سے گھبرا اٹھی۔ فون پر ہی روتے ہوئے بولی۔

''ایسا۔ کبھی نہیں ہوگا۔ میری زندگی۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ اچھا ایک بات کا جواب دو'' ازل کو اس کی معصومیت پر بے تحاشا پیار آیا جذبات سے بوجھل آواز میں پوچھا۔

''جی۔ پوچھیں۔'' ازل کا یہ انداز......اس کا دل ڈولا۔ دھیرے سے بولی۔

''مجھ سے شادی کرو گی؟'' ازل نے بہت سادہ الفاظ میں اتنی بڑی بات کہہ دی جس کو سننے کے لیے اس کے کان ترس رہے تھے۔ ازل نے اسے پرپوز کر دیا۔ اسے کافی دیر تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

......☆......

ازل نے بھی اب معاملہ سمیٹنا چاہا۔ روز روز ملنا بھی دشوار تھا۔ بس۔ فون پر چھپ چھپ کر باتیں ہو پاتیں۔ دوری نے تشنگی کا احساس جگایا۔ آئمہ کو بھی یہ بہترین حل لگا۔ اس سلسلے میں صائمہ سے مدد حاصل کی۔ وہ اپنے اطمینان کے لیے ازل سے ملی۔ لڑکا اتنا اچھا لگا کہ اس معاملے میں بہن کا ساتھ دینے کی حامی بھر لی۔

''میں نے راہ کے سارے خار چن لیے۔ اب تمہاری باری ہے'' آئمہ نے اس کے بارے میں صائمہ کی رائے کا بتاتے ہوئے شرارتی انداز اپنایا۔ وہ کھلکھلا دیا۔

''باجی مجھے شادی کے لیے ایک لڑکی پسند آگئی ہے'' اس نے نورین سے آئمہ کا ذکر کر دیا۔ اس کی توقع کے مطابق وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس کی منت سماجت مکھن پالش سب بے کار گئی۔ وہ کسی طرح بھی راضی ہو کر نہیں دے رہی تھی۔

''نہیں چھوٹے۔ رضا بھائی کی پسند سے دلہن لا کر ہم بھر پائے۔ اب تو محترم کا یہ حال ہے کہ سوتے بھی جوتے پہن کر ہیں، جانے کب ربیعہ پکار لے اور ان کو بھاگنا پڑ جائے'' نورین نے ٹھٹھہ

مار کر چھوٹے بھائی کے سامنے ایک بھونڈی سی رضا کی مثال پیش کی جو محبت کی شادی کے بعد ان لوگوں سے کافی دور ہو گیا تھا۔

''ایسا نہ کہیں۔ جب زندگی مجھے گزارنی ہے، تو مجھے اتنا تو حق حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی مرضی سے گزار سکوں'' ازل نے لہجہ کو دھیما بنانے کی بھرپور کوشش کی مگر نورین پر رتی برابر بھی فرق نہ پڑا۔

''کیوں۔ تمہیں۔ ہم پر اعتبار نہیں۔ اب تمہاری شادی ہم سب بہنوں کی پسند سے ہوگی۔ ایسی دلہن ڈھونڈیں گے، بس دیکھتے رہ جاؤ گے۔'' نورین نے بھی زور دے کر کہا۔

''باجی سب لڑکیاں۔ بھابی کی طرح نہیں ہوتیں۔ وہ بہت سمجھدار اور اچھی لڑکی ہے۔ پلیز آئمہ کو ایک موقع تو دیں''۔ ازل نے آئمہ کی تعریف کی

''یہ کیا بات کہی تم نے۔ ایک موقع تو دیں۔ شادی ہے کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ فرض کرو وہ ہمارے معیار پر پوری نہ اتری تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے۔ ہماری پسند کی لڑکی سے شادی کر لو گے۔ نہیں نا؟'' نورین کو بھائی کے بچپنے پر ہنسی آئی۔

''باجی۔ پلیز۔ چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ازل کا دل دہلا۔ ایک دم تیز ہوا۔

''ہاں ہاں چھوٹے اب بہن کو غصہ دکھاؤ گے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ ربیعہ سے بھی چار ہاتھ آگے نکلے گی۔ اس نے تو شادی کے بعد بھائی کو اُلو بنایا۔ تم تو شادی سے پہلے ہی اس کی مالا جپ رہے ہو''۔ نورین بھی اپنے نام کی ایک تھی بھائی کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ خود کھٹ کھٹ کرتی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

''اس سے پہلے کے یہ لڑکا ہاتھ سے نکلے باقیوں کو بھی خبر کر دوں۔ اللہ کی پناہ۔ آج کل کے لڑکے منہ سے شادی کی بات کرتے ہیں نہ شرم رہی نہ حیا'' نورین تلملاتی ہوئی ٹہل رہی تھی کہ ایک دم ماں جائیوں کی یاد ستائی۔ اخلاقی مدد حاصل کرنے کے لیے باقی بہنوں کو کھٹ سے فون گھمایا۔ اس کے چڑھانے پر۔ سب آگ بگولا ہونے لگیں۔ چھوٹے بھائی کی الگ الگ مقدور بھر کلاس لگائی گئی۔ ازل کا دل بھر آیا۔ اسے اگر آئمہ سے اتنی شدت کا پیار نہ ہوتا تو شاید ان سب کی ہٹ دھرمی پر پیچھے ہٹ جاتا۔ مگر اب تو دل کا معاملہ تھا۔

......☆......

''اچھا۔ بیوی ایک سوال ہے؟ بابر نے بیوی کی دکھ بھری کتھا سن کر مسکرا کر پوچھا۔

''جی کچھ بھی پوچھیے، مگر ازل کو سمجھائیں۔ وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالے گا''۔ نورین کا شوہر سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھائی کو منا سکتے ہیں۔ ان کو کیا خبر تھی کہ سالے بہنوئی میں اس بارے میں ایک ڈیل ہو چکی تھی۔

''اگر تم لوگ گارنٹی لو کہ جو 'بھابی' تم لوگ پسند کرو گے، وہ بہت اچھی ثابت ہوگی۔ تو میں ازل کو سمجھاتا ہوں'' بابر نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بیوی کو گھورا، وہ گڑبڑا گئی۔

''یہ کیسی بات ہوئی؟ ہم کیسے اس بات کا دعوی کر سکتے ہیں؟ آج کل کی لڑکیوں کا پتا نہیں۔ کتنی تیز ہیں؟ نہ بابا۔ ہم پہلے سے کیا کہیں۔ جانے کون کیسی نکلے؟'' نورین ایک دم جوش میں شروع ہوئی۔ لفظ 'بھابی' ہمیشہ ان جیسی نندوں کا بلڈ پریشر ہائی کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ بابر نے جو الفاظ نورین کے منہ سے نکلوانے تھے۔ اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ہنسی نکل گئی۔

''بس...... تو اسی لڑکی کو خوشی خوشی بھابی بنا لو۔ جو بھائی کو پسند ہے۔ بھائی بھی خوش، تم لوگوں کا بھی بھرم رہ جائے۔ بعد میں کچھ ہو تو ساری ذمہ داری ازل پر ڈالنا۔ کہ تم نے ہی تو پسند کی تھی، ویسے بھی

آئمہ میرے دوست کی سالی ہے۔ بہت معزز اور پیسے والے گھر کی لڑکی ہے۔ اف! اصیم کی شادی پر اس کی بہنوں کو کیا تحائف ملے تھے۔ واہ واہ'' بابر نے بیوی کے مزاج کو سمجھتے ہوئے۔ یوں شیشے میں اتار اکے وہ مان گئی۔

☆......☆......☆

''کسی لڑکی کو اپنی محبت میں اس حد تک مبتلا کر دینا ،اس کے بعد پیچھے ہٹ جانا۔ ازل ندیم یہ شریفوں کا شیوہ تو نہیں'' اس نے آئینے کے سامنے برش کرتے ہوئے اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دہائی دی۔ اس کی رگوں میں معزز خاندان کا خون تھا۔

''ہاں۔'' اقرار کے سوا اس کے منہ سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔ ہاتھ پاؤں پر لرزش سی طاری ہوگئی۔ چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

''آئمی۔ مجھے۔ یہ ہی اعتبار چاہیے تھا۔ اب ہم دونوں کے بیچ کوئی نہیں آئے گا۔ میں اپنی باجی سے بات کر کے رشتہ بھیجتا ہوں تم صائمہ باجی کو سب بتا دو۔ وہ ہی ہماری مدد کر سکتی ہیں۔'' وہ ایک دم خوش ہو گیا۔ اسے آئمہ کے ذریعے اس گھر والوں کے خیالات کا علم تھا۔

دھوکا نہیں دے سکتا تھا یہاں تو وہ خود مبتلا محبت تھا۔ اتنا آگے بڑھنے کے بعد پیچھے ہٹنا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' ازل بھی اپنی بات پر اڑ گیا۔ بالآخر۔ اس بار بھی بہنوئی ہی کام آیا۔

☆......☆......☆

''ایسے ہی انجان لوگوں سے کیسے رشتہ جوڑ دیں؟'' آئمہ کے بابا ناصر خان نے بڑی بیٹی کو گھورا جو باپ سے ازل کی سفارش کر رہی تھی۔ آئمہ بند دروازے سے کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بابا انجان کیوں؟ لڑکے کا بہنوئی آپ کے داماد کہ دوست ہے۔ یہ کافی عرصے سے جانتے ہیں۔ کیوں جی! بتایئے نا؟'' صائمہ نے شوہر کو ٹھوکا دیا تو وہ مسکراہٹ دباتا ہوا سر ہلانے لگا۔

''اچھا...... میاں لڑکا کرتا کیا ہے۔ تعلیم وغیرہ؟'' ناصر خان داماد کا لحاظ کرتے ہوئے تھوڑے دھیمے ہوئے، عصیم جلدی جلدی ذہن میں وہ کوائف دہرانے لگے، جو سالی اور بیوی سے حاصل ہوئے تھے۔ انہیں آئمہ سے بہت پیار تھا۔ سسر کی قدامت پسندی سے اچھی طرح واقف تھے ،انہوں نے شروع سے بیٹیوں پر تھوڑی سختی روا رکھی۔ اسی لیے وہ بیوی کے زور دینے پر سالی کی مدد کو آمادہ ہوئے۔

''بابا! لڑکا بہت شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا ہے۔ کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے۔ اب ایک بہت بڑی کمپنی کا ڈائریکٹر ہے۔'' صمیم نے جلدی جلدی تفصیل بتائی، ناصر چشمے میں سے داماد کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

''ہوں...... رہتا کہاں ہے؟'' انہوں نے ایک ٹیڑھا سوال کیا۔ صائمہ چونکی۔ جانتی تھی یہاں معاملہ اٹکے گا۔

''جی ابھی۔ تو۔ اپنی بہن کے ساتھ رہتا ہے'' صمیم نے اٹک اٹک کر کہا۔ وہ بے چین ہو اٹھے۔

''کیا۔ نہیں بھئی ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ بھلا بتاؤ۔ ہمارے خاندان میں تو بہن بیٹیوں کے گھر کا پانی پینا بھی حرام سمجھا جاتا ہے'' ناصر بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کا منہ اتر گیا۔

''بابا۔ اس بیچارے کے ساتھ ٹریجڈی ہی ایسی ہوئی۔ مجبوری ٹھہری۔ مگر اتنا خوددار ہے کہ پورا خرچہ دیتا ہے'' صمیم نے فوراً ان کا ہاتھ تھاما اور دوبارہ جھولنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔

''کیا مطلب کیسی مجبوری؟'' ناصر خان نے بھنویں اچکا کر پوچھا اور کرسی پر بیٹھ کر ان کی بات

سننے لگے۔

"والدہ کے انتقال کے بعد اس کے والد صاحب بہت بیمار رہنے لگے ہیں۔ ازل دفتر میں چلا جاتا تو وہ پورے گھر میں اکیلے بولائے بولائے پھرتے۔ ذہنی تناؤ اتنا بڑھا کہ ایک دو بار بے ہوش ہو گئے۔ بس بیٹی اپنے ساتھ زبردستی لے گئی۔

"اوہ۔ یہ تو ہے۔ بڑھاپے کا اکلاپا بہت برا ہوتا ہے" انہوں نے آہ بھری۔ اتفاق سے وہ بھی ایسی ہی کیفیت سے گزر رہے تھے۔

ناصر خان دنیا کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس المیے کے بعد سے انہوں نے بیٹیوں پر سختی روا رکھی۔ ان لوگوں کی قسمت اچھی نکلی۔ ان کی بڑی بہو سارہ بہت اچھی ثابت ہوئی۔ اس نے آتے ہی پورے گھر کو سمیٹ لیا۔

"لڑکا۔ فی الحال میری دوست کی فیملی یعنی اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ رہتا ہے۔ مگر ان کا ذاتی آبائی مکان بہت اچھی جگہ پر واقع ہے۔ وہ شادی کے بعد وہاں رہائش اختیار کرے گا" صمیم نے سسر کو دکھی اور سوچوں میں گھرے دیکھا تو جلدی جلدی بات مکمل کی۔ صائمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم لوگوں کا جب دل چاہے۔ ان کو بلا لو" ناصر خان سے مزید وہاں بیٹھا نہ گیا، مہر النساء کی یاد نے افسردہ کر دیا۔

سچ کہا ہے کسی نے، سانس ٹوٹنے سے تو آدمی ایک بار مر جاتا ہے، مگر اپنے پیارے کا ساتھ چھوٹ جانے سے زندگی میں کئی بار مرتا ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے، کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک دم وہاں سے اٹھ گئے۔ ناصر خان نے بچوں کی خاطر اپنے جذبات کو مار کر ہمیشہ ان کے مستقبل کی طرف دیکھا، مگر وہ بھی گوشت پوست سے بنے انسان تھے کبھی کبھی ان کا ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کو دل بے قرار ہو جاتا، ایسے میں وہ لمحے کی گرفت میں ہوتے، ماضی کی خوبصورتیاں اور مہر النساء کی یاد انہیں جکڑ لیتی اور وہ کھو جاتے۔

☆

نورین نے باقی بہنوں کو راضی کیا اور چند دنوں بعد ہی وہاں رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ دوسری طرف کا محاذ صائمہ نے سنبھالا ہوا تھا۔ زمین تیار تھی۔ آب و ہوا بھی ساز گار تھی۔ یوں نئے رشتوں کے بیج پڑ گئے۔ دونوں طرف بہنوئیوں کی مہربانی سے یہ شادی طے پا گئے۔

مزے کی بات یہ ہوئی دونوں گھرانوں کا کئی بار ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوا صمیم اور بابر میں سچ مچ کی دوستی ہو گئی پکی والی۔ ان دونوں کو برسوں پرانے دوستوں کی طرح محو گفتگو دیکھ کر آئمہ اور ازل کی آنکھیں پھٹ جاتیں، دونوں اس کے بعد دیر تک ہنستے رہتے۔

صائمہ کو اس موقع پر ماں کی یاد شدت سے آئی، مگر جب بھی انہوں نے پلٹ کر آواز نہ دی تو وہ لوگ بھی ان کے معاملے میں بے حس بن گئے۔ صمیم نے آگے بڑھ کر بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔

☆

اے یہاں کیا کر رہی ہو؟ شادی میں مہینہ بھر رہ گیا اور تم اتنی صبح دھوپ میں کھڑی۔ ان گڈو، پپو، چیپو کے لیے اپنا رنگ روپ جھلساتے پر تلی ہوئی ہو۔" صائمہ دور سے تیز آواز میں بولتی ہوئی اس کی طرف بڑھی مگر وہ خیالوں میں ازل کا ہاتھ تھامے پتا نہیں کہاں کہاں کی سیروں کو نکلی ہوئی تھی، اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

"بس بہت ہو گئے نظارے اب فوراً اندر چلو" صائمہ نے بڑی بہن ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے آئمہ کی کمر پر ایک دھپ لگائی تو وہ چونک اٹھی۔

"اپیا۔ کیا ہے؟ چند دنوں کی عیاشی کر لینے دیں۔ اس کے بعد مجھے اپنے لاڈلوں سے الگ

ہو جانا ہے؟'' آئمہ کی آواز بھرا سی گئی، بابل کا انگنا چھوڑنا آسان نہ تھا، بہت خوشگوار لمبے ساتھ نہیں مگر عمر کے بیس سال گزارنے کے بعد یہاں کے چپے چپے سے انسیت محسوس ہوتی تھی۔

''یہ تو حق بات ہے میری شادی کو دو سال گزر گئے اس کے باوجود، جب بھی پاپا کے گھر رہنے آنے کا پروگرام بناتی ہوں تو من خوشی کے مارے بچوں کی طرح ہمکنے لگتا ہے۔'' صائمہ نے بہن کی تائید کی۔ ماں تو تھی نہیں جو ماں کا گھر، کہتی۔

''آہ۔ آپی۔ ہم وہ بدقسمت بیٹیاں ہیں، جنہیں وقت رخصت ماں کے لبوں سے نکلی ہوئی دعائیں بھی نصیب نہیں۔'' آئمہ نے دکھی ہوتے ہوئے کہا۔

''آئمی جان۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ انسان مرے کو رو لیتا ہے، مگر زندہ کے لیے کہاں سے صبر لائے۔ اس کے باوجود نئی زندگی کی شروعات کرتے ہوئے ان منفی سوچوں سے چھٹکارا پالو۔ یہ ہی بہتر رہے گا۔'' صائمہ بہن کی کیفیت سمجھ رہی تھی اسی لیے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''آپی۔ اتنے سال گزر گئے۔ ہم صبر ہی تو کر رہے ہیں۔ نئے رشتے بننے جا رہے ہیں۔ ازل بہت اچھا ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی پورے جسم میں ایک خوف کی لہر سی اٹھتی ہے۔'' آئمہ نے ایک جھرجھری لی اور آنکھیں موند لیں، صائمہ بہن کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی، اس کی کونسلنگ ضروری ہو گئی۔

''جان...... ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ اب ان پودوں کی طرف دیکھو، جب پرانے پھول مرجھا جاتے ہیں، تب ہی تو کونپلیں پھوٹتی ہے۔ تاکہ نئے پھول ان کی جگہ لے سکیں۔ اگر قدرت کا ایسا نظام نہ ہوتا تو ہر طرف خزاں ہی طاری رہتی، بہار کیسے آتی؟ بالکل اسی طرح ہماری زندگی میں کچھ کھو جاتا ہے تو کچھ نیا اور اچھا مل جاتا ہے۔ اسی لیے کسی کے ہونے یا چلے جانے سے زندگی رک نہیں جاتی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ یہ ہی فطرت کے قواعد ہیں۔ کسی کے نہ ہونے کا ملال دل میں زخم بن کر تو رہ سکتا ہے۔ پر ہم اس وجہ سے اپنی زندگی میں آنے والی خوشیوں سے منہ نہیں موڑ سکتے۔'' صائمہ نے پیار سے بہن کا ہاتھ تھام کر سہلاتے ہوئے سمجھایا۔ تو اس نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''ویسے بھی بھنو۔ ہمارے دامن میں میکے کی تلخ یادوں کے ساتھ ساتھ کچھ اچھے پل بھی موجود ہیں نا۔ تم بھی میری طرح دل کو مضبوط کر لینا۔ ساری اچھی یادیں سسرال ساتھ لے جانا، اور دکھی لمحوں کو اسی کچی مٹی میں دفن کر جانا'' صائمہ کو ماں کی یاد نے ستایا تو حلق تک کڑوا ہو گیا۔ زمین کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''آپی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ والدین کی غلطیوں کی سزا اولاد بھگتی رہے'' آئمی کے حلق میں پھندا سا لگا۔ ساری عمر ماں کی اتنی پروا نہیں رہی جتنی ان دنوں ہو رہی تھی۔

''بالکل ٹھیک بات ہے۔ مانا کے بابا نے غلطی کی۔ مگر ماما۔ وہ تو بالکل ہی بے وفا نکلیں، سالوں گزر گئے۔ مڑ کر دیکھا بھی نہیں کہ ہم زندہ بھی ہیں یا......'' صائمہ نے نادانستگی میں باپ کا دفاع کرتے ہوئے مہر النساء کا ذکر نکالا۔ ورنہ ان سب کے درمیان ایک خاموش معاہدہ طے پا چکا تھا کہ ماں، کا نام بھی کسی کے لبوں تک نہیں آئے گا۔ وہ ان کی زندگی کی کتاب کا ایسا ممنوع ورق بن گئی تھیں جسے کوئی دوبارہ کھول کر پڑھنے پر رضامند نہیں تھا۔

''ہوں ں!'' آئمہ نے جھرجھری لی اور ایک دم پیٹھ موڑ کر اپنے جذبات چھپانا چاہے۔ مہر النساء کی یاد زندگی میں آنے والی نئی تبدیلی پر بھی حاوی ہو رہی تھی۔

''آئمی کیا ہوا؟'' صائمہ گھوم کر اس کی طرف گئی تو وہ گلابی انگلی کی پور پر آنکھ سے ٹپکنے والے موتی کو

سنبھالے ہوئے کسی سوچ میں گم تھی۔
''اپیا! کبھی کبھی ماما کی یادیں دل کی نازک رگوں کو چھیدتی ہوئی روح میں اتر جاتی ہیں۔اس وقت۔ میں ایک دم احساس کمتری کا شکار ہونے لگتی ہوں۔ وجود میں جیسے ایک کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے'' آئمہ نے بہن کے اصرار پر دل کا درد کھول دیا۔
''ارے ۔میری بھنو۔سب بھول جاؤ ۔یقین جانو۔ازل کی محبت کا فسوں تمہارے لیے ایک کرشمہ ثابت ہوگا۔اچھا پیاری بہن ایک بات گرہ سے باندھ لو۔جب کسی کی زندگی میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو وہ دوسری طرف سے پوری کردی جاتی ہے۔یہ ہی تو میرے رب کی مہربانی ہے۔اب کسی خلش کو دل میں جگہ نہ دینا،ایسا نہ ہو کہ ان باتوں کی بھنک پاپا کے کانوں تک پہنچ جائے'' صائمہ نے پیار سے آئمہ کے چہرے پر جھولتی ہوئی لٹ کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایک دم کہنے لگی۔آئمہ نے گردن ہلائی۔صبح کے اجالے میں دونوں بہنوں کو ایک دوسرے کی سنگت میں وقت گزارنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ویسے بھی دونوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا،اسی لیے ایک دوسرے کی بہن کم دوست زیادہ بنی رہتیں۔
''ارے! میں تو ایسے ہی مذاق کررہی تھی۔اصل میں اپیا مجھے اپنی محنت اکارت جانے کا صدمہ ہے۔سارہ بھابی تو گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔بھلا اب میرے ان گڈو چندا وغیرہ کا دھیان کون رکھے گا'' آئمہ نے جلدی سے بہن کے سامنے شوخی دکھانے کی کوشش کی، یہ اور بات ہے کہ اس کا چہرہ اور لہجہ ایک دوسرے کے متضاد رخ پر رواں دواں تھے۔
''لو بھلا دکھ کی کیا بات ہے ازل جب تمہارے لیے سماج کی اتنی بڑی دیوار سے ٹکرا سکتا ہے۔تو ایسے باغ باغیچہ بنوانا اس کے لیے کوئی مشکل کام تھوڑی دیکھنا تمہاری خوشی کے لیے اپنے گھر کے لان کو پودوں سے بھر دے گا پھر وہاں کچھ اور نئے نام رکھ لینا،چمکی ، بندیا، روشنی اور سورج وغیرہ۔'' صائمہ کھکھلائی۔
''اپیا کیا ہے؟ میرے پیارے دوستوں کا مذاق اڑاتی ہیں'' آئمہ ایک دم جھینپ کر بولی۔
''ویسے ماننے کی بات ہے بندے میں بڑا دم ہے۔مجھے تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ابھی جو یہ منہ لٹکا ہوا ہے۔یہ نہ ہو کہ اس کے پیار سے چاند بن کر چمکے۔مجھے پتا ہے تمہارا دل خود ہی بغاوت کر بیٹھے گا اور ان گڈو۔پپو۔چپو۔تم۔سب کو بھول جاؤ گی۔ اسے بس سامنے بٹھا کر ''بیٹھ میرے پاس تجھے دیکھتی رہوں'' کی گردان کرتی رہو گی۔صائمہ نے بہن کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے چٹکی بجا کر گایا۔
''بس بس اسے اتنا نہ چڑھاؤ۔خود کو پہلے ہی پتا نہیں کیا سمجھتا ہے؟'' آئمہ کے چہرے پر محبت افشاں بن کر چمکی۔
''مان لو بندہ ہے تو سولڈ کیسے تمہاری محبت میں سماج کی اتنی بڑی دیواروں سے ٹکرا گیا'' صائمہ کے لہجے میں ہونے والے بہنوئی کے لیے تحسین چھپی ہوئی تھی۔
''ہونہہ...... بری بات وہ میری بڑی نندیں ہیں۔ان کا اتنا مذاق نہ اڑائیں'' موضوع کیا بدلا، آئمہ کے چہرے پر بھی شرارت جاگی۔اس نے بڑی بہن کی باتوں پر اپنی سوچوں کا، رخ مثبت راہ پر موڑا۔
''ہاہاہا دیکھا دل کا ڈاکو تھانہ کیسے پہچان لیا؟۔ ورنہ میں نے کون سا نورین باجی کا نام لیا تھا'' صائمہ نے بہن کو چھیڑتے ہوئے پرانی کہاوت میں من پسند ترمیم کی۔
''ویسے اپیا ایمانداری کی بات بتاؤں تو مجھے خود بھی نورین باجی سے تھوڑا خوف آتا ہے۔'' آئمہ

نے پودوں کے پتے فوارے سے دھو کر چمکا دیے۔
''کیوں بھلا کیا وہ چڑیل ہیں، جو تمہارا خون پی جائیں گی؟'' صائمہ نے گھاس کے قطعے پر تیز تیز واک کرتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔
''اپیا ویسے تو یہ غیبت ہوئی۔ پر سنا ہے کہ میری نند کی بخل پسندی ضرب المثل ہے۔'' آئمہ نے پکا منہ بنا کر کہا تو صائمہ کی ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی۔
''واہ! خاتون تو بڑی باکمال ہیں۔ ان کی مثالیں دی جاتی ہیں'' صائمہ نے نورین کی کنجوسی کو سراہا۔
''میں تو اتنے کھلے دل کی ہوں جانے ان کے ساتھ گزارا کیسے ہوگا؟'' آئمہ نے گھنی پلکیں جھپکا کر کہا تو صائمہ کو چھوٹی بہن پر پیار آگیا۔
''تمہیں کون سا ان کے ساتھ رہنا ہے صمیم نے پہلے ہی ازل سے بات کر لی تھی کے شادی کے بعد تمہیں الگ رکھے، بہن کے گھر رہنے کی کیا تک بنتی ہے'' صائمہ نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلاسا دیا۔
''واسطہ تو پڑے گا ازل کی باقی تینوں بہنیں تو شادی کے بعد ملک سے باہر سدھار گئیں۔ اب نورین باجی یہاں ہیں۔ تو ان سے ہی زیادہ تعلق رہے گا'' آئمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''خیر چندا! ہمیں تمہاری صلاحیتوں پر مکمل بھروسا ہے۔ وہ چاہے جیسی بھی ہوں؟ تم کیسی ہو ہمیں اس بات پر مکمل اطمینان ہے۔ اسی لیے اب بے فکر ہو کر سسرال کی دہلیز پار کرو' چل کر تھوڑی دیر دادی کے پاس بھی بیٹھ جاؤ، انہیں کل سے پھر دورہ پڑا ہے۔ صائمہ نے ایک بار پھر شرارتی انداز اپنایا تو آئمہ جھینپ گئی۔
''چلو لڑکی سارہ بھابی کے ہاتھ کے مزیدار پراٹھوں اور آلو کی بھجیا سے لطف اٹھائیں، میں جب باہر آئی تھی تو وہ کچن میں ناشتا بنانے جا رہی تھیں، ان کی پھرتی سے کچھ بعید نہیں اب تک تو ساری چیزیں سج دھج کر ہمیں پکار رہی ہوں'' صائمہ کو خیال آیا تو اس نے چھوٹی بہن کا ہاتھ پیار سے پکڑ کر اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆......☆

ندیم علی کا گھرانہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود عالی نسب تھا۔ ندیم علی اور فرحت ندیم نے زندگی کا سفر بھرپور انداز میں گزارا، راہ کی کٹھنائیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت سے لطف اٹھاتے رہے۔
ان کے آنگن میں چھ پھول کھلے، سب سے بڑا رضا ندیم، جو خاصا جذباتی واقع ہوا تھا۔ اس کے بعد چار بیٹیاں نورین، مہرین، فرحین اور شازمین تھیں۔ سب سے چھوٹا شرارتی سا ازل ندیم، جس میں پورے گھر کی جان اٹکی رہتی تھی۔
رضا ندیم ایک سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات ہوئے تو وہاں ان کی ملاقات ربیعہ سے ہوئی۔ وہ اپنے بخار کا علاج کروانے آئی تھی اور خود ان کو مبتلائے عشق کر گئی دونوں نے بڑے زور وشور سے محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ جب ربیعہ نے رضا پر شادی کے لیے زور دیا تو، وہ اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر والوں سے ملوانے لے آیا۔
ندیم علی کو شادی سے قبل ربیعہ کی یہ بے باکی بالکل پسند نہیں آئی۔ انہوں نے ایک دم منہ بنالیا۔ ربیعہ کے دل میں بھی ان کی طرف سے گرہ پڑ گئی پر وہ بظاہر سب سے ہنس ہنس کر ملتی رہی۔ فرحت تو بیٹے کے تیور دیکھ کر ہی دب گئیں۔ جو ربیعہ پر ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ اسی لیے وہ لڑکی سے بہت اچھے طریقے سے ملیں۔
ندیم علی نے البتہ اپنی بے زاریت اور ناپسندیدگی چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ وہ پرانے خیالات کے مالک بڑے زعم میں مبتلا تھے۔ انہیں

اپنے ولی عہد پر بہت بھروسا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رضا والدین کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔ مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔

رضا نے باپ کی مخالفت کے باوجود ربیعہ سے شادی کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ فرحت منہ زور ہوتے بیٹے کی وجہ سے مجبور ہوگئیں اور شوہر کو منع کر رشتہ لے جانے کو تیار ہوگئیں۔

شادی سے قبل جس ربیعہ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے اور پورا گھر اس کی خوش اخلاقی کی گواہی دیتا تھا۔ رضا کی بیوی بنتے ہی وہ جانے کیسے روکھے پھیکے مزاج میں ڈھل گئی۔ ان لوگوں کے ساتھ اس نے بمشکل ایک سال ہی گزارا۔ فرحت ساس کے روپ میں اللہ میاں کی گائے ثابت ہوئیں۔ مگر سسر ندیم علی نے ساری کسر نکال لی۔ دونوں کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف دل میں عناد پالے بیٹھے تھے۔ اب ربیعہ کی گود میں مریم آچکی تھی، کھونٹا بھی مضبوط ہوگیا تو اس نے علیحدگی کے لیے شور مچا دیا۔ فرحت ندیم جو ایک سیدھی سادھی خاتون تھیں، اس روز روز کے شور شرابے سے پریشان ہوگئیں۔ اسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی مگر سسر ندیم علی اور نورین جیسی مزاج دار نند کے ساتھ اس کا گزارا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

نورین ہر ہفتے ماں کے گھر کا چکر لگاتی۔ اسے بھابی کے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور کھانے پینے تک کے معمول ازبر تھے۔ ایک ایک بہن کو فون پر میکے کی پوری رپورٹ فراہم کی جاتی۔ شہرین، شادی کے بعد امریکا۔ جبکہ فرحین اور مہرین اپنے شوہروں کے ساتھ کینیڈا سدھار گئی تھیں۔ ربیعہ کو قطعی طور پر اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں تھی۔ وہ شوہر کے کان بھرتی رہی اور آخر کہہ سن کر الگ ہو ہی گئی۔

......☆......

فرحت نے بیٹے اور بہو کا غم دل پر لے لیا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولیں اندر ہی اندر کڑھتی رہیں اور چپ چاپ دنیا چھوڑ گئیں۔ ماں کے مرنے کے بعد جب ازل اور ندیم علی کو کوئی مشکلات پیش آئیں تو اس نے ایک دن سب کو جمع کیا۔ اپنے مسائل اور پاپا کی تنہائی کا نقشہ کھینچا۔ تینوں بہنیں بھی ماں کے مرنے پر پاکستان آئی ہوئی تھیں، مگر ٹھہریں اپنے سسرالوں میں تھیں۔

رضا نے بہنوں کے دباؤ میں آ کر ان دونوں اپنے ساتھ لے جانے کی پیش کش کی مگر ربیعہ کی لاتعلقی پر بہنیں چڑ گئی۔ سب کے سمجھانے پر نورین بھائی اور باپ کو زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ بیوی کے جلد بازی میں کیے گئے فیصلے پر بابر نیاز کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔ وہ دواؤں کی کمپنی میں سیلز مینیجر تھے۔ کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اکثر انہیں ایک ایک ہفتے کے لیے اندرونِ سندھ جانا پڑتا۔ ایسے میں۔ گھر میں ان لوگوں کی موجودگی قابل اطمینان تھی۔ بہن کے گھر رہنے پر ازل کی دل کی کلی مرجھا سی گئی۔ وہ کافی غیرت مند واقع ہوا تھا مگر پاپا کی وجہ سے اس نے یہ کڑوا گھونٹ پینا بھی برداشت کر لیا۔

زندگی کا حاصل مسلسل پیکار میں مبتلا رہنا ہے۔ وقت کی چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں جب قسمت کا پانسا انسان کے حق میں پلٹ جاتا ہے۔ اس لیے سعی جاری رکھنا ضروری ہے۔

......☆......

''ازل! کیا بات ہے؟ آج بڑی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟'' بابر نیاز نے مسکرا کر سوچ میں کھوئے ہوئے سالے سے پوچھا، جس کی شرارتی آنکھوں کی جوت آج کچھ مدھم دکھائی دے رہی تھی۔

بھائی جان۔ آپ کے اندازے کی داد دینی

پڑے گی۔ واقعی آپ چہرہ شناسی میں ماہر ہیں۔ بس ایک مسئلہ ہے۔ جو آپ کی مدد کے بغیر حل ہو ہی نہیں سکتا'' ازل نے بہنوئی کے برابر میں نرم صوفے پر دھنستے ہوئے عاجزی سے کہا۔

''خیر تو ہے سالے جی؟ ایسی کیا مصیبت آن پڑی۔ جو آپ اتنے متوحش دکھائی دے رہے ہیں۔ میرے حساب سے تو۔ آپ کی نیا طوفانوں سے نبرد آزما ہو کر ساحل پر پہنچنے ہی والی ہے؟'' بابر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سوال کیا۔

''کہاں بھائی جان! ابھی بھی راہ میں رکاوٹیں حائل ہیں۔'' ازل کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دوڑ گئی، جس میں خوشی کی رمق نہیں بلکہ افسردگی کا جہاں آباد تھا۔

''اب کیا ہو گیا چھوٹے؟'' بابر نے تسلی دینے والے انداز میں پوچھا۔

''کیا کہوں۔ آپ سے تو کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ امی جی کے انتقال کے بعد مجھے اور پاپا کو کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ساری بہنوں کی شادیوں کے بعد گھر خالی ہو چکا تھا۔ ربیعہ بھابی نے بھی ہماری ذمہ داری اٹھانے سے کنی کترائی۔ پاپا کی بیماری اور تنہائی کی وجہ سے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں آپ کے گھر میں رہائش پزیر ہونا پڑا۔'' ازل کا لہجہ گھمبیر ہوتا چلا گیا۔ ماضی کی پرچھائیاں حال پر غالب آ گئیں۔

''چھوٹے! مجھے ساری باتیں یاد ہیں۔ میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ ایسی تمہید کیوں باندھی جا رہی ہے'' بابر اس کا دکھ سمجھتے تھے اسی لیے اس کے کاندھے کو تھپکتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''اصل میں میری خواہش ہے کہ آمنہ شادی کے بعد اس گھر میں جا کر اترے جہاں میری جنت مکانی ماں نے اپنی عمر عزیز کے طویل برس گزارے تھے۔ اسی لیے میں پاپا کو لے کر آبائی مکان میں شفٹ ہونا چاہتا ہوں'' ازل نے سنجیدگی سے کہا۔ بابر کے ریموٹ پر چلتی انگلیاں تھم گئیں۔ وہ مسلسل ٹی وی کے چینل بدل رہے تھے۔

''اچھا۔ تو یہ بات ہے ویسے اگر تم چاہو تو شادی کے بعد بھی ہمارے ساتھ ہی رہ سکتے ہو، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔'' بابر نیاز نے بڑی سادگی اور خلوص سے اسے پیش کش کی۔

''شکریہ بھائی جان۔ مجھے آپ کی محبتوں پر رتی برابر شبہہ نہیں۔ مگر اس وقت مجبوری تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ میں تو ہوٹل بازی کر لیتا مگر پاپا سے اس عمر میں اتنے ثقیل کھانے برداشت نہیں ہو پا رہے تھے، اس کے علاوہ امی کے جانے کے بعد وہ انتہائی کم گو اور بیمار رہنے لگے تھے۔ میرے آفس جانے کے بعد ایسی کنڈیشن میں ان کا اکیلا پن بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اسی لیے سب کے مجبور کرنے پر ہم اس گھر کو کرائے پر اٹھا کر یہاں چلے آئے۔ اب شادی کے بعد آمنہ کی موجودگی میں میرے تفکرات کافی کم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں نند بھاوج کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ ان میں ان بن کا خدشہ بہت زیادہ رہتا ہے۔ شادی کے بعد کوئی تنازع اٹھے۔ اس کے بعد ہم الگ ہوں۔ تو باجی کا دل برا ہونے کے ساتھ ساتھ جگ ہنسائی بھی ہوگی۔ میں نے حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا تو ایک یہ ہی حل معقول لگا'' بابر نیاز نے چونک کر ازل کو ستائش بھری نگاہوں سے دیکھا، انہیں سالے سے اتنی سمجھداری کی امید نہ تھی، وہ جو کہہ رہا تھا، اس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ نورین کی فطرت سے بھی واقف تھے جس کے ساتھ ہر کسی کا گزارا آسان نہیں تھا۔

''بات تو تمہاری درست ہے میاں چلو جیسی تمہاری مرضی۔ کرائے داروں سے۔ گھر خالی کروالیا ہے؟'' انہوں نے اچٹتی سی نگاہ ٹی وی پر ڈالنے کے

پڑے گی۔ واقعی آپ چہرہ شناسی میں ماہر ہیں۔ بس ایک مسئلہ ہے۔ جو آپ کی مدد کے بغیر حل ہو ہی نہیں سکتا'' ازل نے بہنوئی کے برابر میں نرم صوفے پر دھنستے ہوئے عاجزی سے کہا۔

''خیر تو ہے سالے جی؟ ایسی کیا مصیبت آن پڑی۔ جو آپ اتنے متوحش دکھائی دے رہے ہیں۔ میرے حساب سے تو۔ آپ کی نیا طوفانوں سے نبرد آزما ہو کر ساحل پر پہنچنے ہی والی ہے؟'' بابر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سوال کیا۔

''کہاں بھائی جان! ابھی بھی راہ میں رکاوٹیں حائل ہیں۔'' ازل کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دوڑ گئی، جس میں خوشی کی رمق نہیں بلکہ افسردگی کا جہاں آباد تھا۔

''اب کیا ہو گیا چھوٹے؟'' بابر نے تسلی دینے والے انداز میں پوچھا۔

''کیا کہوں۔ آپ سے تو کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ امی جی کے انتقال کے بعد مجھے اور پاپا کو کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ساری بہنوں کی شادیوں کے بعد گھر خالی ہو چکا تھا۔ ربیعہ بھابی نے بھی ہماری ذمہ داری اٹھانے سے کنی کترائی۔ پاپا کی بیماری اور تنہائی کی وجہ سے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی یہاں آپ کے گھر میں رہائش پزیر ہونا پڑا۔'' ازل کا لہجہ گھمبیر ہوتا چلا گیا۔ ماضی کی پرچھائیاں حال پر غالب آ گئیں۔

''چھوٹے! مجھے ساری باتیں یاد ہیں۔ میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ ایسی تمہید کیوں باندھی جا رہی ہے'' بابر اس کا دکھ سمجھتے تھے اسی لیے اس کے کاندھے کو تھپکتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''اصل میں میری خواہش ہے کہ آئمہ شادی کے بعد اس گھر میں جا کر اترے جہاں میری جنت مکانی ماں نے اپنی عمر عزیز کے طویل برس گزارے تھے۔ اسی لیے میں پاپا کو لے کر آبائی

مکان میں شفٹ ہونا چاہتا ہوں'' ازل نے سنجیدگی سے کہا۔ بابر کے ریموٹ پر چلتی انگلیاں تھم گئیں۔ وہ مسلسل ٹی وی کے چینل بدل رہے تھے۔

''اچھا۔ تو یہ بات ہے ویسے اگر تم چاہو تو شادی کے بعد بھی ہمارے ساتھ ہی رہ سکتے ہو، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔'' بابر نیاز نے بڑی سادگی اور خلوص سے اسے پیش کش کی۔

''شکریہ بھائی جان۔ مجھے آپ کی محبتوں پر رتی برابر شبہ نہیں۔ مگر اس وقت مجبوری تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ میں تو ہوٹل بازی کر لیتا مگر پاپا سے اس عمر میں اتنے ثقیل کھانے برداشت نہیں ہو پا رہے تھے، اس کے علاوہ امی کے جانے کے بعد وہ انتہائی کم گو اور بیمار رہنے لگے تھے۔ میرے آفس جانے کے بعد ایسی کنڈیشن میں ان کا اکیلا پن بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اسی لیے سب کے مجبور کرنے پر ہم اس گھر کو کرائے پر اٹھا کر یہاں چلے آئے۔ اب شادی کے بعد آئمہ کی موجودگی میں میرے تفکرات کافی کم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں نند بھاوج کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ ان میں ان بن کا خدشہ بہت زیادہ رہتا ہے۔ شادی کے بعد کوئی تنازع اٹھے۔ اس کے بعد ہم الگ ہوں۔ تو باجی کا دل برا ہونے کے ساتھ ساتھ جگ ہنسائی بھی ہو گی۔ میں نے حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا تو ایک یہ ہی حل معقول لگا'' بابر نیاز نے چونک کر ازل کو ستائش بھری نگاہوں سے دیکھا، انہیں سالے سے اتنی سمجھداری کی امید نہ تھی، وہ جو کہہ رہا تھا، اس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ نورین کی فطرت سے بھی واقف تھے جس کے ساتھ ہر کسی کا گزارا آسان نہیں تھا۔

''بات تو تمہاری درست ہے میاں چلو جیسی تمہاری مرضی۔ کرائے داروں سے۔ گھر خالی کروا لیا ہے؟'' انہوں نے اچٹتی سی نگاہ ٹی وی پر ڈالنے کے

بعد ازل کی طرف رخ موڑا۔ لمبا، چوڑا۔ مردانہ وجاہت کا نمونہ۔ ان کا یہ سالا، چہرے پر معصومیت کی چھاپ، بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ بہنوں کا راج دلارا۔ سب سے چھیڑ چھاڑ میں لگا رہتا۔ یہ الگ بات تھی کے تنہائی اس کے اندر کسی بچے کی طرح ہلکورے لیتی رہتی تھی۔

''جی! کرائے داروں کو تو پہلے ہی نوٹس دے چکا ہوں۔ بس اب وہ خالی کر دیں۔ تو تھوڑی بہت مرمت اور وائٹ واش کا کام شروع کروا دوں گا'' ازل نے کہا، تو اس کی جلد بازی پر بابر نے زوردار قہقہہ مارا۔ وہ ایک دم جھینپ گیا۔

''ہوں ں ......تو صاحبزادے۔ ہم سے اجازت کا تو بہانہ ہے۔ پہلے ہی پکا کام کر چکے ہو۔ اچھا ہے بیٹا۔ شادی کے بعد پرائیوسی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔'' بابر نے اس کے کاندھے پر خوش دلی سے ہاتھ مارا اور چھیڑ چھاڑ میں لگ گئے۔

''بھائی جان اصل مسئلہ یہ نہیں تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ آپ تو میرا ہی ساتھ دیں گے'' ازل نے اضطراب سے پیر کو جھٹکا۔

''میاں! اب کیا پریشانی رہ گئی ہے؟'' بابر اس کے پے در پے بیانات پر وہ الجھ سے گئے۔

''وہ ......نورین باجی'' ازل نے اتنا ہی کہا تھا کے بابر نے بات کاٹ دی۔

''کیا میری بیگم تمہیں مسئلہ لگتی ہیں؟ ویسے آپس کی بات ہے مجھے بھی ایسی ہی لگتی ہے'' وہ شوخی سے کھلکھلائے تو ازل بھی ہنس پڑا۔

''اچھا بھائی مسئلہ تو گھمبیر ہے۔ نورین کبھی اس بات کی۔ اجازت نہیں دے گی۔ خیر ہم بھی کچھ نہ کچھ چکر چلائیں گے۔ بس تم تو اپنی شادی کی تیاری میں مصروف ہو جاؤ۔ بچی کو کسی بات کی کمی محسوس نہ ہونے دینا۔ باقی ہم پر چھوڑ دو۔'' بابر نیاز نے اسے دلاسا دیا تو ازل کو لگا کے کاندھے سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔

''اب شیرنی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟'' ازل سے وعدہ تو کر لیا۔ مگر بابر جانتے تھے انہوں نے ایک بڑی پریشانی مول لی ہے۔ وہ بیوی کی فطرت اور کنجوسی سے واقف تھے۔ ان کے آبائی گھر سے ملنے والا کرایہ پورا کا پورا۔ نورین کے ہاتھوں میں جاتا تھا۔ ازل بھی اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ بہن کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ گوکہ بابر نے بیوی کو کبھی روپے پیسے کی تنگی نہ ہونے دی مگر یوں ایک موٹی رقم ہاتھ سے جاتا دیکھ کر وہ سکون سے کہاں بیٹھتی؟

بابر نیاز نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا بیوی کی کون سی کل کیسے سیدھی کی جاسکتی ہے۔

......☆......

''میں نے ازل کو شادی کے بعد الگ ہونے کا کہہ دیا ہے'' بابر نیاز کے دماغ میں ایک دم جھماکا ہوا۔ انہیں یہ ہی صحیح وقت لگا اس لیے جی کڑا کر کے بولے۔

''وہ کیوں! کیا میرا بھائی اب اتنے سالوں بعد آپ کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ہے؟'' نورین سیٹ سے اچھلی۔ کہیں کا غصہ کہیں جا نکلا۔

''بس بھئی! اتنی مہنگائی ہوگئی ہے۔ میری بیوی بیچاری بچت کرنے کے لیے خاندان بھر سے جھگڑے مول لیتی ہے۔ بلاوجہ ہلکان ہوتی ہے۔'' بابر نے اس کے ترکش کے سارے تیر اسی پر آزماتے ہوئے پیار جتایا۔

''ہاں تو۔ اس بات سے ازل کی شادی کا بھلا کیا تعلق؟'' نورین نے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھی سی ڈیز چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''واہ!! کیسے تعلق نہیں بنتا۔ گھر میں نئی دلہن کی آمد کے ساتھ ہی خرچے بڑھ جائیں گے۔ مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ۔ نئی نئی شادی کے بعد آئمہ کے گھر والوں کا ہر وقت آنا جانا لگا رہے گا۔ اس پر

آج کل کی لڑکیوں کی شاہ خرچیاں۔ اب تم نئی دلہن کو باسی کھانوں پر بھی نہیں ٹرخا سکتیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد لڑائی جھگڑے اور رسہ کشی ہوگی۔ نہیں بھئی نرا خرچہ ہی خرچہ۔ ذہنی سکون الگ ختم ہو جائے گا۔ میں تم پر یہ ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' بابر نے نورین حیرت سے کھلا منہ دیکھا تو اپنی ہنسی چھپا کر زور زور سے بولنے لگا۔ اس کے دل پر بھی شوہر کی باتوں کا اثر ہونے لگا۔ وہ سوچ میں گم ہوگئی۔ باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔

☆......

اس پوری رات وہ صبح سے سو بھی نہ پائی۔ جب آنکھ لگتی۔ خواب میں ہونے والی بھاوج سے لڑنے لگتی۔ صبح تک نورین شوہر کی باتوں کی قائل ہوگئی۔

''ازل چندا اب تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں۔ اپنا گھر خالی کروا کر وہاں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ ویسے بھی ہر لڑکی کا حق ہے کہ وہ من پسند زندگی گزارے۔ میں آئمہ سے یہ حق نہیں چھین سکتی۔ جب تم لوگ سیٹ نہیں ہو جاتے پاپا یہاں میرے ساتھ ہی رہیں گے'' نورین نے چھوٹے بھائی کو گلے سے لگا کر متاثر کن جذباتی۔ انداز اپنا کر بخوشی الگ گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

''باجی یہ کیا۔ کہہ رہی ہیں۔'' ازل کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ مگر اس وقت سعادت مند بچے کی ایکٹنگ ضروری تھی۔ بابر نیاز نے نورین سے نگاہیں بچا کر اپنے کالر کھڑے کیے۔

''بس جو میں کہہ رہی ہوں۔ وہ ہی کرو'' نورین نے قطعیت سے بات کاٹی۔

''اچھا جیسا آپ کا حکم'' ازل نے سر جھکا کر معصومیت دکھائی۔ بابر اس کی چالاکی پر اسے گھورنے لگے تو وہ جھینپ گیا۔

''تیرا وجود جینے کا ایک حسین بہانا لگا مجھے'' ازل گنگناتا ہوا بہانے سے وہاں سے اٹھا۔ اسے آئمہ کو یہ خوش خبری سنانے کی جلدی تھی۔

☆......

''بھائی آپ نے بھی بہن سے ایسی غیریت برتی۔ بچے کے پاس ہونے کی اتنی بڑی تقریب رکھی اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔ بھابی نے صرف فون پر کہہ دیا کل کا ڈنر ہمارے ساتھ کرنا حد ہے کہ نہیں'' نورین جیسے ہی بڑے بھائی رضا کے گھر داخل ہوئی اتنے بڑے پیمانے پر منعقدہ تقریب کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ تو شکر ہے کہ وہ بھابی کی ضد میں یہاں ہمیشہ نک سک سے درست آتی تھی ورنہ کتنی جگ ہنسائی کا سامنا ہوتا۔

ازل نے بھی معمول کا ڈنر سمجھا اور اپنے کسی دوست کی منگنی میں چلا گیا۔ اسے کیا خبر تھی کے بھتیجے کی اتنی بڑی پارٹی ہو رہی ہے۔ نورین نے زبردستی ندیم صاحب کو ساتھ چلنے سے منع کر دیا کھانا اور دوا کھلا کر سلانے کے لیے لٹا دیا۔ یہاں آکر دیکھا تو رنگ ہی کچھ اور نکلے۔

''اپنوں میں کیا نیوتا، کیا بلاوا۔ بس عادل کے میٹرک میں پاس ہونے کی خوشی میں سب کو جمع کر لیا۔ تمہاری بھابی کو ضد چڑھ گئی کہ اس موقع پر خاندان بھر کی دعوت کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے بس تمہیں بھی فون کر دیا۔ رضا نے بہن سے نگاہیں چرائیں، ربیعہ کی حرکت پر غصہ بھی بہت آیا جس نے نورین کو تفصیلی بات نہیں بتائی۔

''لو! یہ کیا بات ہوئی۔ بتا دیتے تو کیا ہم کوئی اچھا سا تحفہ ساتھ نہ لاتے'' نورین نے روکھے پھیکے انداز میں کہا تو رضا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ یہ گفٹ کا ہی تو سارا جھمیلا تھا۔

''چلو چھوڑو تم کوئی غیر تھوڑی ہو جو لین دین کی فکر میں پڑ گئی ہو'' رضا بہن کو ساتھ لگائے اندر کی طرف بڑھے۔ سامنے ہی ربیعہ کریم انگر کھے پر ریڈ پائجامہ

پہنے۔ کسی اچھے پارلر سے سج سنور کر آئی تھی۔ نورین نے کڑوی گولی نگلی۔ وہ بھی اپنے میکے والوں میں گھری کھڑی تھی۔ نند کو دیکھ کر کچھ انجان بن گئی۔

''ربیعہ ادھر آؤ دیکھو نورین آئی ہے'' رضا نے بیوی کو آنکھ دکھائی تو وہ تیر کی طرح سیدھی ہوئی۔ ہاتھ پھیلا کر خوش آمدید کہتی آگے بڑھی۔ شوہر کا پیار برقرار رکھنے کے لیے۔ کبھی کبھی سسرالی رشتے داروں کی آؤ بھگت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے گلے بڑی گرمجوشی سے ملیں، بھلے دل میں منہ نوچ لینے کی خواہش انگڑائیاں لے رہی تھیں۔

''نورین آؤ نا یہاں سب سے آگے بیٹھو۔'' ربیعہ نے ان کو عزت سے لے جا کر مخملیں صوفے پر بٹھا دیا۔ ان کے ساتھ کچھ دیر بیٹھی پھر معذرت کرتی ہوئی اپنے دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆

''سنو۔ عادل کو۔ کیا دینا ہے۔؟'' بابر کو کبھی کبھی عزیز از جان بیوی کی کنجوسی بہت بھاری پڑتی۔ اس وقت بھی ٹس سے مس نہ دیکھ کر بیٹے سے اسے کونے میں بلوا کر پوچھا۔

''اس میں کیا سوچنا۔ بھائی نے کون سا ہمیں پارٹی کا بتایا تھا۔ ہم کسی تیاری سے تھوڑی آئے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے دے دیتے ہیں'' نورین نے سوکھا منہ بنا کر کہا تو بابر کا دل چاہا۔ وہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

''تم جانے کب سدھرو گی۔؟۔ عادل نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ دعوت اسی سلسلے میں رکھی گئی ہوگی۔ اسی لیے انتظام کر کے آیا ہوں۔ یہ لو لفافہ اس میں ہزار روپے ہیں۔ اپنے بھتیجے کو۔ دے دینا'' بابر نے گلابی لفافہ نورین کو زبردستی تھماتے ہوئے کہا تو میاں کی شاہ خرچی پر اس کا بی پی ڈاؤن ہونے لگا۔

بابر نے آنکھیں دکھائیں تو سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے، لفافہ پکڑا اور اس کے جانے کا انتظار کرنے لگی۔ جیسے ہی وہ مردانے حصے کی طرف بڑھا۔ نورین نے لفافہ کھول کر چیک کیا۔ دو کڑکتے ہوئے پانچ سو روپے کے نوٹ جھانک رہے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے ایک نوٹ نکال کر ہینڈ بیگ میں رکھا اور لفافہ دوبارہ چپکا دیا۔

☆......☆

''بھائی نے دعوت بڑی شاندار کی تھی۔ مزہ آ گیا'' نورین نے گاڑی کی سیٹ پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بابر نے سر ہلایا۔ وہ محویت سے ڈرائیونگ میں مشغول تھا۔ وہ لوگ تقریب کے اختتام پر گھر روانہ ہو رہے تھے۔ کھانوں کی خوشبو سے پوری گاڑی میں مہک رہی تھی، جو بابر کو بھرے پیٹ کے ساتھ کھانوں کی یہ خوشبو پریشان کر رہی تھی۔

یہ نورین کا وتیرہ تھا۔ وہ جب بھی بھائی کے گھر کسی دعوت میں جاتی۔ آخر میں باپ کا کھانا حق سے مانگ کر لاتی۔ سب کو پتا تھا ندیم صاحب پرہیزی کھانا کھاتے تھے، مگر ربیعہ کے چہرے کے بگڑتے نقوش دیکھ کر، نورین کے دل پر جو ٹھنڈی پھوار پڑتی، وہ اس کا مزہ لینے کے لیے ہر بار یہ حرکت کرتی۔ مصیبت میں تو باقی گھر والے مبتلا ہوتے جب وہ لگاتار دو تین دن تک باسی بریانی زردے گرم کر کرے سب کو تعریفوں کے ساتھ کھلائے جاتی۔ بابر نے ناک سکیڑی اور کھڑکی کھول دی تاکہ تازہ ہوا کی آمد و رفت ہو سکے۔

''مما آپ کو پتا ہے۔ مومو کیا بتا رہی تھی؟ شیزا کی آواز نے ان دونوں کو چونکایا۔

''نہیں بیٹا مجھے کیا خبر وہ تو آپ کی سکھی ہے۔ آپ دونوں ہی بیٹھ کر ایک دوسرے کے سامنے اپنے

اپنے پیٹ ہلکے کرتے ہو'' نورین نے شوہر کو دیکھتے ہوئے شوخی دکھائی، بابر نے خفگی سے منہ موڑ لیا۔

☆.......

''وہ۔ بتا رہی تھی کے اس کی مما یعنی مامی ربیعہ نے جان بوجھ کر ہمیں عادل بھائی کی پارٹی کا نہیں بتایا'' پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شیزا نے افسردگی سے کہا۔ موموـ یعنی مریم۔ رضا ندیم کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ دونوں لڑکیاں ہم عمر تھی اسی وجہ سے ان میں بہت ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ دونوں اپنے گھر میں ہونے والا ہر مسئلہ ایک دوسرے سے شیئر کرتی۔ مگر کبھی کبھی یہ بہناپا۔ ان کی ماؤں میں جھگڑے کی وجہ بن جاتا۔ ویسے بھی پیٹھ پیچھے تو بادشاہوں کو بھی برا بھلا کہا جاتا ہے۔ مگر جب اپنی برائی منہ پر سننے کو ملے تو برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔

''اسے کیوں چھپایا گیا۔ ہم نے کیا بھابی کے کھیت اجاڑ لینے تھے'' نورین ایک دم چونکی ہو کر سیدھی ہوئی اور بیٹی کو کریدا،، اس کا دل دھڑکا۔ اب راز پر سے پردہ اٹھنے والا تھا اور شیزا سے کارآمد مواد ملنے کی امید جاگی۔

''مما! آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ مامی۔ آپ سے بہت ناراض ہیں۔ اصل میں موموکی پچھلی سالگرہ پر آپ نے جو میرا ہینڈ بیگ تحفے میں دے دیا تھا۔ اس میں سے ایک زنگ آلود سیفٹی پن نکل آئی اور میری پونی۔ مامی نے ماما سے خوب لڑائی کی اور کہا کے آپ کی بہن اپنی استعمال شدہ چیزیں دوسروں کو تحفے میں کیوں دیتی ہیں۔'' شیزا کے لہجے میں درد گھلنے لگا۔ وہ ماں کی اِس عادت سے سخت نالاں تھی۔

''بھلا بتاؤ! اس میں اتنا غصہ ہونے کی کیا بات ہے؟ نہیں استعمال کرتی اٹھا کر رکھ دیتی'' نورین کا چہرہ لمحہ بھر کو فق ہوا۔ پھر بات سنبھالنے کی کوشش میں اناپ شناپ منہ سے نکلا۔

''اب سب آپ کی طرح اتنے باہمت تو نہیں ہوتے۔'' بابر نے ٹیڑھی آنکھ سے بیوی کو دیکھا اور جھنجلا کر بولا۔

''تو کیا ہوا؟ ایک ہی دفعہ تو استعمال کیا تھا۔ شیزا کو اس بیگ کا رنگ پسند نہیں تھا،۔ ویسے میں نے اچھی طرح سے چیک تو کیا تھا۔ جانے پن کون سے خانے میں رہ گئی''۔ نورین نے بھی بے زاریت سے جواب دیا۔

''مما! سنیں تو۔ ربیعہ مامی نے آپ کے بارے میں کہا۔ آپ انہیں اتنا حقیر اور گرا پڑا کیوں سمجھتی ہیں؟ اتنا پیسہ ہونے کے باوجود آپ کا دل کتنا چھوٹا ہے؟۔ پچھلی دفعہ جب رضا ماموں کی فیملی آئی تھی۔ تو میرے منع کرنے کے باوجود آپ نے چائے کے ساتھ کئی دن پرانی کھوئے کی مٹھائی پیش کی۔ اس میں سے عجیب سی بھبک اٹھ رہی تھی۔ وہ شکل سے ہی باسی لگ رہی تھی اسی لیے سب نے منع کر دیا اور ہاتھ بھی نہ لگایا۔ بیچارے ماموں نے آپ کی محبت میں کھالی۔ گھر جا کر پوری رات ان کا پیٹ خراب رہا۔'' شیزا نے دکھ سے موموکی بتائی ہوئی ساری باتیں ماں کے سامنے اگل دیں۔ نورین ایک دم سناٹے میں آگئی۔ بابر کو سردی میں بھی پسینہ آگیا۔ دل میں بیوی کو کچا چبا جانے کی خواہش جاگی۔

''میں نے کوئی جان بوجھ کے تو ایسا نہیں کیا۔ اتنی مہنگائی ہے تو کیا اصلی گھی کی مٹھائی کو پھینک دیتی'' وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی، فوراً تاویل پیش کی۔

''اسی لیے وہ اب آپ کو کسی ایسی دعوت میں نہیں بلائیں گی جس میں کسی بھی قسم کا دینا لینا ہو۔'' شیزا کی آواز دھیمی ہوگئی۔ بابر کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا۔

''نِی نِی!! تم اور کہاں کہاں ذلیل کرواؤں گی''

بابر کا چہرہ سپاٹ ہوگیا، وہ سرد اور ٹھٹھرے ہوئے انداز میں گویا ہوا۔

''یہ میرا بھائی کیا زن مرید بنا۔ بیوی کی سنتا رہا'' نورین کی شرمندگی لہجے بھر کی تھی۔ وہ صرف ڈھیٹ ہی نہیں مہا ڈھیٹ تھی۔ فوراً ہی بھابی پر غصہ اتارا۔

''ماموں۔ تو آپ کے پیچھے اتنا لڑے ورنہ مامی اسی دن وہ بیگ واپس کرنے آرہی تھیں۔ لیکن وہ اس بات پر مانیں کے آئندہ ہم لوگوں سے کوئی تحفہ نہ لیا جائے۔'' شیزا کا انداز سرکش ہوا۔ بابر نے مڑ کر بیٹی کو دیکھا جس کا چہرہ دوران تقریب ہی اتر گیا تھا۔

''یہ مومو کیوں پھاپھا کٹنی بنی۔ لگائی بجھائی میں لگی رہتی ہے۔ میں رضا بھائی سے اسے ٹھیک کرواتی ہوں۔ بھلا بتاؤ اتنی سی بچی اور زبان سوگز کی'' نورین سے کچھ اور نہ بن پڑا تو بھتیجی کے لتے لینے لگی۔

''بس کرو ساری دنیا کو ٹھیک کروانے کی جگہ خود کو درست کرلو تو یہ مسائل آپ ہی آپ ختم ہوجائیں گے'' بابر نے ہاتھ اٹھا کر سختی سے کہا۔ وہ منہ بسور کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہی اچھا ہو۔ اگر یہ عورت اپنی فطرت بدل ڈالے۔ زندگی مسکرانے نہ لگے''۔ بابر نے ملامتی نگاہوں سے برابر میں بیٹھی بیوی کو دیکھا۔ جواب باہر کے نظارے دیکھنے میں محو تھی۔ ڈارک بلیو ساڑی اس کی گوری رنگت پر بہت اٹھ رہی تھی۔

......☆......

''نورین باجی! کیا کیا تیاری ہے۔ شادی میں کتنا کم ٹائم رہ گیا ہے؟'' شازمین نے مسکرا کر بڑی بہن سے پوچھا۔ بھائی کی شادی میں شرکت کرنے مہزین اور شہزین پاکستان آگئیں۔ مہزین کے بچے چھوٹے تھے اس کے میاں نے صاف منع کردیا تو وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے۔'' نورین نے مسکرا کر کہا اتنے سالوں بعد خاندان میں خوشی کا لمحہ آیا تھا۔ سب رضا کے یہاں ٹہری ہوئی تھیں۔ آج نورین کے بلانے پر وہاں جمع ہوئیں۔ سب کارپیٹ پر منڈلی جمائے، پاپ کارن اور جوس کے مزے اڑا رہی تھیں۔ ان کا آبائی مکان میں ابھی مرمت کا کام جاری تھا۔

''بھئی بہنوں! یہاں پاکستان میں بھی۔ مت پوچھو کتنی تیاری ہوگئی ہے۔ اتنی مہنگائی ہوگئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ ہاتھ ہولا رکھنے کی ضرورت ہے'' نورین نے ایک بڑا سا شاپر سامنے رکھتے ہوئے تمہید باندھی۔

''جی باجی! لیکن شادی کی تیاری تو ضروری ہے نا'' ربیعہ نند کی تمہید سے سمجھ گئی دال میں کچھ کالا ہے، جلدی سے ٹانگ اڑائی۔ نورین نے اسے ایک دم گھورا تو وہ دبک گئی۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ میری شادی کا تو گلابی غرارہ نیا نیا کا رکھا ہے اسی پر ہی نئی قمیض لگوادیتے ہیں۔'' نورین نے دادطلب نگاہوں سے سب کو دیکھا، ربیعہ کو تو اچھو لگ گیا وہ فوراً نندوں کے بیچ سے اٹھ گئی۔ باقی سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ازل جواد پرصوفے پر بیٹھا تھا، ایک دم ہکا بکا بہنوں کو دیکھنے لگا۔

باجی آپ بالکل نہیں بدلیں'' شازمین نے سر ہلاتے ہوئے بہن کو دیکھا جو سب کے تاثرات سے انجان بڑے جوش وخروش سے وہ شاپر کھولنے میں مصروف تھی۔ جس میں وہ قدیم غرارہ رکھ کر لائی تھی۔ شاپر کا منہ کیا کھلا پورے کمرے میں فنائل کی گولیوں کی بھمک پھیل گئی۔ ازل نے ہونٹ چبا کر دوسری بہنوں کی طرف دیکھا۔ مہزین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چھوٹے کو تسلی دی۔

''باجی کیا کرتی ہیں۔ امی نہیں رہیں تو کیا ہوا۔ ہم تو زندہ ہیں۔ گھر کی آخری شادی ہے۔ ایک ہی تو بھائی رہ گیا۔ ہم تو چھوٹے کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کریں گے''مہزین نے چٹکی سے پرانا غرارہ اٹھا کر سائیڈ میں کیا۔ بہن کی بات پر نورین کا منہ بن گیا۔

''نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ بھیا فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے؟ ارے میں نے تو اپنا عروسی پرس بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اسی کی میچنگ کا ہے۔ ساتھ لگا دیں گے۔'' نورین کی آخری کوشش بھی با آور ثابت نہیں ہوئی۔ کسی نے دلچسپی نہ لی۔

''سوری باجی! نئی دلہن کے بھی کچھ ارمان ہوتے ہیں۔ مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔ مگر جب ازل اس بات کا متحمل ہو سکتا ہے تو اس کا حق ہے کہ اپنی ہونے والی بیوی کے لیے اچھی سی شاپنگ کرے۔''

مہزین نے اٹل انداز اختیار کیا۔ ساری بہنوں میں وہ تھوڑی گرم مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کے موڈ کا اندازہ کر کے نورین خاموش ہو گئی۔ ربیعہ جو واپس آ چکی تھی۔ مسکراہٹ کو زبردستی روکا۔

''تو طے پا گیا بری میں کوئی بھی پرانی چیز نہیں رکھی جائے گی'' شہزین نے ازل کی اتری صورت پر ترس کھاتے ہوئے، مہزین کی بات پر تصدیق کی مہر ثبت کی۔

''بالکل! بہن اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ اگر ہمارے سسرال والے بھی ایسا کرتے تو ہمیں کیسا محسوس ہوتا؟ مہزین نے زور دے کر کہا تو نورین غصے میں کونے میں دھرے فلور کشن پر جا کر بیٹھ گئی۔

بری کی تیاری بڑی زور شور سے کی گئی۔ سب بہنوں نے بھائی کا ساتھ دیا۔ آدھے سے زیادہ خرچہ تو انہوں نے اپنے پرس سے کیا، پھر بھی بہت خوش تھیں۔ اتنا مہنگا عروسی جوڑا لایا گیا۔ نورین کو قیمت سن کر ہی غش آنے لگا، مگر بابر کے گھورنے پر ہوش میں آنا پڑا۔

''ہائے ہائے پھٹ پڑے ایسا سونا جس سے کٹے کان۔ ایسا بھی کیا دنیا دکھاوا کے چند گھنٹوں کی تقریب پر لاکھوں لٹا دیے جائیں'' نورین نے قدم قدم پر بہنوں کو سمجھانا چاہا، مگر۔ اس کی ساری کنجوسی دھری کی دھری رہ گئی۔ باقی بہنوں نے ایسا ایکا کیا کہ اس کی ایک نہ چلنے دی

ولیمہ کے وینو سے لے کر کھانے کے مینو تک۔ مختلف تقریبات کے لیے سجاوٹ، مہمانوں کا استقبال، ان کی خاطر تواضع دلہن کی جیولری، پارلر غرض کوئی شے ایسی نہ تھی جس پر ان سب نے مل جل کر مشورہ نہ کیا ہو۔ خوب سوچ بچار کے بعد شادی پلان کی گئی۔ ایسی شاندار بری تیار کی گئی جس نے دیکھا دلہا والوں کی چوائس پر عش عش کیا۔ نورین البتہ پیسوں کے ضیاع پر ناخوش ہوتی رہی۔ سچ ہے جہاں حد سے بڑھی ہوئی کنجوسی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، وہیں بے جا اسراف بھی مناسب نہیں۔

''بھئی میں تو دعا کرتا ہوں، اللہ ان دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ یہ سدا شاد و آباد رہیں'' رضا نے بہنوں کی لائی ہوئی بیش قیمت ساڑیوں اور میچنگ جڑاؤ زیورات دیکھنے کے بعد مسکرا کر بھائی کی طرف دیکھ کر دعا دی۔ ساری بہنیں بری کے کپڑوں کی پیکنگ میں لگی ہوئی تھی۔ ربیعہ بھی اپنے پچھلے رویے کی تلافی کے لیے دیور کی شادی کے کاموں کے لیے ایک پاؤں پر ناچ رہی تھی ۔ بڑے ہال میں بری کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی چخ چخ سے تینوں مرد بیزار ہونے لگے تو اٹھ کر تازہ ہوا میں ٹیرس کی طرف نکل گئے۔

☆

''واہ دلہن تو بہت پیاری ہے اور یہاں کی سجاوٹ دیکھو کتنی شاندار ہے'' شہزین بارات کے

ساتھ بنکوئٹ ہال میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں خیراں رہ گئیں، سر گھما گھما کر ہال کا مکمل جائزہ لیا تو بے ساختہ منہ سے توصیفی کلمات نکل گئے۔

''مگر ہمارا بنکوئٹ زیادہ اچھا ہے'' نورین نے منہ چڑھا کر کہا۔ چاروں طرف نظریں گھمائیں ہال کے بیچ میں لگے جھاڑ فانوس سے جیسے روشنی کا سیلاب نکل رہا تھا، جس نے سب کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا، وائٹ اور ریڈ کامبینیشن سے در و دیوار کو رونق بخشی گئی تھی۔ جہاں ریڈ کارپٹ نہیں تھا وہاں زمین دوز ایکوریمز بنے ہوئے تھے، تقریب میں شریک بچے پانی میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ دلہا دلہن کا اسٹیج پھولوں اور اسپاٹ لائٹس کی روشنی میں بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ نکاح کے بعد انہیں ساتھ بٹھایا گیا۔

آئمہ ڈیپ ریڈ شرارے میں ملبوس تھی۔ بالوں کے ماؤنٹین پر سجا زرتار دوپٹہ جس کی ماتھا پٹی کو سلور بال سے سجایا گیا تھا، نفیس سا ماڈل میک اپ۔ وہ بڑی انوکھی اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔ گرے تھری پیس سوٹ میں ازل بھی بہت اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بیوی کی بلائیں لیے جا رہی تھیں۔ نورین نے بھائی کو کڑی نگاہوں سے گھورا۔ ازل بہن کو دیکھ کر ایک دم جھینپ گیا۔

یہ دیکھو سلمیٰ خالہ کہیں نئی بھاوج کو میرے خلاف نہ بھر دیں۔'' نورین کو خوف ہوا۔

''توبہ چپک ہی گئیں۔ میں خود ہی اوپر جا کر دیکھتی ہوں۔'' نورین اپنا گلابی شرارہ سنبھالتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ اس کا لباس دور سے ہی آؤٹ آف ڈیٹڈ نظر آ رہا تھا، مگر ضد میں پہنا۔

'''کیسی لگی چھوٹے کی دلہن۔ سچ جو دیکھ رہا ہے تعریف کر رہا ہے۔ سب کہہ رہے ہیں چاند سورج کی جوڑی ہے'' نورین نے اسٹیج پر چڑھ کر خالہ کے سامنے شیخی ماری۔

''ماشاءاللہ۔ دونوں ساتھ ساتھ بہت ہی اچھے لگ رہے ہیں''، سلمیٰ خالہ نے بردباری سے جواب دیا اور نوید کا لفافہ نورین کے ہاتھ پر رکھا۔

''دلہن کی اماں دکھائی نہیں دے رہیں؟'' سلمیٰ نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر دیکھا اور سوال کیا، آئمہ کا چہرہ اتر گیا۔

''ان کا انتقال ہو چکا ہے'' ازل نے بیوی کا ہاتھ تھام کر آرام سے جھوٹ بولا۔ آئمہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

......☆......

''آئمہ ایک بات پوچھوں۔ تم نے کبھی اپنی امی کے بارے میں بات نہیں کی'' رات کو ازل نے اس کے برابر میں دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ......اصل میں'' وہ تھوڑا گھبرائی۔

''اب ہم دونوں ایک ہیں۔ الگ الگ نہیں۔ دکھ اور سکھ بھی جدا نہیں بے دھڑک ہو کر دل کا بوجھ ہلکا کرو'' ازل کی دلاسا دیتی مسکراہٹ پر وہ شروع ہو گئی۔ یہ باتیں اس نے بھی صرف سنی ہوئی تھیں۔

ازل اُس کی تمام باتیں سن کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے بازوؤں کی گرفت آئمہ پر اور تنگ کر دی۔ آئمہ! آج سے تم اِن سب باتوں کو بھول جاؤ۔ محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ والدین سے محبت فطری بات ہے۔ دعا کرو ہم اپنی اولاد کو ایک بہترین مستقبل دیں۔''

آئمہ کو لگا اُس کی زندگی نے ایک حبس کے بعد، محبت کی تازگی کو سانسوں میں اتار لیا ہو۔ اُسے لگا ازل نے اس کے گرد محبت بھرے بازو حمائل ہی نہیں کیے بلکہ ایک نئی زندگی کو بھی دونوں نے اپنے حصار میں قید کر لیا ہو۔

......☆......

لمحوں نے خطا کی تھی

''مگر میں تمہیں اپنی فیملی سے ملوانا چاہتی ہوں۔'' اریز کا حلق یک دم ایسے کڑوا ہو گیا جیسے اُس نے کونین کی ڈھیر ساری گولیاں ایک ساتھ چبالی ہوں۔ ''اریز میں چاہتی ہوں کہ تم میرے گھر والوں سے مل لو۔'' فروا نے اپنی بات دہرائی۔ اُسے لگا شاید اریز نے سُنا نہیں۔ ''مگر کیوں، کس لیے۔''

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا **تیسری کڑی**

''دھیان سے کچھ کھا لینا۔''

''جی ضرور۔'' فروا کہتی ہوئی باہر نکلی اپنے پرس میں سے چھوٹا شیشہ نکال کر لبوں پر لپ اسٹک لگائی، ہونٹوں کو پھیلا کر آئینے میں دیکھا پھر دوبارہ لپ اسٹک اور شیشہ پرس میں ڈال کر باہر نکلی۔

گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر اُسے رکشہ مل گیا۔ اگلے ہی لمحے رکشے اندھا دھند اریز کے گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ماڈل ٹاؤن B میں رکشہ رُکا۔ فروا کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اُس نے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر رکشے والے کو تھمایا۔ رکشے والے کے پاس بقایا دینے کے لیے نہیں تھا۔ اُس نے اپنی مجبوری بتائی۔ فروا نے سارے رکھنے کا عندیہ دیا تو چند ثانیے رکشے والا ٹکر ٹکر اُسے دیکھتا رہا۔ اس قدر مہنگائی میں اتنا دیالو ہونا۔ اُسے اس لڑکی کی دماغی حالت پر شبہ ہوا مگر پھر کندھے اُچکاتا دانت نکوستا رکشہ لے بھاگا۔

فروا شاندار بنگلوز کی لائن میں کھڑی نمبر پلیٹ پر نگاہیں گھما رہی تھی پھر 'ابرار چوہدری' پر اُس کی نظریں تھم گئیں۔ اُس کی نظریں گیٹ سے شروع ہو کر اوپر اُٹھی تھیں۔ اتنی بلند و بانگ، آسمان کو چھوتی عمارت، فروا کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا، سر گھوما، نظر جھک کر پیروں سے جا لگی۔

اُس نے اسٹائلش سی انڈے کی شکل کی بیل کو ہلکا سا دبایا، مدھری گنگناہٹ گھر کے اندر کسی رسیلے سُر کی طرح بکھری تھی۔ فروا کا دل عجیب بے کل سا ہو کر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

''واؤ زبردست، ویلکم مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' تبھی اریز دروازے میں سے نکلا تھا۔

''یقین کیوں نہیں آ رہا۔'' فروا نے جذبے لٹاتی نگاہیں اریز کے دل آویز چہرے پر ٹکا دیں۔

''بس یار خواب سا لگ رہا ہے سب۔ آؤ اندر آؤ۔'' اس نے لپک کر فروا کی کلائی تھامی۔

''یہ خواب نہیں مسٹر، زندہ حقیقت ہے کہ میں تمہارے گھر آئی ہوں۔'' اُس کا دل اب بھی بے ہنگم انداز میں دھڑک کر بے حال ہو رہا تھا مگر بظاہر وہ خود کو با اعتماد شو کر رہی تھی۔

''ہاں یہ حقیقت ہے مگر کاش مجھے یقین آجائے۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اک ادائے خاص سے ذرا سا جھک کر بولا تو فروا ہنسنے لگی۔

گھر بہت عالیشان تھا فروا نے دل ہی دل میں سراہا مگر گھر میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ کسی اور کا وجود اتنے بڑے گھر میں دکھائی نہیں دے رہا تھا یہ خیال اُسے چھو کر بھی گزرا نہیں تھا۔ بس اس بھید بھری خاموشی میں سرخ روش پر فروا کی ہائی ہیل کی ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ذرا کی ذرا نظریں اُٹھا کر دیکھتی، یہ عمارت کیسی تمکنت سے سر اٹھا کر کھڑی تھی۔ کیا شاہانہ اسٹائل تھا۔ اریز اپنی سنگت میں اُس کا ہاتھ تھامے سیدھا اپنے بیڈروم میں ہی لے آیا تھا۔ فروا ذرا سی جز بز ہوئی۔ کسی اجنبی جوان لڑکے کے کمرے میں آنے کا اُس کا پہلا اتفاق تھا۔

''میرے بدن میں ایک چٹکی تو کاٹو فروا رحمان تاکہ مجھے آجائے کہ تم نے سچ مچ میرے غریب خانے کو رونق بخشی ہے۔'' اریز کی نیم وا آنکھوں میں شرارت بھرا تبسم تھا۔

''کاٹو نا......'' وہ بضد تھا۔ فروا نے تنک کر اریز کے بازو میں زور کی چٹکی نہیں، چٹکا کاٹا۔ اب اُس نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ چٹکی والی جگہ کو مسلسل مسل رہا تھا۔

''آیا یقین۔'' فروا شرارتی مسکان لبوں پر سجا کر استہزائیہ لہجے میں بولی تو وہ پیار بھری خفگی سے اُسے گھورتا، فروا کی ناک کھینچ کر کمرے سے نکل گیا۔ فروا اُس کی بے تکلفی پر غور کرنے لگی، کیسے لمحوں میں بے تکلف ہو گیا تھا۔

اریز کا بیڈروم خصوصی توجہ مانگتا تھا اور فروا اریز کے باہر نکلتے ہی پورے انہماک و دلچسپی سے بیڈروم کا جائزہ لینے لگی، بیڈ کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ قیمتی فرنیچر، مخملیں صوفے، دبیز ریشمی پردے خوبصورت اور پُرآسائش کمرہ، خواب ناک ماحول، بیڈروم کی ہر چیز توجہ کھینچ رہی تھی۔ فروا مسحور و مبہوت سی دیکھے جا رہی تھی۔ کمرے کی فضا میں کسی غیر ملکی ایئر فریشنر کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دلفریب سی خوشبو فروا کے حواسوں پر چھاتی جا رہی تھی۔

''کیا میں مرعوب ہو رہی ہوں۔'' فروا نے خود سے سوال کیا۔ اُس کے بیڈروم میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں تھی مگر یہ سچ تھا کہ اریز چوہدری کے بیڈروم کی ہر چیز سے امارت ٹپکتی تھی۔ ہر چیز اپنی قیمت خود بتا کر اپنی مانگ میں اضافہ کر رہی تھی۔

تبھی اریز ہاتھ سے ٹرالی دھکیلتا اندر آیا، ہلکے سے کھٹکے پر فروا چونکی۔

''ارے میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں جو تم نے اتنا انتظام کر لیا۔'' فروا نے کوکس کے ساتھ طرح طرح کے بسکٹس، نمکو، مٹھائی اور پزے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو ہلکا پھلکا سا ابتدائیہ ہے جانِ من، تم مت بھولو کہ ہمیں لنچ اکٹھے کرنا ہے۔'' وہ اک ادائے دلبری سے بولا تو فروا نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اگر تم آج بھی نہیں آتیں تو میں نے پھر تم سے روٹھ جانا تھا۔'' اریز نے بوتل میں اِسٹرا ڈال کر فروا کو بوتل تھمائی اور پھر اپنی بوتل کھولنے لگا۔

''میں منا لیتی۔'' فروا ناز بھرے انداز میں اِترا کر بولی۔

''منانے سے بھی نہیں ماننا تھا میں نے۔'' اریز نے کہا تو فروا نے اُسے گھورا۔

''اچھا جی۔''

''ہاں جی۔'' اریز نے اُسی کے اسٹائل میں کہا۔

''پھر میں تمہیں چھوڑ دیتی کھڑوس، پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔''

''پھر میں ہجر کے الاؤ میں دہک دہک کر انگارہ

بن کر بھسم ہو کر ختم ہو جاتا۔'' اریز کی بات پر فروا کی آنکھیں پانیوں سے دھندلا کر ڈبڈبانے لگیں۔

''کیا ہوا جان۔'' اریز نے فروا کو کندھوں سے پکڑ کر سینے سے لگالیا اور دونوں باہم پیوست ہو گئے تھا۔

کچھ لمحے یونہی بے خودی کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیتتے چلتے چلے گئے۔ پُر جوش اور مگن، پھر فروا چونک کر الگ ہوئی تھی۔ مگر اریز کے بازوؤں کے حصار میں جکڑی ہوئی تھی۔ اتنی آسانی سے علیحدہ کیسے ہوتی۔ بس یہ تھا کہ وہ خفت زدہ سی نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اریز کی پُر شوق نظریں اُس کے چہرے سے نیچے یہاں وہاں بھٹک رہی تھیں۔ اُس کی گرم سانسیں فروا کے بدن کو جھلسا رہی تھیں۔

''پلیز پلیز......'' فروا کا لہجہ ملتجی ہوا۔ پلکوں کی تتلیاں اُس کے عارضوں پر لرز رہی تھیں اور دل کی دھڑکنوں نے جیسے دوڑ لگا رکھی تھی اور اریز اُس کی سراسیمہ کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''پلیز چھوڑو اریز......'' اب کی بار اُس نے قدرے برہمی سے کہا، اریز کی بانہوں کا حلقہ ڈھیلا پڑ گیا۔

میرے لیے تو زمین پر بس اک ذات ہے تُو
اسی لیے تو میری پوری کائنات ہے تُو

''یہ شعر میرے جذبات کا ترجمان ہے فروا۔'' وہ والہانہ پن سے بولا۔ فروا اتنا شیریں لب و لہجہ سن کر کچھ نرم پڑ گئی۔ اندر کہیں دور شرمندگی نے سر اٹھایا تھا مگر اریز چوہدری کی محبت سے بوجھل اقرار نے شرمندگی کا سر کچل ڈالا۔

''فروا میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔'' اریز اک جذب سے آنکھیں موند کر بولا۔ یہ بھی اک ادا ٹھہری۔ فروا کا دل پگھلنے لگا۔ برہمی ہوا میں تحلیل ہونے لگی۔

''یہ خوبصورت پل، یہ تنہائی، نزدیکی کاش لمحے امر ہو جائیں۔ وقت تھم جائے۔ کبھی نہ گزرنے پائے۔ محبت کی شمع فروزاں رہے۔'' اریز نے وارفتگی سے فروا کو تکتے ہوئے دعا کی۔ ''کاش ہماری محبت، ملن بن کر ہمیشہ سلامت رہے۔'' اریز نے پھر کہا۔

''محبت پیاسی ہوتی ہے فروا اور اسے ہر وقت دیدار کی خواہاں رہتی ہے۔''

فروا بس اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑے جا رہی تھی۔ اُس کے کنوارے بدن نے آج محبوب کے لمس کا ذائقہ چکھا تھا۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ اُس سے کچھ بولنا تو درکنار، نظریں بھی نہیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ اُس کا تن بدن دھیمی سی آنچ میں سلگ رہا تھا۔ اُس کا اس سے وہی حال تھا کہ عشق مہنگا پڑے۔ پھر بھی سودا کرے۔ سود و زیاں سے بالاتر سودا۔

''مجھے جانا چاہیے۔'' فروا نے کہا۔ نجانے کیوں اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ فوراً یہاں سے چلی جائے۔ دل باغی ہو کر بغاوتوں پر اُکسا رہا تھا۔ دل اریز کے سینے میں گم ہو جانے کے لیے مچل رہا تھا۔ مگر وہ خسارے چاہ کر بھی نہیں خرید سکتی تھی۔

''میم آپ بھول رہی ہو کہ میں نے آپ کو لنچ پر انوائٹ کیا ہے۔'' اریز نے جتلایا۔ اُس کی نگاہیں مسلسل فروا کے سراپے میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

''پھر کبھی سہی، ابھی مجھے گھر جانا ہے۔'' اریز نے اُس کے گال کو اپنی اُنگلی کی پور سے چھوا اور پھر شہادت کی اُنگلی گال سے گردن پر رینگنے لگی فروا بدک کر پیچھے ہٹی۔

''کیا کرتے ہو اریز، ڈونٹ ٹچ می۔'' فروا محبت کے اسرار و رموز سے نابلد سہی مگر اتنا ضرور جانتی تھی کہ اریز کا بار بار فروا کے قریب آنا اُن دونوں کے لیے قطعی ٹھیک نہیں ہے۔

''کیا ہو گیا ہے فروا، اتنی برہمی کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہو، دقیانوسی لڑکیوں کی طرح۔''

دن کے اس پہر میں جادو تھا۔ وہ اس سے فروا کی ہمراہی کا طلب گار تھا تو وہ کیوں اتنی اجنبیت اور روکھے پن کا مظاہرہ کر رہی تھی، کیوں گریز پائی برت رہی تھی۔ اگر محبت کرتی تھی تو پھر ہاتھ کیوں کھینچ رہی تھی۔

''کیا وہ حقیقتاً محبت تھی جس سے وہ ہاتھ کھینچ رہی تھی۔ یا کوئی ایسی کشش جس کے بہاؤ میں بہہ کر لڑکیاں اپنا گوہرِ آبدار گنوا بیٹھتی تھیں اور خطا کار بھی وہی ٹھہرتی ہیں، مرد سدا کا پارسا۔''

''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔'' اریز تحیر و تاسف میں گھرا سوال کرنے لگا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے۔'' فروا ٹنک کر بولی۔

''اس وقت صرف یہ لگ رہا ہے کہ محبت کے راستے کا میں اکیلا مسافر ہوں۔'' وہ نروٹھے پن سے بولا۔

''اریز اس وقت ہم دونوں جذباتی کشمکش کا شکار ہیں۔ تم مجھے بار بار اپنے قریب مت کرو، میں تمہاری قربت کے طلسم میں قید ہو کر کمزور نہیں پڑنا چاہتی۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔'' فروا رونے والی ہو رہی تھی۔

''تم مجھ سے ڈر رہی ہو کیا۔'' وہ مسکرایا اور پھر ملائمت سے فروا کا گال چھوا۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔ خوفزدہ ہو، مجھ پر بھروسہ نہیں نا، تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے دوں گا۔'' مدھم لہجے میں کی گئی بات میں اثر ہونا چاہیے تھا، دل جیت لینے والا انداز تھا۔ وہ بس چپ چاپ دیکھے گئی۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

''تمہاری جان اور عزت کی حفاظت کرنا میرے فرائض میں شامل ہے پگلی! کیونکہ تم میری جان ہی نہیں عزت بھی ہو، تمہیں محفوظ رکھنا، تمہاری حفاظت کرنا میری ذمے داری ہے۔'' اریز کا انداز بہت تحفظ دلانے والا تھا، بہت مختلف اپنائیت بھرا، فروا کو اچھا لگا خوف کا اثر زائل ہونے لگا۔

''بہت افسوس کی بات ہے کہ تمہیں لگتا ہے کہ میں نقب زنی کروں گا اور وہ بھی اپنے ہی گھر میں...... تم میری ہو اور اپنوں کی حفاظت کی جاتی ہے ڈفر، اُن کو لوٹا نہیں جاتا۔'' فروا نے دیکھا وہ مسلسل فروا کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ اُسے سطر سطر پڑھ رہا تھا۔

''سوری اریز......'' اب اریز کی اتنی لمبی چوڑی وضاحتیں پا کر وہ شرمندہ ہو رہی تھیں۔

''تم پر میرا اور مجھ پر تمہارا مکمل حق اور اختیار ہے، مگر اپنے دل سے تمام خوف وسوسے اُکھاڑ پھینکو۔ میں نفس کا اتنا برا نہیں ہوں اور نہ ہی میرا کریکٹر لوز ہے۔'' اریز نے خفگی بھری نگاہ کی۔

''اچھا معاف کر دو۔'' فروا نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اچھا یہ بتاؤ گھر میں اتنا سناٹا کیوں ہے، باقی لوگ کہاں ہیں۔'' جو بات اُس احمق لڑکی کو سب سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی۔ وہ اب پوچھ رہی تھی۔ اُسے ایسا کوئی خیال آیا ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں اتنے بڑے گھر میں اکیلے ہیں۔

''ڈیڈی سنگاپور میں ہوتے ہیں وہاں اُن کا بزنس ہے، ایک بہن اور بھائی لندن پڑھنے گئے ہوئے ہیں۔ اور ممی آج کراچی گئی ہوئی ہیں ماموں کے پاس۔''

''اوہ اچھا......''

''پھر بے اعتباری......'' اریز نے محبت پاش نظروں سے گھورا۔

''ارے نہیں نہیں۔ اچھا یار کھانا کھلاؤ تاکہ میں جانے والی بنوں، پانچ بجے سے پہلے میں پارلر سے گھر پہنچ جاتی ہوں۔''

''ابھی تو صرف تین بجے ہیں یار، اور تم یہ کیا مڈل کلاس لڑکیوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو، آج کل کون اپنی اولاد سے پوچھتا ہے۔ کہاں گئے کیوں

گئے کب آئے کب گئے۔“

”ہم لوگ اتنے بھی آزاد خیال نہیں ہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ ٹھیک ہے بابا نے کبھی ہم پر بے جا پابندیاں نہیں عائد کر رکھیں مگر شتر بے مہار بھی نہیں چھوڑ رکھا مسٹر۔“ اریز نے ہوم ڈلیوری کے لیے شہر کے مشہور ہوٹل فون کیا۔ دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ وہ اپنی گاڑی میں فروا کو بٹھا کر پارلر کے سامنے چھوڑنے آیا۔

”سنو میں ہر بات برداشت کرسکتا ہے مگر تمہاری بے اعتنائی اور بے اعتباری نہیں، دھیان رکھنا۔“ اریز کی بات پر فروا نے اثبات میں سر ہلایا اور بائے کہہ کر چلی گئی۔

☆......☆......☆

اخبار میں چھپی صبا زمان کی تصویر نے رحمان اور عائشہ کو کیسی جلن کڑھن میں مبتلا کیا تھا۔ یہ کوئی بتانے والی بات تو تھی نہیں۔ دونوں میاں بیوی کے اندر تک سناٹوں کے ساتھ کوئی اور چیز بھی بے حد برق رفتاری سے پھیلی تھی، دکھ، حسد، شاک...... ہاں احتشام اور عروہ کو اندر سے بہت خوشی ہوئی تھی کہ اُن کی کزن ہے وہ لڑکی جس کی پورے شہر میں واہ واہ ہورہی تھی اور ریان ابھی ایسی چیزوں سے واقف نہیں تھا اور فروا کی تو آج کل پوری توجہ اریز چوہدری نے سمیٹ رکھی تھی۔ اُس کے اطراف میں کیا ہورہا ہے؟ کون خوش ہے؟ کون آزردہ؟ فروا رحمان کو کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی بہن یا بیٹی تو کبھی بھی نہیں تھی مگر آج کل تو عجیب خود فراموشی کا عالم تھا۔

آج فرقان کی فیملی رحمان کے گھر مدعو تھی۔ یہ کھانا تو بقول رحمان فرقان کے مل بیٹھنے کا بہانہ تھا، گپ شپ لگائی جاتی، بچے بھی آپس میں وقت گزار لیتے۔ مگر آج صبا زمان کا موضوع نا چاہتے بھی اِن دو گھروں کے مکینوں کی نوکِ زباں پر ٹھہرا رہا۔

”کیا پتا یہ وہ والی صبا زمان نہ ہو، کوئی اور ہو۔“ فرقان نے کہا تو عائشہ اور رحمان کا دل بیک وقت دھڑکا اور شدت سے یہ خواہش دل میں اُبھری۔

’کاش یہ کوئی اور صبا ہو‘ مگر ضروری تو نہیں کہ انسان جو خواہش کرے وہ پوری بھی ہو اور ہر بار ہو۔ لبنٰی حقیقت سے آگاہ تھی مگر اُسے تصدیق کے لیے تائید کرنا مہنگا پڑ سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے مگر دل ...... سرتاپا بھرتا جارہا تھا طمانیت سے احساسِ تفاخر سے۔

”یہ وہی والی صبا ہے، دیکھ رکھا ہے میں نے اِس کلموہی کو۔“ عائشہ نے حقارت سے کہا۔ رحمان کو سانپ سونگھ گیا اور وہ غصے سے دانت پیسنے لگا اور پھر اپنی پاکٹ سے سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا مگر کال آگے سے اٹھائی نہیں گئی تھی۔

”سویا مرا پڑا ہوگا اندھا کہیں کا......“ رحمان نے نخوت و تنفر سے دوبارہ نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ فرقان نے بے ساختہ بچوں سے نظریں چرائی تھیں اپنے بڑے بھائی کے لیے رحمان کے ایسے الفاظ فرقان کو پسند نہیں آئے تھے۔ لبنٰی نے بھی بے ساختہ اپنا ہاتھ لبوں پر رکھا تھا۔ رحمان گھمنڈی تھا مگر فاخرہ سے نفرت کرتا تھا۔

”سلام بھائی۔“ کال ملنے پر رحمان نے لٹھ مار انداز میں کہا۔ آگے سے زمان کیا بولا۔ پتا نہیں تھا۔

”ایک بات پوچھنی ہے۔ یہ جو صبا زمان لڑکی ہے، جس نے بورڈ میں پوزیشن لی ہے......“ مگر نجانے آگے سے ایسا کیا کہا گیا تھا کہ رحمان نے کال کاٹ دی اب وہ اضطرابی انداز میں اپنی پیشانی مسل رہا تھا سب کی نظریں رحمان پر تھیں۔

”رحمان کیا ہوا۔“ بالآخر فرقان نے ہی خاموشی کے دورانیے کو کم کیا۔

”خوشی سے پاگل ہوگیا ہے۔ مجھے مبارکباد دے رہا تھا وہ اندھا۔“ وہ نفرت میں اس قدر ڈوب

چکا تھا کہ سب تمیز وتہذیب بھول چکا تھا۔ اس سمے رحمان کا دل آگ میں جل رہا تھا۔

''ارے واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' فرقان نے متبسم لہجے میں کہا، جہاں لبنیٰ نے تحیر بھری مسرت سے فرقان کو دیکھا وہیں رحمان نے انتہائی اشتعال سے قہر وغضب سے دھکتی نگاہ اُس پر ڈالی۔

''کیا اچھی بات ہے۔'' رحمان تڑپ کر بولا۔ اِس سمے وہ کسی اَن دیکھی تپش میں سلگ رہا تھا۔ نفرت کرنا دنیا کا سب سے مشکل ترین کام ہے اور رحمان کتنے سالوں سے پوری دلجمعی کے ساتھ یہ مشکل اور کٹھن کام کر رہا تھا اور کیے جا رہا تھا۔ تھک ہی نہیں رہا تھا۔

''یار وہ ہماری بھتیجی ہے۔ ہمارے بھائی کی بیٹی ہے۔ ہمارے خاندان کا حصہ ہے جس سے انکار کسی طور ممکن نہیں ہے۔'' یہ فرقان تھا جو صرف فاخرہ کو تو ضرور برا سمجھتا تھا اور رحمان کا ہم نوا اور ہم خیال بن جاتا تھا۔ مگر صرف فاخرہ کے لیے۔

''مت بھولو کہ وہ فاخرہ کی بیٹی ہے جس کا ہماری بھابی ہونا ہمارے لیے ہمیشہ تذلیل کا باعث بنا ہے۔ کیسے کیسے شرمندہ نہیں ہوئے ہم۔'' وہ نجانے کیا جتلانا چاہ رہا تھا۔

''یار رحمان ماضی کی راکھ کریدنے سے بھلا کیا حاصل ہوگا۔ اُلٹا ہاتھ کی پوریں ہی جھلس جاتی ہیں۔ مجھے تو بہر حال بہت خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے خاندان میں کوئی بچی اتنی قابل نکلی ہے۔ فاخرہ ہمارے خاندان کی پہلی لڑکی تھی، جس نے ہمیشہ بورڈ میں پوزیشن لی۔ اسکالرشپ لینے کا اعزاز بھی اُسے ہی حاصل ہے۔'' فرقان روانی میں کہتا ہی چلا گیا۔

''ہاں ہاں ایسی نوکھی اور جان لیوا 'حرکتیں' کرنے والی بھی تو فاخرہ ہی خاندان کی پہلی لڑکی تھی۔'' عائشہ نے زہر میں بجھا ہوا ایسا طنز کیا جس میں تنفر کی آمیزش بھی شامل تھی۔ فاخرہ کی کوئی تعریف کرے وہ کہاں برداشت کر سکتی تھی۔

''تم کچھ بھی کہو فرقان مگر مجھے بے حد دکھ ہوا ہے کہ میرا بیٹا مڈل اسٹینڈرڈز میں بری طرح ناکام ہوگیا اور اُس حرافہ کی بیٹی......'' اصل بات ہونٹوں پر آ ہی گئی تھی اور رحمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فاخرہ اور اُس کی بیٹی کا منہ نوچ لے، یا اُن کو صفحہ ہستی سے مٹا کر زمین کا رزق بنا ڈالے۔ فرقان نے مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ لبنیٰ نے آنکھ کے اشارے سے اُسے روک دیا کیونکہ رحمان سے اس وقت کوئی بھی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔

رحمان اذیت و بے کسی کے عالم میں ڈائننگ روم سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں چکر کاٹنے لگا۔ اُس کی زبان زہر اُگلتی رہی، سب سنتے رہے۔ کبھی کبھی عائشہ بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگتی۔

جب ماں باپ اپنے خون کے رشتوں کے لیے ایسے جذبات رکھتے ہوں اور اُن کا بے لاگ اور بے دھڑک اظہار بھی کرتے ہوں۔ اپنے بڑوں کی عزت نہ کریں۔ چھوٹوں پر رحم نہ کریں۔ کسی بہت اپنے کے کردار کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں اور انتہائی بے حسی اور خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے بھائی کو 'اندھا' کہیں، بے دریغ کسی کی ذات پر کیچڑ اُچھالیں۔ صرف اپنی ذات کی تسکین کے لیے، ایسے بات کریں جیسے خود بہت برگزیدہ اور نیکو کار ہوں، ذرا سوچیے وہاں بچوں کی کیسی تربیت ہوگی؟ وہ کہاں انسانیت سے محبت کرنا سیکھیں گے، جب بے حسی و خود غرضی ہی ورثے میں ملی ہو۔

مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ رحمان اور عائشہ کے اندر پلتی کدورت اور کینہ وبغض اُن کی اولاد کے اندر سرایت نہیں کر پایا تھا۔ دونوں گھروں کے بچے تایا زمان، فاخرہ اور اُن کے بچوں سے ملنے کا شوق دل میں رکھتے تھے، بھلے دبا دبا ہی سہی۔

☆......☆......☆

"بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے لبنیٰ، پے در پے صدمات نے جیسے اَدھ مؤا بھی تو کر ڈالا ہے۔ مانو بھوک پیاس ہی مٹ گئی۔" عائشہ شاید ابھی ابھی سو کر اُٹھی تھی اور لبنیٰ کے گھر کا رُخ کیا تھا۔

"آپ کیا کھائیں گی۔" لبنیٰ نے عائشہ کے اُجڑے بکھرے حلیے سے نظریں ہٹائیں۔

"تم چائے بناؤ، میں فریج میں بریڈ وغیرہ دیکھتی ہوں۔" عائشہ نے فریج کھولا، بریڈ کا پیکٹ رکھا تھا۔ وہ بریڈ کا پیکٹ اور دو انڈے ہاتھ میں پکڑے لبنیٰ کے قریب آئی۔ لبنیٰ اکثر عائشہ بھابی کی دیدہ دلیری پر ششدر رہ جاتی تھی۔ اُن کو عادت تھی خوامخواہ کی اجارہ داری قائم کرنے کی۔ گھر بھلے کسی کا بھی ہو۔ یوں کسی کے گھر آ کر دندناتے پھرنا یا اپنی من مانیاں کرنا کم از کم لبنیٰ کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ رکھ رکھاؤ والی خاتون تھی۔ گھر سے کم کم نکلتی تھی۔ بلا ضرورت کسی کے حتیٰ کے عائشہ کے گھر بھی نہیں جاتی تھی۔

"ہا...... ہائے تمہارے برتن ابھی تک دھونے والے پڑے ہیں۔" عائشہ بھی لبنیٰ کے پیچھے ہی کچن میں آن گھسی تھی اور سنک میں دھرے برتن دیکھ کر یوں ناک بھوں چڑھانے لگی جیسے خود سارا گھر سمیٹ سماٹ کر آئی ہو۔

"بھابی آپ کمرے میں جا کر بیٹھیں میں آتی ہوں لے کر۔" لبنیٰ بدزبان نہیں تھی، لحاظ مروت بھی بہت تھا اسی لیے غصے کو ضبط کر کے نہایت شائستگی سے کہا۔

"ارے اسی لیے تو کہتی ہوں کہ کوئی کام والی رکھ لو، اب اتنا سا تو تم افورڈ کر ہی سکتی ہو۔" عائشہ نے شاید اپنے تئیں جتلایا تھا کہ تمہاری مالی حیثیت مجھ سے کم سہی مگر پھر بھی اتنی تو ہے کہ برتن دھونے والی رکھ سکو۔

"بھابی یہ برتن ابھی ابھی گندے ہوئے ہیں کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بچے ناشتا کر کے فارغ ہوئے ہیں میں دھونے لگی تھی کہ آپ آ گئیں۔ اس لیے وہیں چھوڑ دیے۔" لبنیٰ نے نا چاہتے ہوئے بھی وضاحت دے ڈالی۔ عائشہ پورے محلے کی ذاتیات میں دخل در معقولات اپنا اولین فریضہ سمجھتی تھی۔ زبردستی دوسروں کے اعصاب پر بھاری سل کی مانند مسلط رہتی تھی۔ محلے والیاں اگر سامنے لحاظ بھی کر جاتی تھیں تو پھر پیٹھ پیچھے عائشہ کی ٹوہ میں رہنے کی عادت پر اختلاف کرتی تھیں اور دوسروں کے معاملات میں زبردستی گھسنے والی عادت سے بھی خائف ہی نہیں بیزار بھی تھیں۔

"لبنیٰ میرا تو دم گھٹ رہا ہے، مجھے کمرے میں ہی چلنا چاہیے۔" عائشہ نے کچن سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ تو مارے ضبط کے لبنیٰ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ عائشہ بھابی کی بلاوجہ کی تنقید پر کلس کر رہ گئی مگر وہ عائشہ بھابی کی حاکمانہ طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ عائشہ جیسے نافہم لوگ انتہائی بے دید اور ناقص العقل ہوتے ہیں جو تیرے میرے گھر کی خبر تو رکھتے ہیں۔ مگر اپنے گھر کی دیکھ بھال بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینا بھول جاتے ہیں۔ لبنیٰ بس چپ سادھ لیتی تھی دو بدو جواب دینا اُسے بھی آتا تھا مگر کسی ممکنہ بدمزگی کے خوف کے زیر اثر وہ رواداری اور بڑے پن کا مظاہرہ کرتی اور اپنی ناگواری کمالِ مہارت سے چھپا جاتی۔

"یہ لیں بھابی......" لبنیٰ ذرا سی دیر بعد ٹرے میں چائے بریڈ اور ہاف بوائل انڈے لیے حاضر تھی۔

"بہت شکریہ۔"

"ارے بھابی آپ کا اپنا گھر ہے۔" لبنیٰ خوش دلی سے اخلاق کا دامن پکڑے ہوئے کہنے لگی۔ لبنیٰ اُن کے پاس بیٹھ کر کریلے چھیلنے لگی۔ عائشہ بھابی اِدھر اُدھر کی لایعنی باتیں کیے جا رہی تھیں۔ لبنیٰ بے

دلی اور بے توجہی سے سنتی رہی بے تکی بے سروپا گفتگو، منفی سوچ بے مقصد باتیں، لبنیٰ ہوں ہاں کرتی رہی۔ ہاں اتنا وہ جانتی تھی کہ وقت اب جلدی نہیں گزرنے والا۔ عائشہ اب صبا کا ذکر لے بیٹھی تھی۔ فاخرہ کی برائیاں، صبا کی اُٹھتی جوانی کے بارے ناگوار جملے لبنیٰ کو بہت بھاری اور گراں گزر رہے تھے عائشہ کا دھواں دھواں چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ صبا کی شاندار کامیابی نے کیسے اُس کے دل کو جلا کر خاکستر کر ڈالا تھا۔ کیسے بھوک اُڑا کر رکھ دی تھی۔

''بھابی اب آپ لوگوں نے احتشام کا کیا سوچا ہے۔'' لبنیٰ نے سمجھداری سے موضوع بدل دیا تھا۔

''بس کرنا کیا ہے۔ دوبارہ امتحان دے گا، اب کے اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سخت محنت کرے گا۔ رحمان سے اُس نے معافی بھی مانگ لی ہے۔''

''ہاں بس اللہ ہمارے بچوں کو محنت بلکہ سخت محنت کرنے کی توفیق دے۔''

''ہاں احتشام پڑھ لکھ جائے تو اچھی بات ورنہ تو اپنے باپ کا کام ہی سنبھالنا ہے نا، کون سا نوکری کرنی ہے اُس نے۔'' لبنیٰ عائشہ بھابی کا تعلیم کے بارے میں 'خیال' سُن کر دنگ رہ گئی یعنی کہ لاپروائی کی کوئی حد تھی بھلا۔ وہ اپنی اولاد کے مستقبل کی پلاننگ کیے بیٹھی تھیں۔

عائشہ بھابی نے کھاپی کہ برتن پرے کھسکائے اور نہایت پُراسرار انداز میں کھسک کر لبنیٰ کے بالکل پاس ہوئی انداز سرگوشیانہ اور قدرے رازدارانہ تھا۔

''الٰہی خیر......'' لبنیٰ نے کوفت سے عائشہ بھابی کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا۔

''پتا ہے کل کیا ہوا؟'' عائشہ نے اپنی گول گول آنکھیں شاطرانہ انداز میں گھمائیں۔

''نہیں تو......'' لبنیٰ نے بمشکل کہا۔ ایسی کون سی افتاد آن پڑی جو عائشہ بھابی کان میں گھس رہی تھیں۔

''سلمٰی کی بہو کل کہیں بھاگ گئی ہے اور جاتے ہوئے اپنے دو بچے بھی ساتھ لے گئی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے، آپ تو اپنے گھر کی پریشانی (احتشام کا فیل ہونا) میں تھیں۔ کس نے بتایا۔'' لبنیٰ کی ایک ایک کر کے تمام حسیات بیدار ہوئی تھیں کیونکہ وہ سلمٰی خالہ کی بہو جویریہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ کسی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اچھی ملنسار خاتون تھی۔

''مجھے بس سُن گن مل ہی جاتی ہے، جاؤں گی میں سلمٰی آپا کی طرف، اتنا بڑا صدمہ ہے اور کیسی بدنامی اور جگ ہنسائی ہوگی، دو بچوں کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔'' عائشہ بھابی نے قہقہہ لگایا۔ یہ کوئی ہنسنے، مضحکہ اُڑانے والی بات تھی کیا۔

''پلیز بھابی! کسی پر بہتان باندھنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ہر بات کا تاریک پہلو مت دیکھا کریں، بات کوئی اور بھی ہوسکتی ہے۔ جویریہ میری کلاس فیلو رہی ہے۔ میٹرک کے بعد ہم نے اکٹھے پی ٹی سی کی تھی اور پھر اکٹھے ہماری نوکریاں بھی لگی تھیں۔'' لبنیٰ کو بہت کچھ یاد آیا تھا۔

''ارے وہ تمہاری سہیلی نکلی تو بی بی اب تم بھی خاطر جمع رکھو، تم سے بھی تفتیش ہوسکتی ہے۔'' عائشہ نے بات کو قطعی دوسرا ہی رُخ دے ڈالا۔ لبنیٰ نے ایک شکوہ کناں نظر اُس پر ڈالی۔

''لو بھلا ایسے کیا دیکھ رہی ہو، سچ تو کہہ رہی ہوں۔ ویسے وہ گئی کہاں اُستانی صاحبہ۔'' دوسروں کی ذات کے بخیے اُدھیڑنے میں وہ ماہر تھیں۔ اب ایک نئی بات اُس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ کچھ دن تو اچھے گزر جاتے۔ لبنیٰ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ باتیں عائشہ کر رہی تھی ندامت و پشیمانی لبنیٰ کو ہو رہی تھی۔ خدا کا خوف لبنیٰ کے دل کو لرزا رہا تھا یوں کسی کی بے بنیاد بات پر اُنگلی اٹھانا نہایت قبیح عمل

ہے۔ خدا تو دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کا حکم دیتا ہے۔ جب ہم بغیر ثبوت کسی پر الزام تراشی کر سکتے ہیں تو اتنا ظرف کہاں کہ دوسروں کے گناہوں کو دلوں میں چھپا سکیں۔

''اچھا بھابی آپ بیٹھیں میں کھانا بنالوں۔'' لبنیٰ نے اپنے سامنے رکھی کریلوں، پیاز، ٹماٹر کی ٹوکریاں اُٹھائیں اور اُٹھ گئی۔

''میں بھی چلتی ہوں، شام کو سلمیٰ کے گھر کا چکر لگاؤں گی۔ ساری بات پتا لگا کر آؤں گی۔'' عائشہ جانے کے لیے اُٹھی تو لبنیٰ کا بھی روکنے کو دل نہیں چاہا۔ لبنیٰ تاسف اور آزردگی میں گھر کر اُسے جاتا دیکھتی رہی۔

لبنیٰ بہت اچھی طرح سے عائشہ کی فطرت کو جانتی تھی۔ دوسروں کی ٹوہ میں رہنا دوسروں کے گھروں میں جھانکنا کسی کی ذراسی کمزوری ہاتھ کیا آتی۔ اُس کے کردار میں وہ اتنے جھول اور خامیاں نکال لیتی کہ اُف توبہ۔

نجانے اُن کی شخصیت میں کیا اُدھورا پن تھا، کیا تشنگی تھی جو وہ ایسی نازیبا واخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کر کے اپنی ذات کی تکمیل کرتی تھی یا خود کو تسکین دینے کے لیے حربے آزماتی تھی۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی بدنیت بدفطرت۔ دو لوگ میاں بیوی بن کر ایک گھر میں کیسی زندگی گزار رہے تھے یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں جیسا رحمان ویسی عائشہ۔ جو اچھا سوچتا نہیں وہ اچھا کر بھی کیسے سکتا ہے۔ ایسے دلوں پر کٹھور پن اور سنگدلی کی مہریں لگی ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں پر اچھا برتاؤ، اعلیٰ رویہ بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔

اتنا سارا وقت بے کار گزر گیا۔ حاصل وصول کچھ بھی نہیں لبنیٰ کے دل پر ایک نادیدہ بوجھ آ گرا۔ کھانا بناتے ہوئے لبنیٰ کا ذہن مسلسل جویریہ اور اُس کے بچوں میں اٹکا رہا۔ وہ زیرلب خیریت کی دعائیں مانگتی رہی۔ اللہ تعالیٰ سے رحم کی اپیل کرتی رہی۔

☆......☆......☆

خالہ اماں کو اکثر ہی بخار رہنے لگا تھا۔ وہ زمان کے پاس لیٹی رہتی، فاخرہ بساط بھر اُس کا خیال رکھتی صبا اور فضا کو بھی اصرار کر کے اُن کی دادی کے پاس بھجواتی، وہ دونوں نا چاہتے ہوئے بھی اُن کے پاس چلی جاتی تھیں۔ اُن کو دباتی تھیں مگر باوجود کوشش کے بھی وہ اپنی دادی سے محبت جتا نہیں پاتی تھیں۔ بس اُن کی ہر بات کے جواب میں ہوں ہاں کرتی رہتی تھیں۔

''بیٹا اپنی دادی کے لیے دودھ والا دلیہ بنا دو، میں اُن کے کپڑے دھو دوں۔'' فاخرہ نے کہا۔

''آپ اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں مما، پروا نہ کریں، جیسے انہوں نے ساری زندگی آپ کی پروا نہیں کی۔ آپ کی ذات پر ستم کے ہنر آزمانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' صبا غصے سے منہ پھلا کر بولی۔

''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے، وہ جتنی بھی سفا کی اور ظلم کا مظاہرہ کرتی رہیں مگر وہ بزرگ ہیں، بڑی ہیں اور پھر بیمار بھی۔ اُن کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔'' فاخرہ نے اُسے سمجھایا۔

''مما آپ کے صبر کی کوئی حد بھی ہے بھلا، کسی کو مصلوب کر کے غمگین رکھنا مضمحل و آزردہ کرنا ظلم و بربریت کی انتہا کر دینا اور آپ ہیں کہ تھکتی نہیں درد سہہ سہہ کر۔'' صبا کا نمناک لہجہ فاخرہ کا کلیجہ شق کر گیا۔ اُس نے تھرا کر صبا کو دیکھا اور اُسے سینے سے لگا لیا۔

''طاقت رکھتے ہوئے بھی درگزر سے کام لینا ہی کسی انسان کو انسانیت کے درجے پر فائز کرتا ہے ورنہ تو اس وقت کسی کو یہ کہنا کہ ہم نے معاف کیا۔ جب ہم انتقام لینے کی استعداد و ہمت ہی نہیں رکھتے کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' فاخرہ بے اختیار سسکنے لگی۔

''ہم کسی کو سزا دینے پر قادر نہیں ہیں بیٹا۔ ایسی منفی باتیں دوبارہ بھی مت سوچنا، جو درگزر کرتا ہے وہی دلی سکون کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ نیکی اور خیر کا راستہ اپنانے والے ہی دنیا و آخرت میں سرخرو ہوتے ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ اپنا دل صاف کر کے اپنے بابا اور دادی کو وقت دو۔ اُن سے باتیں کرو۔ اُن کی خدمت کرو۔ ماں ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ میں تم لوگوں کو مثبت طرزِ زندگی گزارنے کا درس دوں۔''

فاخرہ نے رسانیت سے ایک ایک بات صبا کے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی جبکہ فاخرہ کا اپنا دل پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ صبا کے پیچھے فضا بھی آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''اللہ تعالیٰ ہر انسان کو جب آزمائش میں ڈالتا ہے نا بیٹا تب ہی ہماری اچھائی اور برائی کا پتا چلتا ہے۔ جو اللہ کی دی ہوئی آزمائش کو رحمت سمجھتا ہے۔ جھیل جاتا ہے، نبھا جاتا ہے، پھر بھی اُس کی زبان پر شکر کا کلمہ ہو وہی صابر ہے۔ خدا کی ذات پر کامل یقین رکھنے والا، کوئی بھی مرتبہ و مقام بغیر تکلیف یا درد کے کہاں ممکن ہوتا ہے۔ تم لوگ صلہ ہو، خدا تعالیٰ کی طرف سے، نیک صالح اولاد جو ماں باپ کا نام روشن کرتی ہے۔ اُس سے بڑھ کر کیا صلہ ہو سکتا ہے بھلا۔''

پُر رسان، دھیما، بے حد سبک پُر اثر اندازِ گفتگو، صبا نے عقیدت سے فاخرہ کے سینے سے سر اٹھا دیکھا۔ کتنا سحر انگیز چہرہ تھا اُن کی مما کا۔

وہ آج جان گئی تھی کہ ایسے جان لیوا حالات میں رہ کر بھی، اتنا کرب، اتنی صعوبتیں کاٹ کر بھی اگر اُن کا چہرہ اتنا تر و تازہ اور بارونق تھا، جیسے گزرتے ہوئے وقت نے فاخرہ کے دلنواز چہرے کو چھوا تک نہیں تھا۔ تو یہ فاخرہ کے من کا اُجلا پن تھا جو نور بن کر اُس کے نقوش کو مزید پُرکشش و جاذبِ نظر بنا گیا تھا۔

''مما آپ کا ظرف بہت بڑا ہے آپ عظیم ہیں۔ مجھے فخر ہے آپ پر۔'' صبا نے فاخرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیے۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔

''مما مجھے معاف کر دیں، مجھے اتنی چھوٹی اور گری ہوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بدلہ لینا، کسی کو سزا دینا بہت گھٹیا فعل ہیں اور مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔'' اُس کی آواز پھر سے آنسوؤں کی نمی سمیٹ لائی۔

فاخرہ زیرِ لب مسکرائی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کے دل بغاوت، سرکشی کی دہکتی دھرمی سے بھر کر اُن کو بھٹکا ڈالے اس لیے جب بھی صبا دادی کے حوالے سے یا زمان کے حوالے سے بپھر جاتی اور کسی تند خیز موج کی طرح سر پٹخ کر سوال کرتی۔ تب اُس کی وحشت چھلکاتی نظروں کو دیکھ کر فاخرہ کے حواس مختل ہو جاتے۔ اُس کے اپنے اندر خوف و ہراس پھیل جاتا۔ تب وہ دل پر بھاری پتھر کی سل رکھ کر اُن کو پیار سے سمجھاتی ورنہ اُس کا اپنا دل کیسے لہولہان تھا۔ اُس کو بتا کر دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی، ورنہ اُس کی اولاد سب سے بدگمان اور بے گانہ ہو جاتی اور فاخرہ ایسا کیسے چاہ سکتی تھی اُس نے خود سارے رشتے کھوئے تھے۔ وہ اپنوں کی بے رخی اور بے اعتنائی برداشت کرتے کرتے جیسے پتھر کی ہو چکی تھی۔ وہ اپنی اولاد کو رشتے دینا چاہتی تھی چھیننا نہیں۔

''ارے نہیں میری ننھی پری، معافی کیسی، جاؤ دادی کے لیے دلیہ بناؤ، اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے بندوں سے محبت کرو اور اللہ انسان کی اُمیدوں سے بڑھ کر صلہ اور جزا دینے والا ہے۔''

''جی مما میں بناتی ہوں۔'' صبا پلٹ گئی تو فاخرہ کپڑے دھونے لگی مگر اُس کے بے آواز آنسو مسلسل گرتے رہے۔

کہاں اتنا آسان ہوتا ہے ایسے لوگوں کو معاف کرنا جنہوں نے ساری زندگی آپ کو کانٹوں پر گھسیٹ کر زخم زخم کیا ہو۔ آپ کے اندر سے جینے کی اُمنگ ہی ختم کردی ہو۔ بھری دُنیا میں تماشا بنایا ہو۔ آپ کی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھ کر اپنی پسند کی 'سزا' تجویز کی ہو۔ زندگی کے ایک ایک پل کو جاں گسل عذاب میں مبتلا کر کے صدیوں پر لٹکایا ہو مگر وہ فاخرہ جبیں تھی۔ صابر شاکر اپنے سارے فیصلے اللہ کے ہاتھ میں دینے والی اور اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔

☆......☆......☆

صبا کا غصہ اور برہمی دوسرا رُخ اختیار کر چکی تھی۔ یہ سب فاخرہ کی باتوں کا اثر تھا۔ اب اُسے دادی بہت ہی قابلِ رحم لگ رہی تھیں۔ ترس اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہا تھا۔ رحم و ہمدردی دل میں جگہ بنا رہی تھی۔

''دلیہ کھا لیں۔'' صبا جب کمرے میں آئی تو وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ دادی کی نظریں کمرے کی چھت میں اُلجھی نجانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ چہرے پر اَن گنت سوچوں کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ''اُٹھیں میں آپ کو خود کھلاتی ہوں۔''

صبا نے محبت سے سہارا دے کر اُٹھایا اور خود اُن کے منہ میں چمچ سے دلیہ ڈالنے لگی۔ دادی کی نظروں میں آنسو جھلملائے تھے اور اُن کا جھریوں زدہ چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے لگا۔ صبا نے اپنے ہاتھ سے اُن کے آنسو صاف کیے پھر تھوڑا تھوڑا دلیہ اُن کے منہ میں ڈالتی رہی۔ دلیہ کھلایا، پانی پلایا پھر دادی کا چہرہ صاف کیا اور سہارا دے کر پھر لٹا دیا۔

''دادی آپ بیمار ہیں اس لیے رو رہی ہیں کیا؟'' صبا نے کہا تو وہ اور بھی شدت سے رونے لگیں۔

''آپ فکر مت کریں آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' صبا کی بات پر وہ بچوں کی طرح ہچکیاں بھرنے لگیں۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ ذہنی خلفشار اور اعصابی دباؤ کی بدولت وہ اس قدر نڈھال ہو کر اور بیمار پڑ گئی ہیں مگر اُن کے اندر بیماری کے خلاف لڑنے کی قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی۔

صبا نے دادی کو دوا کھلائی پھر دوبارہ اُن کو لٹا کر باہر آ گئی مگر تھوڑی دیر بعد بھی واپس لوٹ آئی۔

''بابا...... مما کہہ رہی ہیں ابھی نہائیں گے یا صبح۔'' وہ اب زمان سے پوچھ رہی تھی۔

''بیٹا پرسوں نہلایا تھا تمہاری مما نے، میرا خیال ہے صبح نہالوں گا۔'' پھر کچھ خیال آنے پر دوبارہ بولا۔ ''صبح تو تمہاری مما اسکول چلی جائے گی، مجھے اُس کے سوا کون نہلا سکتا ہے۔''

صبا کو اپنے بابا کی آواز بہت تھکی تھکی سی لگی تھی۔ صبا کو تشویش ہونے لگی۔

''بابا کیا ہوا۔'' صبا نے آگے بڑھ کر اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''اماں بیمار ہیں نا اس لیے اُداس ہوں۔''

''وہ ٹھیک ہو جائیں گی، آپ اُٹھیں نہالیں پھر شام ہو جائے گی۔ خدانخواستہ آپ کو ٹھنڈ لگ گئی تو۔''

صبا نے ایک ہاتھ کندھے پر رکھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹانگوں کو بیڈ سے فرش پر اُتارا پھر بیڈ کے نیچے سے چپل نکال کر اُس کے پیروں میں ڈالی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اُسے سہارا دے کر صحن میں لے آئی۔ فاخرہ نے آگے بڑھ کر زمان کو اپنی بانہوں میں بھر لیا پھر اپنا بازو زمان کی کمر میں ڈال کر اُسے واش روم میں لے گئی۔

خالہ اماں چھت کی کڑیاں ملا رہی تھیں، کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے آنکھیں مسلسل رو رہی تھیں۔ اُس کے دماغ میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بیمار ہو جانے کے باعث کوئی چیز اُن کے

اندر بہت گہرائی میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ چیز تھی 'خوف' برا ہونے کا خوف، خوف بس خوف۔

وہ تمام زندگی جو کچھ فاخرہ کے ساتھ کرتی رہی تھیں ظاہر ہے اب اُن کا خوفزدہ ہونا بنتا بھی تھا کہ کہیں فاخرہ اور اُس کی بیٹیاں اُسے تنہا اور بے آسرا نہ چھوڑ دیں۔ ایسا ضرور ہوتا اگر فاخرہ تنگ نظر اور خدائی فیصلوں میں دخل دینے والی ہوتی۔ کسی سے نفرت کرنا فاخرہ کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ وہ چاہ کر بھی کسی سے نفرت نہیں کر سکتی تھی، چاہے کوئی اُس کے ساتھ کچھ بھی کرتا۔

مگر ہوا کیا؟ فاخرہ خالہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی، دوالی، گھر میں بھی اُس کی دیکھ بھال محبت اور لگاؤ سے ہونے لگی۔

اب اُن کی نگاہوں سے خوف ڈھل گیا مگر آنکھیں خالی نہیں رہی تھیں۔ ایک اور احساس اُن میں جگہ بنا چکا تھا، ندامت و پچھتاوے کا احساس، جو نظریں اٹھنے نہیں دیتا تھا۔ جھکی آنکھوں میں آنسو آتے اور پھر آتے ہی رہتے۔ آنسو بہہ بہہ کر دامن بھگوتے رہتے۔ نجانے یہ کیسی ندامت تھی جو ڈھلتی ہی نہ تھی۔

کیسا پچھتاوا تھا جو کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ گنگ سی چھت کو گھورے جاتیں بے حس و حرکت لیٹی رہتیں۔ ہونٹوں پر ملال و شرمندگی کے قفل پڑ چکے تھے۔

وہ انتہائی دلگیری اور بے بسی کی تصویر بنتی جارہی تھیں۔ وہ عجیب سے سرد اندھیروں میں خود کو بھٹکتا پاتی تھیں۔ کوئی احساس اُنہیں چبھن دے کر ذہنی کچوکے لگاتا، ضمیر جاگ گیا تھا مگر کب جاگا جب وہ عمر کی پونجی ہارنے والی تھیں۔

فاخرہ نے زمان کو نہلا کر تولیے سے اُس کا بدن خشک کیا۔ اپنے وجود کا سہارا دے کر اُسے کپڑے پہنائے اور اُن کو ساتھ لیے باہر آئی۔ صحن میں بچھی چارپائی پر آرام سے زمان کو بٹھایا۔

''فضا بیٹا برش لے کر آؤ اور صبا اپنے بابا کے لیے چائے بناؤ۔'' فضا برش لے کر آئی تو فاخرہ زمان کے بال بنانے لگی۔ پھر زمان کے پیروں کی طرف بیٹھ گئی۔

''بہت شکریہ فاخرہ۔'' فاخرہ نے ٹھٹھک کر زمان کو دیکھا۔

''یہ میرا فرض ہے۔''، فاخرہ نے مدھم آواز میں کہا۔ زمان بولا کچھ نہیں مگر اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں اضطراری انداز میں کپکپانے لگیں۔ اُس کے ہاتھوں کی لرزش فاخرہ سے مخفی نہیں تھی۔

''بابا چائے۔''، تبھی صبا چائے لے کر آگئی۔

''میں بھی چائے پیوں گا۔''، تبھی اسد بھاگتا ہوا آیا تھا۔

''بچے چائے نہیں پیتے بیٹا۔'' فاخرہ نے کہا تو وہ مچلنے لگا۔ اسد بہت ضد کرنے لگا تھا۔

''تم گندی مما ہو، دادی کہتی ہیں تمہاری مما گندی ہیں۔'' وہ چیخنے لگا۔ اور فاخرہ تو 'کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' کی عملی تفسیر بن گئی گنگ سی بیٹھی رہی۔

''شرم نہیں آتی مما سے بدتمیزی کرتے ہوئے'' صبا نے سختی سے اُسے ٹوکا تو اسد اور بھی اُچھلنے لگا۔

''کروں گا کروں گا دادی کہتی ہے مما گندی ہے گندی ہے۔'' اُس نے کپ کو ہاتھ مارا چائے کا بھرا ہوا کپ ہوا میں اُچھل کر زمین بوس ہو گیا مگر اسد کو چنداں پروا نہیں تھی۔

''لفظوں کے ناخن نہیں ہوتے مگر یہ روح و بدن میں پیوست ہو کر اندر تک اُدھیڑ کر رکھ دیتے ہیں دل کو خون آلود کر سکتے ہیں 'گندی مما' لفظ نے جیسے فاخرہ کی ساری توانائی اپنے اندر جذب کر لی تھی۔

یہ سب کیا دھرا اُسی عورت کا تھا جو کمرے میں لیٹی بے بس آنسو بہاتی رہتی تھی۔

اندر بے حس و حرکت لیٹی خالہ اماں نے باہر کا

سارا تماشا دیکھا نہیں مگر سنا ضرور تھا۔ مگر انہیں خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہی تو اسد کو ہر وقت خود سے لگائے رکھتی تھیں۔ اُلٹی سیدھی باتیں اُس کے معصوم ذہن میں ڈالتی تھیں۔ صبا اور فضا نے جب سے فاخرہ کا دفاع کرنا شروع کیا تھا تب کوئی اور راہ نہ پا کر خالہ اماں نے اسد کو اپنا ہدف بنالیا تھا۔ اب وہ اپنی ساری چالبازیاں اسد پر آزمانا چاہ رہی تھیں۔ فاخرہ کو چاروں شانے چت گرانے کے واسطے وہ اسد کا ذہن خراب کرنے لگیں تا کہ وہ اپنی مما کے مقابل آ کر بدتمیزی کرلے اور آج دوسری بار اسد نے فاخرہ سے بدتمیزی کی تھی۔ اُسے تو اپنی فتح پر، اپنی کامیابی پر مسرور ہونا چاہیے تھا مگر خالہ اماں خوش نہیں تھی بلکہ ڈر گئی تھی۔ اب فاخرہ بھڑک اُٹھے گی اور...... مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس درد کو بھی فاخرہ نے اندر چھپالیا تھا۔ ہاں بہت دن اُس کی آنکھیں گیلی گیلی رہی تھیں اور دوسرا اُس نے اسد پر خصوصی توجہ دینی شروع کردی تھی۔ بگڑی ہوئی چیزیں صرف محبت و توجہ سے ہی سنورتی ہیں۔ فاخرہ نا اُمید نہیں تھی۔

☆......☆......☆

جویریہ کی گمشدگی پُر اسرار معمہ بنی ہوئی تھی آخر وہ کہاں گئی۔ اُسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی اسے اغواء کی واردات کہہ رہا تھا تو کوئی اُسے گھر سے بھاگ جانے والی مشکوک عورت گردان رہا تھا۔ کوئی اس واقعے کو حادثے سے موسوم کر رہا تھا، جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔

ابھی لبنیٰ سلمیٰ خالہ کے گھر جانے کا سوچ ہی رہی تھی مگر اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اُن کے گھر جانے کی۔ نجانے وہ کیا خیال کریں۔ لوگ طرح طرح کے جملوں میں اظہارِ افسوس کر کے جویریہ کے میاں کی نہ صرف دل شکنی کر رہے تھے بلکہ اُن کی

غیرت پر بھی اُنگلی اٹھائی جارہی تھی۔ اُن کو تسلی کے دو بول کہنے والا کوئی نہیں تھا مگر اُن کے حوصلے منہدم کرنے والے بہت تھے۔

یہ تو صدیوں سے زمانے کا چلن رہا ہے کہ آگے بڑھ کر اُمید دلانے والے، زخموں پر پھاہے رکھنے والے کم ہوتے ہیں بلکہ کم یاب ہی نہیں نایاب ہوتے ہیں لیکن......لیکن ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں بلکہ خود رو پودوں کی طرح جگہ جگہ ہوتے ہیں جو زخموں پر نمک پاشی کرنا خوب جانتے ہیں، تماش گیر۔ دوسروں کی زندگی میں کانٹے بونے والے، بے حس بے مروت لوگ۔

ابھی جویریہ والے واقعے پر دھول نہیں بیٹھی تھی۔ اس سانحے کی گونج ابھی شہر میں لہراتی پھر رہی تھی کہ ایک اور حراساں کردینے والا واقعہ ہوگیا۔ پچھلی گلی کے قریشی صاحب کے بیٹے کو اسکول سے واپسی پر کسی نے اغواء کرلیا تھا۔ حقیقی معنوں میں گردونواح میں ہراس پھیل گیا۔ قریشی صاحب اور اُن کی بیگم کا رو رو کر حال برا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کچھ معزز حضرات نے اِن کی حالتِ زار کے پیش نظر تھانے میں رپورٹ درج کروادی تھی۔

ایس ایچ او حمدان گیلانی خود شہر میں ہونے والے واقعات سے حواس باختہ تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کون لوگ تھے اور اُن کے اس گھناؤنے فعل کے پیچھے کیا مقاصد و اغراض پوشیدہ تھے۔

حمدان جیسے مضبوط شخص کا رنگ ایک دم سے اُڑ گیا تھا۔ چہرا پتھرانے لگا تعجب بے یقینی، صدمہ کیا یہ الفاظ کافی ہوتے اُن کی کیفیت بیان کرنے کے لیے، قطعی نہیں، پے در پے پڑنے والی اُفتاد نے گویا حمدان کے حواس سلب کرلیے تھے۔ ایک دن میں ایک ہی شہر سے چار بچوں کا غائب ہوجانا معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اوپر سے بہت دباؤ تھا۔ خدشات کی یلغار اُن کو سہار رہی تھی۔

پورے شہر کی فضا بوجھل ہوکر رہ گئی تھی۔ موت جیسا سناٹا چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ صدمے سے زبانیں گنگ ہوکر رہ گئی تھیں۔ لوگ ڈرنے لگے تھے۔ سب کو اپنے اپنے بچوں کی فکر پڑگئی تھی۔ سب نے رکشے لگوادیے تھے، کچھ لوگ خود ہی اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لے کر آنے لگے تھے۔ شہر جیسے سکتہ زدہ تھا۔ گہری، خوفناک خاموشی جیسے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

عروہ اور امن بھی آج کل رکشے سے کالج جانے آنے لگی تھیں۔ باقی دونوں گھروں کے چھوٹے بچوں کو بھی بطورِ خاص رکشے لگوادیے گئے تھے۔

امن کو وہ ہینڈسم کافی دنوں سے نظر نہیں آرہا تھا مگر آج اُس وقت امن کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اُس نے اُسے کالج میں دیکھا۔ امن نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں، اُسے یقین نہیں آرہا تھا وہ نایاب لودھی کے پاس کھڑا تھا۔ بلیک شلوار سوٹ میں اُس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ امن محویت سے دیکھے گئی بنا پلک جھپکائے، جبھی وہ کسی بات پر زور سے ہنسا تھا۔ اُس کے کالے گھنے سیاہ بالوں والا سر اور آدھا چہرہ امن کی نگاہوں کی رسائی میں تھا۔ امن کا دل جذبات کی یورش سے بوجھل ہورہا تھا۔ امن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ درمیانی فاصلہ پاٹ کر منحوس دوری کو دور اُچھال دے۔ ہر طرف وہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اتنا بھرپور اور مکمل تھا کہ ہزاروں میں نمایاں جھلکتا تھا۔ اُسے دیکھ کر اپنائیت کا احساس جاگتا تھا۔ اُس کا ہونا تقویت کا باعث تھا۔ اُس کے وجود سے خوشبوئیں بکھر رہی تھیں۔ وہ مسحور سی اپنے اطراف سے بیگانہ بس اُسے ہی تکے جارہی تھی۔ دھڑکن کو سنبھالتی بے حال ہورہی تھی، تبھی وہ نایاب لودھی کو گلے مل کر پلٹا اور اُس کی امن سے مدبھیڑ ہوگئی۔ سجاد بلوچ کی آنکھوں میں شناسائی کی لہر اُبھری پھر اُس کے لبوں پر دھیمی مسکان آن رکی۔

''کیسی ہو، فون نمبر۔'' اُس نے کہا تو امن نے میکانکی انداز میں اپنا نمبر کہہ سنایا۔ سجاد نے سیل فون کی چمکتی اسکرین پر نمبر لکھا اور پھر پریس کا بٹن دبایا۔ اگلے ہی لمحے امن کے سیل فون پر 'بے بی ڈول میں سونے دی' کی آواز اُبھری امن کی آنکھیں بے پایاں مسرت کا احساس لیے چمکنے لگیں۔

''شام کو فون کروں گا۔'' سجاد نے امن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ گہری وارفتگی، والہانہ پن، جاں نثاری کیا کچھ نہیں تھا سجاد کی آنکھوں میں، اور کیسے پل پل بدلتے رنگ تھے۔ چہرے کا تاثر معنی رکھتا تھا۔ نگاہوں کی حدت وتپش، بندلبوں کی گویائی، کچھ بھی نہیں بولا مگر جیسے سب کچھ کہہ دیا۔ نظروں کا تصادم دل کے پیغام، دل کی بے چینی و بے کلی کا پیغام بن رہا تھا۔ سارے جذبے آشکار ہو گئے تھے۔

''او کے چلتا ہوں بائے۔'' وہ گھوما اور چلا گیا۔ امن کے دل کی دھڑکنیں یک دم ہی تھمنے لگی تھیں۔ ہر منظر دھندلانے لگا۔ وہ جو پیار، محبت، عشق، جنون جیسے ان لفظوں سے آشنا نہیں تھی۔ تب تک سب ٹھیک تھا، جب تک اُسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ محبت کی خودرو کونپل نے دل کی سرزمین سے سر کیا نکالا سب کچھ بدل رہا تھا۔ تڑپ جاگتی ہے تو تن من پیاسا صحرا بن جاتا ہے۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ امن کی آنکھوں میں دھند اُتر آئی اور پہلو میں دل جیسے سرکشی و بغاوت پر آمادہ ہو کر سجاد کے پیچھے لپک رہا تھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو، کلاس نہیں لینی کیا؟'' نیہات ضمیر کی آواز قریب سے ہی اُبھری تھی مگر وہ متوجہ ہی کہاں تھی۔ وہ مسلسل کالج گیٹ کی طرف دیکھے جا رہی تھی، جہاں سے ابھی ابھی وہ ساحر گزر کر گیا تھا۔ امن کو کچھ بھی ہوش نہیں تھا، وہ کہاں ہے کیسی ہے، محبت یوں ہی تو ہر چیز سے بے گانہ کر دیا کرتی ہے، لاتعلق واجنبی۔ ابھی تو خود حیران تھی۔ ابھی تو وہ ہاتھ چھڑانے والی ہی تھی۔

''امن، آر یو آل رائٹ۔'' نیہات نے نرمی سے پکارا۔ امن چونکی جیسے نیند سے جاگی ہو۔ خالی خالی نگاہیں، بوکھلا کر رہ گئی۔

''ہاں، ٹھیک ہوں۔'' امن عجلت میں کہہ کر رُکی نہیں۔ نیہات نے اچنبھے سے امن کے بکھرے حواسوں کو سوچا پھر سر جھٹک کر وہیں درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور تادیر آنکھیں موندے غافل سا کھڑا رہا۔

☆......☆......☆

حمزہ اور حذیفہ ایک چھوٹی سی بال کے پیچھے لڑ رہے تھے۔ لبنیٰ اور فرقان اُن کی نوک جھونک دیکھ رہے تھے، تبھی حذیفہ نے حمزہ کو گرا کر بال اُس سے چھین لی تو حمزہ رونے لگا۔ لبنیٰ نے بھاگ کر روتے ہوئے حمزہ کو اٹھایا اور اُس کی کمر سہلانے لگی۔

''غلط بات بیٹا، مل کر کھیلو، لڑتے نہیں ہیں۔'' لبنیٰ نے نرمی سے حذیفہ کو تنبیہ کی۔

''مما سوری۔'' حذیفہ نے شرمندہ ہو کر کہا۔

''مما یہ بھائی حذیفہ اکثر میرے ساتھ زیادتی کر جاتا ہے۔'' حمزہ بسورا۔

''بری بات ہے میری جان، چلو گلے ملو، صلح کرو، اچھے بچے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے، اور بھائی بھائی کا رشتہ تو انمول ہوتا ہے۔'' لبنیٰ نے دونوں کو پکڑ کر قریب کیا۔ ایک کے چہرے پر شرمندگی تھی اور دوسرے کے غصہ، لبنیٰ اور فرقان نے حمزہ کے غصے سے تمتماتے گالوں کو چھوا۔ حمزہ سے حذیفہ نے سوری بولا پھر بانہیں پھیلا دیں کچھ دیر پھولے منہ کے ساتھ وہ گریزاں رہا پھر گلے لگ گیا۔ لبنیٰ اور فرقان نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں، جو سکھاؤ سیکھ جاتے ہیں۔ جو اُن کے دل وذہن میں بھرتے جاؤ پھر وہی باہر آتا ہے۔ اچھا یا برا

، یہ بھرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کیا بھرتا ہے۔ اچھائی، نیکی، صلہ رحمی یا تنفر، حقارت، انتقام، غصہ و عداوت، ماں باپ کی ذمہ داری ہے۔

بچے اب اُسی بال کے ساتھ دوبارہ کھیل رہے تھے، چند لمحے بیشتر ہونے والی بدمزگی کا نام ونشان بھی اُن کے رویوں میں نہیں جھلک رہا تھا۔ کوئی چپقلش نہیں تھی۔

''چائے بناؤں آپ کے لیے۔''

''ہاں یار، اور ایک ٹیبلٹ بھی، سر میں درد ہو رہا ہے اسی لیے جنرل اسٹور سے جلدی اُٹھ آیا۔''

''میں ابھی آئی۔'' لبنیٰ نے فریج سے دودھ نکالا اور کچن میں چلی آئی۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ چھوٹی سی ٹرے میں جب ایک کپ چائے ایک گلاس پانی لے کر آئی تو دیکھا فرقان کے ہاتھ میں اخبار تھا اور وہ گہری سوچوں میں مستغرق تھا۔

''یہ لیں جناب چائے۔'' لبنیٰ نے ٹرے صوفے کے سامنے رکھے میز پر رکھی اور ٹیبلٹ فرقان کی ہتھیلی پر رکھ کر پانی کا گلاس تھمایا۔

''صبا کتنی پیاری بچی ہے نا؟'' فرقان نے کھوئے انداز میں کہا تو لبنیٰ نے چونک کر دیکھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب فرقان نے صبا کی تعریف کی تھی۔ لبنیٰ کو اچھا نہیں بہت اچھا لگا۔

''جی بہت کیوٹ ہے اور قابل بھی۔''

''ہوں......'' فرقان کی مبہم سی 'ہوں' بھی لبنیٰ کو معنی خیز لگی تھی۔ یہ خوش آئند بات تھی کہ فرقان کا طرزِ عمل مثبت ہو رہا تھا۔ لبنیٰ کے دل سے اچھی اُمیدیں بندھ گئی۔

''یہ چائے......'' لبنیٰ نے کپ اُسے تھمایا۔ فرقان کپ پکڑ کر چائے کی چسکیاں لینے لگا مگر اب بھی صبا کا معصوم چہرہ، جاذب نقوش فرقان کے دل کو گدگدا رہے تھے۔

''نجانے کیوں مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں......''

''کیا دل کرتا ہے۔'' لبنیٰ نے فرقان کے ادھورے جملے کو مکمل کرنے کے لیے سوال کیا۔

''میں تذبذب کا شکار ہوں لبنیٰ، ورنہ دل چاہتا ہے صبا کو گلے لگا کر پیار کروں، اُس کی محنت پر، اُس کی کامیابی پر اُسے سراہوں، اُسے انعام دوں مگر......''

''مگر کیا فرقان......'' لبنیٰ نے مزید بولنے پر اُکسایا۔ لبنیٰ اِس سے فرقان کے اندر ہلچل مچاتی کیفیات کو سمجھ رہی تھی۔ لوہا گرم تھا اور لبنیٰ اپنی طرف سے گرم لوہے پر ضرب لگانا چاہتی تھی۔ اچھا موقع تھا۔

''مگر......اتنے فاصلے، اتنی دوریاں ہیں کہ بس ایسا ممکن ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔''

''دنیا کا ہر کام مشکل ضرور ہے ناممکن تو قطعی نہیں، فاصلے مٹائے بھی تو جاسکتے ہیں نا۔ دوریاں نزدیکیوں میں بھی تو بدل سکتی ہیں نا۔'' فرقان کی صبا کی ذات میں دلچسپی نے لبنیٰ کا بھی حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ جو وہ ایسے بات کر رہی تھی ورنہ فاخرہ اور اُس کی اولاد کے دفاع میں بولنے کی کب اجازت تھی۔

''مگر رحمان......'' فرقان اٹکا۔

''رحمان بھائی کو تو خدا واسطے کا بیر ہے اُن سے، نجانے کیا حد ہے اُن کی نفرت و بے گانگی کی۔ صبا تو آپ لوگوں کا اپنا خون ہے۔ اُس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ اتنی ہونہار بچی ہے۔''

''ہاں میں ملوں گا صبا سے، میرے لیے وہ امن جیسی ہے اور میں اُسے انعام بھی ضرور دوں گا۔''

''کب ملیں گے؟'' لبنیٰ کا چہرہ مسکرانے لگا۔ اُس کی خوشی کے مارے آنسو نکلنے لگے۔

''پتا نہیں۔''

''کیا انعام دیں گے۔''

''یہ بھی نہیں پتا۔'' فرقان نے کہا۔ مگر لبنیٰ کی

خوشی دیدیتی تھی۔ فرقان کی صبا کے لیے تڑپ خوش آئند بات تھی۔ ابھی وہ رحمان سے ڈر رہا تھا شاید کبھی صبا کی یا اُس کے بہن بھائی کی محبت فرقان کے دل میں غالب آجائے اور رحمان کا ڈر مغلوب ہو جائے۔ شاید کبھی ختم ہی ہو جائے۔ لبنیٰ پُر امید تھی۔ فی الفور جو کچھ فرقان نے محسوس کیا تھا وہ بھی کمال کامیابی تھی۔

لبنیٰ جانتی تھی کہ فرقان نے جو کچھ کہا ہے وہ اُس پر عمل بھی ضرور کرے گا۔ وہ اُس کی شریکِ سفر تھی اور فرقان کی مزاج آشنا بھی۔ جانتی تھی وہ اپنے قول کا سچا ہے۔ جو کہتا ہے کرتا بھی ہے۔ اپنے ارادوں کا اٹل ہے۔ جو ٹھان لے وہ کر دکھاتا ہے۔

☆......☆......☆

احتشام والے واقعے کی وجہ سے عجیب سی سوگوار فضا تھی اسی لیے اِن دونوں گھرانوں نے گھومنے کا پروگرام بنالیا تاکہ اُداسی دور ہو جائے۔ رحمان اپنے کام کے سلسلے میں لاہور جا رہا تھا۔ اُس نے اِن لوگوں کو بھی تیار ہونے کا کہہ دیا۔ عروہ اور امن بے تحاشا پُر جوش تھیں۔ چھوٹے لڑکے بھی لاہور دیکھنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ پہلی بار لاہور جا رہے تھے۔

اُن کا دو دن کا ٹور تھا۔ احتشام سب عزت افزائی (مار کٹائی) بھول بھال کر تیاری میں مگن تھا۔ رحمان کا ارادہ ہوٹل میں ٹھہرنے کا تھا۔

پروگرام دونوں گھروں میں ترتیب دیا جا رہا تھا۔ لڑکیاں تیاریاں کرنے لگیں کہ کون کون سے کپڑے پہن کر جانا ہیں اور کون کون سے ساتھ لے کر جانا ہیں۔ امن اور عروہ آپس میں ڈسکس کر رہی تھیں۔ جبکہ فروا اس پروگرام سے آگاہ نہیں تھی۔ وہ اب بھی اریز چوہدری کے پاس تھی۔

فروا رحمان بہت سے مہکتے خوابوں کی اُنگلی تھامے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ خوش باش، بے فکر، وہ زندگی کو ایسے ہی دیکھتی تھی، جیسے ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر لہروں کا رقص دیکھتے ہیں۔ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ سمندر اپنے اندر کتنے طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔ سمندر میں سیپ ڈھونڈنے نکلیں تو کبھی کبھی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

''ہیلو مما......'' فروا نے خوش دلی سے کہا۔ عائشہ شاید سو کر اٹھی تھی۔

''آ گیا میرا بچہ۔'' عائشہ نے آگے بڑھ کر لاڈ سے کہا۔ فروا چہکتی ہوئی عائشہ کے گلے کا ہار بن گئی۔

''بڑا پیار آ رہا ہے آج ماں پر، خیر تو ہے نا۔'' عائشہ نے آبرو اُچکا کر کہا۔

''مجھے تو ہمیشہ سے آپ پر ایسے ہی پیار آتا ہے۔'' فروا نے عائشہ کا گال چوم کر کہا۔

''اب جلدی سے بتا دو کہ کیا چاہیے۔ کیوں مسکہ لگایا جا رہا ہے۔'' وہ بھی ماں تھی۔

''گاڑی، نئی نکور، اپنی ذاتی۔'' فروا نے بھی ٹال مٹول سے کام نہیں لیا بے دھڑک کہہ ڈالا۔

''الگ سے گاڑی کیا کرنی ہے، یہ پاس ہی تو تمہارا پارلر ہے۔''

''میں اپنی ذاتی گاڑی لینا چاہتی ہوں بعد میں، میں اپنا ذاتی سیلون بناؤں گی، ابھی تو میں کام سیکھ لوں، بعد میں اس حوالے سے فیصلہ کروں گی کہ میں کس شہر کے کس علاقے میں سیلون کھولوں۔'' وہ قطعیت سے سارے فیصلے کر کے اب بس سُنا رہی تھی۔ کوئی رائے یا اجازت نہیں مانگ رہی تھی۔ مشورہ بھی نہیں کر رہی تھی۔ بس بتا رہی تھی اور عائشہ بس آنکھیں کھولے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔ عائشہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، تائید کرے یا تردید اُس کے خیال کی۔ عائشہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

(اس خوب صورت ناولٹ
اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی انیسویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کرسکی تھی۔ وہ کانونٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمِ فروا اُمِ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُمِ فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کررہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُمِ فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آ گئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کردے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہوگیا تھا کیونکہ وہ اُمِ فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کرپایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کردیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔

امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُمِ فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہوجاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُمِ فروا کی رام کہانی سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہوجاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں

ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ اہل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہر النساء بیگم سے اہل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہر النساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتی ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اِس صورتِ حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر......

(اب آگے پڑھیے)

''آپی میں تو اُٹھ گئی ہوں پر آپ یوں کیوں بیٹھی ہیں؟''

''ویسے ہی بیٹھ گئی ہوں۔'' معدوم مسکراہٹ لحہ بھر کے لیے اُس کے نرم ہونٹوں میں کھلی۔ آخر وہ اُمِ زارا کو کیا جواب دیتی، خود ہی بھول بھلیوں کی بے اعتباریوں میں جکڑی ہوئی تھی۔

اچانک اُم فروا کا فون بجا۔ خیالوں کی ڈور ٹوٹتی چلی گئی مسلسل فون پر بیل آ رہی تھی۔ اسکرین پر ملک مصطفیٰ علی کا نام جگمگ کر رہا تھا۔ وہ بدستور فون اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ اب فون بند ہو چکا تھا۔ اُمِ فروا نے اُمِ زارا کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی اور کھلے بالوں کی چوٹی بنا رہی تھی۔ اُمِ زارا نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ کس کا فون تھا۔

اُم فروا نے اب کی بار مسکرا کر اُم زارا کو دیکھا۔ اس وقت اُم زارا کس قدر خوبصورت لگ رہی تھی۔ نیند کے خمار سے بے خود آنکھیں، ڈارک سنہری، آنکھوں والے صبیح چہرے پر کیسی میٹھی دم بخود کر دینے والی لاپروائی تھی۔ اچانک اُم فروا کی ہارٹ بیٹ تیز ہوئی اس کے ہاتھ یخ بستہ ہو گئے۔ اُمِ فروا کو محسوس ہوا اُمِ زارا تو اُس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے۔ چھوٹی سی عمر کی اُمِ زارا اتنی حسین ہے۔ میں نے تو کبھی غور ہی نہ کیا، اُمِ زارا کی آنکھوں میں غیر مرئی کشش تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چوٹی گوندھتی بے خودی کے عالم میں نعت پڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی ہی ترنگ میں تھی۔ اُمِ فروا خاموشی سے اُسے سنتی رہی۔ لیکن ذہن میں یہی خیال ابھر رہا تھا۔ ''اے باری تعالیٰ میری بہن کا نصیب بہت اچھا کرنا۔ اے کاتبِ تقدیر شریف النفس آدمی کے ساتھ اس کا نصیب لکھنا۔''

اب موبائل پر ملک مصطفیٰ علی کا میسج تھا۔ ''سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ دوپہر دو بجے فون کروں گا۔'' اُمِ فروا نے ہونٹوں کو آپس میں دبایا۔ وہ جس قدر اُن کے خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتی وہ اتنا ہی اس کی ذات کے ہر ہر گوشے میں مہکاریں بسا جاتے۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے اُم زارا۔''

''بولیں آپی۔'' اُمِ زارا کی سنہری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت اُمِ زارا تر و تازہ لگ رہی تھی۔ نیند پوری ہو جانے کی وجہ سے طمانیت آمیز آسودگی تھی۔ اُس کے چہرے پر۔ خداوند قدوس یہ خوشی ہمیشہ قائم رکھنا اس کے چہرے پر' اُمِ فروا نے پھر چپکے سے بہن کے لیے دعا کی۔ وہ اکثر یونہی سہم جایا کرتی تھی۔

''اُم زارا تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''آپی آپ اتنی تمہید کیوں باندھ رہی ہیں۔''

''ہاں وہ......'' وہ اپنی اُنگلیوں کو ایک دوسرے سے مسل رہی تھی۔ اُم زارا اسے بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔

''ملک مصطفیٰ علی کو تم جانتی ہو ناں؟ جن کی لال حویلی کی انیکسی میں تم رہی ہو؟''

''آپی بھول جائیں وہ سب باتیں، اور یوں سمجھیں جیسے آپ کی زندگی میں کبھی وہ عرصہ کبھی آیا ہی نہیں۔'' اچانک سے اُمِ زارا کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی تھی۔ اس کی کھڑی ناک کی نوک سرخی مائل ہو رہی تھی۔

'بھول ہی تو نہیں پاتی زارا جان!' اُس نے دل میں سوچا۔

اُم فروا نے مصطفیٰ علی کے میسج کا پیج کھول کر اُمِ زارا کے سامنے کر دیا۔ پڑھنے کے بعد اُمِ زارا نے اُمِ فروا کی طرف دیکھا۔ اُم فروا کے ملیح رخسار دہک رہے تھے۔ اُمِ زارا اس میسج کا مفہوم نہیں سمجھ پائی تھی۔ فروا کے چہرے پر اک بے قراری، ضبط و تحمل تھا۔

''آپی آپ کا خیال کیا ہے یہ میسج پڑھنے کے بعد۔'' یہ پہلا سوال تھا اُمِ زارا کا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟'' وہ گرد آلود گرداب میں غوطے کھا رہی تھی۔ اسی لیے تو اس نے اُمِ زارا سے بات کی تھی۔ اُمِ زارا اُس کی عزیز بہن تھی۔ وہ اس سے کچھ نہیں چھپا سکتی تھی۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔ خاص الخاص بات بھی شیئر کی جاتی تھی۔ ممکن تھا کبھی اُمِ زارا اُسے ملک مصطفیٰ علی سے بات کرتے دیکھ لیتی۔ یقیناً تب شکوہ یقیناً اُمِ زارا کی آنکھوں میں بھرنا تھا۔ سوچیں اُسے بے چین کیے جا رہی تھیں۔

''اُمِ زارا ممکن ہے کوئی وجہ ہو اُن کے فون کرنے کی۔ کچھ بتانا چاہتے ہوں یا کوئی بھی وجہ......'' اُمِ فروا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سراسیمگی اُمِ زارا کی سنہری آنکھوں کو حیران کر چکی تھی۔

''آپی...... ملک مصطفیٰ علی ہمارے محسن ہیں۔ اگر وہ ابا جی کی ہمت نہ بندھاتے تو ہم اس صدمہ کو کیسے برداشت کر پاتے۔ آپ اپنے اندر عدم اعتماد کے وسوسے نہ پالیں۔ اُن سے بات کریں۔ انہوں نے آپ کو فون کیوں کیا تھا وہ بتا دیں گے؟ یقیناً آپ کی خیریت پوچھنے کے لیے ہی کیا ہوگا۔'' اُمِ زارا اپنے سوال کا خود ہی جواب دے رہی تھی۔

''اُمِ زارا میرے پاس مضبوط دلیل نہیں ہے، فضول میں غیر محرم سے بات کرتی پھروں۔''

''آپی آسمانوں پر براجمان رب العزت بندوں کی نیتوں سے بخوبی واقف رہتا ہے۔ بس آپ اپنی نیت درست رکھیں۔ باقی اوپر والے پر چھوڑ دیں۔'' اُمِ زارا نے کسی قدر صحیح بات کی تھی۔ رب نیتیں جانتا ہے جو بشر اُس پر اپنے شہرِ ذات کی ہر ہر بات چھوڑ دیتا ہے۔ وہ انسان کبھی خسارے میں نہیں رہتا۔ یک بارگی وہی پُرفسوں شہد آگیں مسکان اُمِ زارا کے دلکش چہرے پر عیاں تھی۔ جو چند لمحوں میں اُس کی گہری آنکھوں میں بس چکی تھی۔ واقعی اُمِ زارا کی جاندار مسکراہٹ نے اُمِ فروا کے دل کا بوجھ قدرے کم کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اسماعیل بخش کی محنت کی وجہ سے قدرت اُسے فیضیاب فرما رہی تھی۔ اب اسماعیل بخش تمام حروفِ تہجی میں خطاطی کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روانی خوش خطی اور پھرتی بھری مہارت آ چکی تھی۔ اُسے مختلف بڑی بڑی کمپنیز کی جانب سے آرڈرز دھڑا دھڑ مل رہے تھے۔ اُس نے اپنے ہی اسٹوڈنٹ کو مستقل دکان پر رکھ لیا تھا۔ اس کام میں اُس کی لگن تڑپ ایسی کہ وہ اس کام میں ڈوب جاتا۔ اُس کی زبان پر درودِ پاک کا ورد رہتا اور اُس کی مضبوط انگلیوں کی پوریں قرآنِ پاک کی آیات کو اپنے اندر سموتی رہتیں۔ ایک نشہ، ایک

سرور رب سوہنے کے قریب کی تڑپ میں وہ خوش رہتا۔ اُس کے چہرے پر پل پل طمانیت آمیزی چھلکتی۔ اُس کی کنچوں جیسی یاقوتی آنکھوں میں ایسی کشش کہ الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہو۔ وہ مردانہ وجاہتوں کا مکمل بھرپور شاہکار تھا۔ قدرت کی خاص مہربانی تھی۔ مولوی ابراہیم بخش کی فیملی پر اس کی دکان کے سامنے سے گزرتی خواتین رُک کر، ٹھٹک کر، چونک کر، حیرت سے اُسے دیکھتیں بار بار اُس کی دکان کے سامنے سے گزرتیں۔ وہ ہمیشہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ خطاطی کے دوران وہ اک متبرک فیز سے گزرتا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا اُس کے سامنے برگزیدہ ہستیاں قرآن پاک پڑھ رہی ہیں۔ اور وہ لکھ رہا ہے۔ دھیمی خوش کن مسکان ہر پل اُس کے ہونٹوں پر کھلی رہتی۔ شلوار سوٹ میں کسرتی سراپے والا شکیل وجیہہ اسماعیل بخش، مرد بھی جسے دیکھ کر رُک جاتے تھے۔ اُسے دیکھ کر اکثر لوگوں کے منہ سے سبحان اللہ نکلتا لیکن اُسے رتی بھر زعم نہیں تھا خود پر۔ وہ اپنے کام کی اجرت کے مطابق ہی معاوضہ وصول کرتا یہی بات اُس نے اپنے شاگردوں کو بھی سمجھائی تھی۔

مولوی صاحب نے اسماعیل کو تاکید کی تھی۔

''بیٹا اپنی حاجت کے مطابق رکھ لیا کرو۔ باقی بیواؤں، یتیم و مساکین میں تقسیم کر دیا کرو۔'' اسماعیل بخش اب ایسا ہی کرتا تھا۔ اب تو پاکستان کی معروف کمپنیز اُسے بڑے بڑے آرڈرز دینے لگی تھیں۔ وہ حیران ہوتا میں اللہ کی راہ میں جتنا خرچ کرتا ہوں۔ اللہ پاک مجھے اُس سے کہیں زیادہ عطا کر دیتا ہے۔ وہ زیادہ آرڈرز پورے نہیں کر سکتا تھا اگر زیادہ فورس کیا جاتا تو انہیں لائن میں لگنے کا کہہ دیتا کمپنیز بھاری رقم کی آفر کرتیں لیکن اُس کے اپنے اصول تھے۔ مولوی صاحب نے اُسے سمجھایا تھا۔ بیٹا جس طرح ہمارے نبی ﷺ نے تجارت کی اور صحابہ کرامؓ نے، تم ہمیشہ خود کو اُن کے نقشِ قدم پر چلانے کی کوشش کرنا۔ اسماعیل نے اپنے والدِ گرامی کی بات ذہن میں محفوظ کر لی تھی۔ منافع تھا کہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بے بے جی اب اُمِ زارا کے جہیز کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ اُنہیں اُمِ فروا کا خیال آتا تو دل میں گانٹھیں پڑتی چلی جاتیں۔ دل میں کسک اُٹھتی تو سر جھکا لیتیں۔

''میرے مالک مجھے معاف فرما دے آخر ہوں تو انسان ہی ناں۔ مالک میں جانتی ہوں میری بچی کے لیے تُو بہترین کرے گا۔'' تب وہ خود کو خوش رکھنے کی کوشش کرتیں۔ آنکھوں میں رُکی بے قراری فوراً غائب کر لیتیں۔

☆......☆......☆

اب ملک مصطفیٰ علی، موچی گیٹ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کا خطبہ بہت غور سے سنتے۔ ہر مرتبہ ہی آگہی کے دروازے اُن پر کھلتے چلے جاتے۔ کیسی پُرسوز تاثیر تھی۔ مولوی صاحب کی آواز میں، پُرسوز آواز جب سماعتوں سے ٹکراتی تو امرت گھولتی محسوس ہوتی۔ ایمان افروز خطبہ ملک مصطفیٰ علی کے اندر کی لگن کو مزید بڑھاوا دیتا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد جب مسجد نمازیوں سے خالی ہو جاتی تو وہ مولوی صاحب سے ملتے۔ مولوی صاحب اُن سے باتیں کرتے۔ اللہ اور اُس کے محبوب رسول ﷺ کی باتیں یہاں میرے رب نے کیا فرمایا یہاں نبی ﷺ نے کیسے اللہ کا پیغام اپنی اُمت تک پہنچایا۔ تب ملک مصطفیٰ علی گہری تشفی و تقویت محسوس کرتے۔ ملک مصطفیٰ علی نے اب دوستوں کی محفلوں میں جانا ترک کر دیا تھا۔ چھوٹی موٹی گیدرنگ میں چلے جاتے۔ ڈنر وغیرہ یا گپ شپ لگا لیتے تھوڑی دیر کے

لیے۔ ان کے وہ تینوں قریبی دوست حیران ہو کر ملک مصطفیٰ علی کو دیکھتے۔

''تم یکسر بدل رہے ہو ملک مصطفیٰ، مولوی بنتے جا رہے ہو۔''

وہ مسکرا کر اُن تینوں کی طرف دیکھتے۔ ''اللہ پاک میری طرح تم لوگوں کو بھی ہدایت دے۔'' وہ ملک مصطفیٰ علی کی بات پر قہقہہ لگاتے۔

''یار خدا دلوں کو بدلنے میں دیر نہیں لگاتا۔''

لال حویلی کے شاہ جہان کتب خانہ میں اب ملک مصطفیٰ علی زیادہ پائے جاتے۔ جہاں پوری دنیا کا بہترین لٹریچر موجود تھا۔

انہوں نے اسلامی بکس سے اپنے مطالعے کا آغاز کیا تھا۔ یہ کیسے ادارک تھے، کیسے لطیف در تھے جو ملک مصطفیٰ علی پر کھلتے چلے جا رہے تھے۔ وہ سب سے پہلے قرآن پاک تفسیر سے پڑھ رہے تھے۔ مولوی ابراہیم بخش کی صحبت میں بیٹھنا انہیں اچھا لگتا مولوی صاحب کی باتیں ملک مصطفیٰ علی کو ان کی ذات کے ذرے ذرے کا چہرہ دکھا دیتیں۔ تب بگڑے ہوئے اس رئیس زادے کو اپنی روح آبِ زم زم سے غسل لیتی محسوس ہوتی۔ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ اللہ کے بندوں سے کہتے ہیں کہ عابد زاہد و صادقین کی محفلوں میں کثرت سے بیٹھا کرو۔''

اُم فروا کو دیکھ کر ہی انہیں رب یاد آیا تھا۔ پہلا سوال اُن کے ذہن میں یہی اٹھا تھا کہ اس صورت کو بنایا کس نے؟ اسے بے مثال سیرت کس نے عطا کی؟ اسے خوبصورت آواز دینے والا کون ہے؟ تب کسی نے انہیں اندر سے بری طرح جھنجوڑا۔

رب...... رب!! یہ نعمتیں وہی عطا کرنے والا ہے۔

اُس دن وہ اسماعیل بخش کو بھی چند کتابیں پڑھنے کے لیے دے آئے۔ ''اسماعیل یہ کتابیں گھر والوں کو بھی پڑھنے کا کہنا۔'' اسماعیل بہت خوش ہوا۔

''ملک صاحب آپ کا ذوقِ مطالعہ بہترین ہے۔'' اسماعیل سرسری صفحے پلٹتے ہوئے ایک دو لائنیں پڑھ کر بولا۔ اسماعیل کی بات پر انہوں نے شرمندگی اندر ہی دبالی۔ وہ کیا کہتے اسماعیل بخش سے کہ میں نے تو ابھی ابھی مطالعہ کرنا شروع کیا ہے۔

ویک اینڈ کی اس شام ملک مصطفیٰ علی کتب خانہ میں موجود تھے۔ اُم فروا کو دیکھے تقریباً دو مہینے ہو چکے تھے۔ وہ اُس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے لیکن اب ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے غیر محرم تھے۔ وہ اُن کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔ اور پھر غیر ارادی طور پر اُن کی مضبوط انگلیوں کی پوریں سیل فون کی روشن اسکرین پر اُم فروا کے نام پر رُک گئیں۔ اندر کی شدید بے قراری نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دو چار بیل کے بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔ اور سلام کیا گیا تھا۔ کئی لمحوں تک اُن کی سماعتوں میں اُم فروا کی رسیلی آواز گھلتی رہی۔ انہوں نے اُس کے سلام کا جواب دیا۔

''اُم فروا کیسی ہیں آپ؟ الحمدللہ بہت اچھی ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟''

''خیریت سے ہوں۔'' وہ مسکرائے۔ انہیں لگ رہا تھا اُم فروا بھی مسکرا رہی ہے۔ دنوں بعد اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُتری تھی۔ آج کئی روز بعد انہوں نے اُم فروا کی آواز سنی جیسے اُن کے ہر طرف

جھانجھریں بج اٹھی ہوں۔

''کیا ہورہا ہے آج کل۔'' اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا بات کا سلسلہ کیسے آگے بڑھائیں۔ اُمِ فروا بھی نروس تھی۔ آخر اچانک اُن کا فون آجانے پر وہ بات کیا کرتی؟

''ملک صاحب آپ کے گھر والے خیریت سے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں۔ کیا ہورہا تھا؟''

''عشاء کی نماز سے ابھی ابھی فارغ ہوئی ہوں۔''

''گڈ!''

اس وقت وہ صحن میں رکھے گملوں کے پاس کھڑی تھی۔ رات کی رانی کی کلیاں مکمل کھل چکی تھیں۔ جن کی مہک سے پورا آنگن مہک رہا تھا۔

''میں نے اسماعیل کو چند بکس دی تھیں۔ برٹش آرمی آفیسر کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس رائٹر نے باریک بینی سے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے کے بعد سیرت نبوی ﷺ کو بھی پڑھا پھر تخلیق کی گئی ہیں۔ پیش لفظ میں رائٹر نے تمام ڈیٹیل دی ہے کہ اُسے کیسے اسلامک مذہب کی جستجو ہوئی۔''

''جی۔'' وہ ہمہ تن گوش اُن کی باتیں سن رہی تھی۔

''اللہ جس کو چاہے پل کی دیر بغیر اپنی جانب رجوع کرا لے۔'' اُمِ فروا آہستہ روی سے بول رہی تھی۔ دل میں بار بار بے چینی پریشان کررہی تھی کہ میں ایک غیر محرم سے بات کررہی ہوں۔ اُمِ فروا کی آواز کا بے خود کردینے والا سحر۔ ملک مصطفیٰ علی کو سراسیمگی میں لے گیا۔ وہ بدستور زیرلب مسکرا رہے تھے۔ اُمِ فروا کے لہجے کی خوشبو بھری مہکار اُن کی اطراف سرسرائی کومل بادِ صبا کی مانند۔

''اُمِ فروا آپ خوش ہیں ناں؟''

''بہت زیادہ خوش ہوں میں۔''

''میں اکثر اُس انیکسی میں جاتا ہوں جہاں مختصر دورانیہ آپ نے گزارا۔''

''آپ کیوں جاتے ہیں وہاں۔'' غیر ارادی میں اُمِ فروا کے ہونٹوں سے پھسلا۔

''دل چاہتا ہے، وہاں ہر چیز ویسی کی ویسی رکھی ہے۔ آپ اپنی ضرورت کی کئی چیزیں وہاں بھول آئی ہیں۔''

''نہیں تو۔'' اُس نے ذہن پر زور دیا۔

''کافی کچھ بھول آئی ہیں آپ۔ آپ کا ہیئر برش جس میں ابھی بھی آپ کے چند بال موجود ہیں۔ وہ صابن جو آنے سے پہلے آپ نے استعمال کیا تھا۔ جائے نماز، آپ کے سرہانے تلے گٹھری بنے ان گنت لمحات، وہ تکیہ جس پر آپ نے نجانے کتنے آنسو بہائے ہوں گے۔ اُس انیکسی کے ایک ایک انچ پر آپ کا لمس جوں کا توں موجود ہے۔ میں آپ کی جائے نماز وہاں سے لے آیا تھا۔''

ملک مصطفیٰ علی جانتے تھے۔ اس جائے نماز پر اس لڑکی نے بے انتہا سجدے کرتے ہوئے آنسوؤں کی صورت اپنی آنکھوں کا نور جذب کیا ہوگا۔

''جی......؟'' اُمِ فروا کی جی خاصی لمبی تھی۔ متذبذب سی حیرانگی تھی۔ اُمِ فروا کی آنکھوں میں لہجے کی پور پور ہراساں تھی۔

''اُمِ فروا آپ کی اُس جائے نماز پر اب میں نماز پڑھتا ہوں۔''

''آپ نماز بھی پڑھتے ہیں؟'' بغیر ارادہ اچانک اُس کی زبان چلی۔ وہ زور سے ہنسے۔ اپنی بات اور اُن کے ہنسنے پر وہ سٹ پٹائی۔ اب ملک مصطفیٰ علی کی گھمبیر ہنسی دوبارہ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''کیا میں نماز نہیں پڑھ سکتا؟'' اُن کی جانب سے بھی سوال ہوا۔

''معافی چاہتی ہوں اپنی اس نادانی پر۔'' وہ شرمندہ لگ رہی تھی۔

''اب میں باقاعدگی سے مسجد میں نماز پڑھتا ہوں۔'' اُمِ فروا مسکرائی۔ ملک مصطفیٰ علی......اب......کا لفظ خود ہی اپنی گفتگو میں لے آئے تھے۔

''آپ کی جائے نماز پر میں رات کے پچھلے پہروں نفلی عبادت کرتا ہوں۔ اُمِ فروا تب میں آپ کو بھی یاد کرتا ہوں۔''

''مجھے؟ لیکن مجھے کیوں؟'' وہ ابھی تک حیرت میں تھی۔

''میں نہیں جانتا۔'' وہ سیک انداز میں ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا کر رہے تھے۔ درمیان میں تھوڑا توقف لاتے پھر بولتے۔ اُمِ فروا نہیں جانتی تھی یہ اچانک سے اُس کے اندر یہ کیسی بے ہنگم اتھل پتھل برپا ہوئی تھی۔ جس کی وہ بھرپور طریقے سے سرزنش کر رہی تھی۔

''آپ نے فون کیوں کیا کیا؟ کوئی کام تھا؟'' اُمِ فروا چاہ رہی تھی اب وہ فون بند کر دیں۔

''آپ کو بُرا لگا میرا فون کرنا؟''

''نہیں تو۔'' گھبراہٹ میں گھٹی گھٹی آواز حلق سے برآمد ہوئی۔ تو ملک مصطفیٰ علی محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''میں نے ماں جی سے ذکر کیا تھا آپ کے گھر آنے کا۔''

''کیوں؟'' وہ نروس تو ویسے ہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی کی ہر بات پر بے تکا بول رہی تھی۔

''اُمِ فروا کیا میں مولوی صاحب کے گھر آنے کا ذکر نہیں کر سکتا؟''

''بھلا میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔'' اُن کے لہجے میں شوخی عود رہی تھی۔

''میری ماں جی اور بھابی بہت اچھی ہیں۔ میری بہن امل کو تو آپ نے دیکھا ہی ہوا ہے؟''

''میں نے؟'' یاد نہیں آرہا۔

''میلاد شریف کی محفل میں ایک مرتبہ آپ اپنی بہن اور والدہ کے ساتھ لال حویلی آئی تھیں۔''

''جی مجھے یاد آرہا ہے میں کافی دیر سے صحن میں کھڑی ہوں اب اندر جاؤں۔'' وہ اجازت طلب انداز میں بولی پریشان ہو رہی تھی کوئی اُسے یوں فون پر بات کرتے دیکھ نہ لے۔

''ٹھیک ہے آپ اندر جائیں اپنا خیال رکھیے گا۔''

''جی۔'' اس وقت ملک مصطفیٰ علی کا دل شدت سے چاہ رہا تھا۔ وہ اُمِ فروا کو دیکھیں، روبرو اُس سے باتیں کریں۔ لیکن ایسا اب ممکن نہیں تھا کیونکہ غیر لوگ مولوی صاحب کے اندرونِ خانہ میں نہیں جا سکتے تھے۔

'کیا اب میں اُمِ فروا کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا؟' اس خیال نے اُن کے دل میں چھید کر دیے۔ جب ماں جی اور ماہین آئی ہوں تو مولوی صاحب کی فیملی کو کیوں نہ دعوت پر مدعو کیا جائے۔ یہ مناسب نہیں ہے

فی الحال ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہاں اُس کے تصور سے باتیں تو کر ہی سکتے تھے۔ ایسے خوشگوار لمحات اکثر انہیں اپنی دسترس میں لے لیتے۔ تو اُن کے ہونٹوں پر پھیلی مسکانیں گہری ہو جاتیں۔

☆......☆......☆

ماہین ان دنوں پھر امید سے تھی۔ وہ دوسرا بچہ اتنی جلدی نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن اللہ پاک نے اس کی قسمت میں یہ بچہ لکھ دیا تھا۔ پھر؟...... پھر کے آگے وہ بے بس تھی۔ اللہ جو چاہتا ہے وہ ضرور کرتا ہے۔

رات بھر ہلکی پھلکی بارش جاری رہی تھی۔ پھر بارش تھم جانے کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ بادلوں کے اکا دُکا ٹکڑے غائب ہو کر صبح صادق کی سپیدی نرمل سفیدی جیسی دھند میں تبدیل ہو رہی تھی۔ بارش کے بعد خنکی قدرے بڑھ گئی تھی۔

ملک عمار علی فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد گاؤں کے چند لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے مسجد سے باہر ہی نکلے تھے کہ اُن کا دایاں ہاتھ دل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ شدید درد کی شدت سے وہ نڈھال ہو رہے تھے۔ اُن کے ساتھ چلتے ظفر حسین نے ملک عمار علی کو سہارا دیا۔ سبھی لوگ آس پاس جمع ہو گئے۔ ایک لڑکا جلدی سے چارپائی اُٹھا لایا۔ اُس پر ملک عمار علی کو لٹایا گیا۔

''ملک صاحب کیا ہوا؟'' کئی آوازیں اکٹھی ہو کر ابھریں۔ ملک عمار علی کی آنکھیں گلابی ہوتی ہوئی بند ہو رہی تھیں۔ اُن کا ہاتھ ابھی بھی دل پر تھا۔

ریاض جلدی سے گاؤں کے ڈاکٹر نبیل کو بلا لایا۔ ملک عمار علی کی نبض ڈوب رہی تھی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا انہیں ہارٹ اٹیک کا شدید دورہ پڑا ہے۔ فوری طور پر انہیں شہر لے جائیں۔

بڑی حویلی میں صرف مہر النساء تھیں۔ انہیں ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا ماہین کو دو دن پہلے ملک عمار علی لاہور چھوڑ کر آئے تھے۔ کیونکہ اُس نے اپنی فیملی ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ ملک عمار علی کے ڈرائیور شاہ نواز نے ملک مصطفیٰ علی کو فون کر دیا تھا۔ ملک عمار علی ان دنوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ خوش کیوں نہ ہوتے آخر وہ دوسرے بچے کے باپ بننے والے تھے۔ اس خوشخبری پر مہر النساء نے پورے گاؤں میں حلوے کا کڑھا بنوا کر تقسیم کروائے تھے۔ اناج خیرات کیا گیا تھا۔

شاہ نواز کے فون پر ملک مصطفیٰ علی گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے ظفر حسین سے کہا تھا کہ انہیں فوری طور پر خوشاب ڈاکٹر طلال علی کے کلینک لے کر پہنچیں۔ میں نکل رہا ہوں۔''

ظفر حسین انہیں شہر لے جا رہے تھے۔ پیچھے کی گاڑیوں میں ان کے رشتے دار اور گاؤں کے لوگ آ رہے تھے۔ ظفر حسین ملک قاسم علی کے چچا زاد تھے۔ اس وقت ظفر حسین اور شاہ نواز جہان آباد کی حدود سے نکل کر مین جی ٹی روڈ پر ہی آئے تھے کہ ملک عمار علی کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ ظفر حسین جن کی گود میں ملک عمار علی کا سر تھا۔ وہ زور زور سے ملک عمار علی کا دل پمپ کر رہے تھے۔ لیکن آہ! قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ملک عمار علی کی نبض ڈوب رہی تھی۔

انہوں نے دو تین بار زور زور سے ہچکیاں لیں۔ شاہ نواز نے حواس باختہ گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔ رہ جانے والا نام صرف اللہ کا جس نے سدا رہنا ہے۔ آخری ہچکی کے ساتھ آخری نبض بھی ڈوب گئی۔ شاہ نواز نے سڑک کے سائیڈ پر پجارو روک دی۔

''ملک صاحب! ملک صاحب!'' شاہ نواز چیختا ہوا آوازیں دے رہا تھا۔

اِنا للہ واِنا الیہ راجعون! ملک ظفر حسین نے با آواز بلند پڑھا۔ اُن کی آواز رندھ کر ضبط میں ڈوب چکی تھی۔ ملک ظفر حسین کی آنکھوں سے تواتر کے ساتھ آنسو بہہ رہے تھے۔ آواز تو جیسے حلق کے اندر سلب ہو چکی تھی۔ ان کے پیچھے آنے والی گاڑیاں رُک چکی تھیں۔ سبھی دوڑے پجارو کی طرف، ہر شخص گنگ ہو چکا تھا۔ بے یقینی کے عالم میں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور پھر اچانک ایک کہرام مچ گیا۔ سب لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کوئی پجارو سے ٹکریں مار رہا تھا، کوئی سر ماتھا پیٹ رہا تھا۔ شاہ نواز نے ملک مصطفیٰ علی کو اطلاع دے دی تھی۔

مراد محل اور لال حویلی میں بھی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ ریاست کے تمام لوگ بے یقینی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ کیا ملک عمار علی انتقال کر گئے ہیں...... جہان آباد میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

مہر النساء فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بڑے برآمدے میں بیٹھ جاتی تھیں۔ جہاں سے حویلی کا کچا صحن وسیع و عریض لان اور لنگر خانہ واضح دکھائی دیتے تھے۔ سیدھے ہاتھ چار شہتیروں پر لنگر خانہ تھا۔ مہر النساء صبح کی تسبیحات برآمدے میں بیٹھ کر پڑھتی تھیں۔ تخت پر بیٹھ کر وہ اس وقت تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ شکور جو صبح صبح بھینسوں کا دودھ اندر لاتا تھا، بھاگتا آیا اور تخت پر بیٹھی مہر النساء کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے ماتھا پیٹ رہا تھا۔

''کیا ہوا محمد شکور۔'' مہر النساء نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''بڑی ملکانی جی وہ چھوٹے ملک......'' شکور ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

''شکور کیا ہوا چھوٹے ملک کو؟'' تسبیح اُن کے جھریوں بھرے ہاتھوں میں کانپی۔

''دل کا دورہ پڑھنے سے چلے گئے۔''

''کہاں چلے گئے؟ شکور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تم رو کیوں رہے ہو اور عمار علی کہاں چلا گیا ہے۔'' وہ تیز آواز میں دھاڑ کر چیخیں۔ وہ زندگی میں آج پہلی بار اتنی اونچی آواز میں بولی تھیں۔

''ملکانی جی ہمارے چھوٹے ملک ہمیں چھوڑ کر اللہ کے پاس چلے گئے۔''

سھرائی ماسی جو لنگر خانے میں صبح کی چائے بنا رہی تھی۔ شکور کے رونے کی آواز سُن کر تیزی سے برآمدے میں آئی۔ اُس کے پیچھے حمیدو بھی آ گئی۔ مہر النساء پھٹی پھٹی سا کن آنکھوں سے روتے بلکتے شکور کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ تو بت کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔

''کیا ہوا شکورے۔'' ماسی سھرائی اور حمیدو کی اکٹھی آوازیں نکلیں۔

''ملک عمار علی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گئے۔'' مہر النساء نے شکور کو گھورا جیسے کہہ رہی ہوں تیرے منہ میں خاک۔ گاؤں کی عورتیں لڑکیاں روتی، مراد محل میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایک کہرام مچ گیا تھا۔ مراد محل کے اونچے گنبدوں والی حویلی کے در و بام ہل گئے تھے۔ یہ عالی شان بڑی حویلی جیسے کھڑے قد سے زمین بوس ہو گئی تھی۔ بڑی بوڑھیاں ناسمجھ عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

مہر النساء تب سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ایک آنسو نہ گرا۔

''ملکانی جی! آپ کے عمار علی مر گئے ہیں۔ اور آپ یوں چپ چاپ بیٹھی ہیں۔'' عمر رسیدہ بھاگاں مائی

مہر النساء کے کندھے ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مہر النساء یوں ہی بیٹھی، روتی بین کرتی عورتوں کو دیکھتی رہیں۔ آس پاس رہنے والے گاؤں سے بھی ان کے رشتے دار آچکے تھے۔

خواتین دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں ہر آنکھ اشکبار تھی۔

ملک عمار علی کی میت اُن کے قریبی رشتے دار حویلی کے اندر لا رہے تھے۔ بہت مزارعے ریاست کے لوگ مردان خانے میں جمع تھے۔ جن کی چیخ و پکار کی آوازیں حویلی کے ہر ہر در سے نوحہ کناں صورت میں ٹکرا رہی تھیں۔

ملک عمار علی کی ڈیڈ باڈی برآمدے میں آچکی تھی۔ سھرائی ماسی اور حمیدو نے پہلے ہی رنگین پایوں سے مرصع پلنگ تخت پوش پر بیٹھی مہر النساء کے نزدیک بچھا دیا تھا۔ جس پر سنبل کے نرم گدے پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ ملک عمار علی کو بان کی کھردری چارپائی سے اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا گیا اور پلنگ اس بدنصیب ماں کے مزید نزدیک کر دیا گیا۔ مہر النساء اب بھی سپاٹ آنکھوں میں بے یقینیا لیے ٹکر ٹکر ملک عمار علی کو دیکھ رہی تھیں۔ جن کی پیشانی پر کثرت سے کیے گئے سجدوں کی وجہ سے محراب کا نشان اور روشن دکھائی دے رہا تھا۔

چہرے کی مسکراہٹ اور گہری ہو چکی تھی، شہد آگیں آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ جیسے گہری نیند سو رہے ہیں۔ ایسی نرمی سے اُن کی مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھیں بند تھیں، جیسے ابھی ماہین آئے گی تو اُس کے اٹھانے پر فوراً اُٹھ جائیں گے۔

چھاموا اپنے ننھے منے ہاتھوں میں اُن کے پاؤں دبوچے گا تو تب ضرور جاگ جائیں گے۔ حسان علی ایسے ہی کرتا تھا۔ اٹھتا گرتا، سوئے ہوئے ملک عمار علی کے بیڈ کے قریب آتا اور اُن کے پاؤں اپنے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑنا چاہتا۔ ایک سالہ حسان علی کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ تب وہ اپنے کچھ کچھ نکلے دانت ملک عمار علی کے پیروں پر مارتا...... غاں...... غوں...... با...... بابا...... غا...... ما...... ماں...... کی آوازیں نکالتا۔ مسکراتے ہوئے ملک عمار علی نہایت عجلت میں اٹھتے۔

''ٹھہر تو جا!'' کہتے ہوئے چھامو کو اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں چھپا لیتے۔

''اب بتا چھامو ذرا دانت کاٹ مجھے، بول...... بولو چھامو۔'' وہ زور سے ہاتھ پاؤں چلاتا اور خوش ہوتا۔

''باپ بیٹا مجھے سونے دو گے یا نہیں۔'' ماہین چہرے پر تکیہ رکھے رکھے بولتی۔ مسکراتے ہوئے ملک عمار علی چپکے سے حسان علی کو ماہین کی طرف دھکیل دیتے۔

''ما...... ماں...... اماں۔'' وہ منہ کے بل ماہین پر جا گرتا۔

''بیگم صاحبہ اب سو لو، صاحب زادے آپ کو اُٹھا کر ہی رہیں گے۔''

لیکن اب حسان علی کے اٹھانے سے بھی ملک عمار علی نے نہیں اُٹھنا تھا۔ حکمِ ربی یہی تھا۔ مہر النساء اب بھی اسی پوزیشن میں بیٹھیں اپنے چھتیس سالہ کڑیل بیٹے کے لاشے کو گھور رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ میں لرزتی تسبیح کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔

''بھرجائی جی عمار علی مر گیا ہے۔ کیا آپ نہیں جانتیں۔'' قاسم علی کے چچا زاد نذر علی مہر النساء کے قریب آ کر کہہ رہے تھے۔

''آہستہ بولو نذر علی امیر اعمار علی سو رہا ہے۔ دیکھو تو وہ کتنی گہری نیند میں ہے۔ اُن سب کو بھی منع کرو۔ یہ عورتیں کیوں رو رہی ہیں۔ شور نہ کرو۔''

''بھر جائی جی جتنا بھی شور ہو جائے عمار علی اب نہیں اُٹھے گا۔ یہ مر گیا ہے۔ آپ کیسی ماں ہیں۔ آپ کا بیٹا مر گیا ہے اور آپ کی آنکھیں خشک ہیں۔''

''ملکانی جی چھوٹے ملک مر گئے ہیں! آپ کو کیوں نہیں پتا چل رہا یہ ابھی چلے جائیں گے۔ وڈے ملک قاسم علی کے پاس۔'' صاباں مائی بین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ لیکن مہر النساء صورتیں پڑھ پڑھ کر ملک عمار علی پر پھونکتی رہیں۔ لال رنگ کی کم خواب کی چادر ملک عمار علی پر ڈال دی گئی تھی۔ ملک شاہ جہان کی یہ قدیم حویلی عورتوں سے بھر چکی تھی۔ آس پاس کے دیہاتوں اور شہر میں ملک عمار علی کے انتقال کی خبر پھیل چکی تھی۔ لوگ جوق در جوق بھاگے آ رہے تھے۔ جہاں تک نظر اُٹھتی لوگ ہی لوگ دکھائی دیتے۔ جہان آباد کی فضا افسردہ تھی۔ بچہ بچہ اُداس تھا۔ ابھی تو یہاں کے باسی ملک قاسم علی کو نہیں بھولے تھے۔ ملک قاسم علی کے جانے کے بعد ملک عمار علی نے گاؤں والوں کو شفیق، مہرباں حاکم بن کر دکھایا تھا۔ وہ پورے گاؤں کے سربراہ تھے۔ کسی کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا فوراً منشی یا کاردار پہنچ جاتے مدد کے لیے۔ کنو کا آدھا باغ گاؤں والوں کے لیے وقف تھا۔ ایک ساتھ پھل اُتارا جاتا تو ہر ہر گھر میں پچاس کنو کی ڈھیری تقسیم کی جاتی۔ آج جہان آباد کا ذرہ ذرہ اُن کے سوگ میں نڈھال تھا۔ قیامتِ صغریٰ کا عالم تھا۔

ملک مصطفیٰ علی اور ماہین ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ لوگ حیرت میں تھے۔ کیا ملک عمار علی فوت ہو گئے۔ ایسا تذکرہ کرنا بھی سب کو عجیب لگ رہا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی اور ماہین ابھی پہنچے تھے۔ امل ابھی راستے میں تھی۔

صدمے سے ملک مصطفیٰ علی اور ماہین نڈھال تھے۔ ملک مصطفیٰ علی نے جب اپنے باپ جیسے بھائی کو اس حالت میں دیکھا تو صبر کی طنابیں چھوٹ گئیں۔

''لالہ میں آ گیا ہوں۔ اُٹھ جائیں بہت سو لیا اب بس کریں، آپ کا چھاموآیا ہے اُسے تو دیکھیں۔ آپ کو کیسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میرے بھائی! میرے ماں جائے! مذاق بہت ہو گیا۔ اب اُٹھ جائیں۔ ہمیں نہ ستاؤ لالہ اُٹھ جاؤ۔ خدا کے واسطے اٹھ جاؤ۔ چھامو تم اپنے بابا کو اٹھاؤ۔''

ملک مصطفیٰ علی عمار علی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے بلک بلک کر دھاڑیں مار رہے تھے۔

''ماں جی دیکھیں تو آپ کا راج دلارا بیٹا ہمیں کتنا تنگ کر رہا ہے۔ لالہ میرے یار! میرے سنگی! میرے بھائی! ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ماہین دیکھو تمہارا عمار علی نہیں اُٹھ رہا۔''

اِس وقت نڈھال سی ماہین بت بنی عمار علی کے سامنے کھڑی تھی۔ بے آواز آنسو اُس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ دریاؤں جتنا پانی اُس کی آنکھوں میں کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ دل میں کہہ رہی تھی۔

''عمار میں آپ کو بہت ستاتی تھی ناں! میں نے بار بار آپ کا دل دکھایا۔ آپ کو رنجیدہ کیا۔ اسی لیے ایسی سزا آپ نے میرے لیے تجویز کی ہے۔ اب میں بھی تمام عمر آپ کے لیے اسی طرح تڑپتی رہوں گی جس طرح آپ میرے لیے دکھی ہوتے تھے۔ آپ کو پکارتی رہوں گی اور آپ بے اعتنائی برتتے ہوئے میری پکار کا جواب نہیں دیں گے۔ مڑ کر میری جانب نہیں دیکھیں گے۔ عمار کبھی کسی شوہر

نے اپنی بیوی کو اتنا نہیں چاہا ہوگا جس قدر آپ نے مجھ سے محبت کی۔ اب آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ کیسی سزا آپ نے میرے نصیب میں لکھ دی ہے۔ اس بچے کا کیا قصور ہے جو ابھی تک اِس دنیا میں آیا نہیں۔ کیا وہ پیدائشی یتیم کہلائے گا۔ میرے مالک! ہم اتنی بڑی آزمائش کے قابل تو نہیں تھے۔ اللہ پاک میں نے ابھی ابھی تو عمار کے ساتھ زندگی کو جینا شروع کیا تھا۔ اتنی کم زندگی لے کر وہ اس دنیا میں آئے تھے۔ ابھی تو ان کا چھا مو ایک سال کا ہے اور دوسرا، ابھی دنیا میں آیا ہی نہیں اُس کے آنے سے پہلے اُس کے باپ کو بلا لیا۔''

اچانک سے دل دہلا دینے والی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ امل ملک مصطفیٰ علی کے گلے لگی ہوئی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں تڑپ تڑپ کر چیخ رہی تھی۔ دلخراش چیخوں سے امل کا گلا کٹ رہا تھا۔

''میرا بھائی...... میرا بھائی، جہان آباد کے لوگوں میرا لالہ مر گیا۔ میں آج دوسری بار یتیم ہو گئی۔ میرا باپ جیسا بھائی مر گیا۔ یہ تو سوئے ہوئے ہیں اُٹھ جاؤ لالہ۔ خدا رسول ﷺ کا واسطہ ہے میرے بھائی اُٹھ جاؤ ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ آپ کے بنا ہم کس کام کے ہیں۔'' امل ملک عمار علی کو دونوں کندھوں سے پکڑے جھنجوڑ رہی تھی۔ تب ایک عورت نے امل کے سر پر دلاسے بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں صبر کرتے ہوئے اللہ کی رضا ماننی ہوگی۔''

''پھوپی ماں عمار سے کہیں اُٹھ جائیں یہ اتنی دیر تک کبھی نہیں سوئے۔'' ماہین مہر النساء کے گلے لگی سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ماہین میں تو کب سے تیرے عمار علی سے کہہ رہی ہوں بہت سو لیا اب اُٹھ جاؤ لیکن یہ آج ہماری کوئی منت سماجت نہیں سُن رہا۔'' نڈھال سی مہر النساء ٹوٹے پھوٹے لہجہ میں بولی تھیں۔

''بھرجائی جی آج یہ کسی کی نہیں سنے گا۔ آپ سب اسے اللہ کے سپرد کر دیں اب وہی اس کی مدد کرے گا۔ انشاء اللہ خدا میرے عمار علی کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا۔ نذر علی تم بھی اللہ سے اس کی مغفرت کی فریاد کرو۔ اس نے ہمیشہ اللہ کے ہر حکم کی اطاعت کی۔ اللہ کی فرمانبرداری کی پوری کوشش کی۔ یہاں موجود لوگوں سے پوچھ لو آج تک عمار علی نے کسی سے تلخ کلامی نہیں کی۔ آنے والے سائل کو یوں روانہ کرتے کہ اُن کے دوسرے ہاتھ کو بھی پتا نہ چلتا۔'' ملک نذر علی عمار علی کے یخ بستہ گالوں پر ہاتھ لگاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

''عمار پتر جانے کی تو ہماری باری تھی تم چلے گئے۔'' ایک سالہ حسان علی ماں کے گلے لپٹا ہوا۔ رش و شور دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔ امل کی حالت بہت بری تھی۔ یہ کیسا دن چڑھا تھا۔ جس نے سب کو اشکبار کر دیا تھا۔ گزرتے لمحے اُداسی میں سسک رہے تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ آج پروائی (ہوا) میں وہ شگفتگی نہیں تھی۔ اُس کا وجود بھی سلگ رہا تھا۔ سرسراتی ہوا کے دوش پر ایک دوسرے کے پیرہن سے چمٹے پتیوں کی نوحہ کناں سرگوشیاں اُبھر اُبھر کر ڈوب رہی تھیں۔ آج سورج آسمان کے سینے پر براجمان تو تھا لیکن بادلوں کی اوٹ سے نکل نہ پا رہا تھا۔ آج جہان آباد کی انچ انچ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اب جہان آباد کے ملک عمار علی کا وقتِ رخصت آن پہنچا تھا۔ روکنے والے تو بہت تھے لیکن وہ رُک نہیں سکتے تھے۔ اُس دیس جانے والوں کو کہاں روکا جا سکتا ہے۔ انہیں تو ہر صورت جانا ہی ہوتا ہے۔ ملک عمار علی بھی رُکنے

والے نہیں تھے۔ اُنہیں اپنے اصلی گھر جانا تھا جہاں کے وہ مکین تھے۔ یہاں تو تھوڑے عرصہ کے لیے آئے تھے۔ وہاں جانے کے لیے سامان انہوں نے بہت پہلے سے جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ رب کائنات کے حکم کو بجالاتے ہوئے اُس کی فرمانبرداری میں جو سامان اکٹھا کرتے رہے، ساتھ ساتھ بھجواتے رہے۔ اب تو انہیں چند گز سفید چادر کے لباس میں یہاں سے جانا تھا۔

اس وقت ملک مصطفیٰ علی کی حالت بہت خراب تھی۔ انہیں کوئی ہوش نہیں تھا۔

''ماں جی اپنے گبرو پتر کو آخری بار مل لیں اُس نے اب لوٹ کر نہیں آنا۔ یہ بابا جان کے پاس جارہے ہیں۔'' ملک مصطفیٰ علی ساکن بیٹھی ماں جی کے گال تھپتھپا کر کہہ رہے تھے۔ اماں جی اُٹھ جائیں اور آخری بار لالہ کو دیکھ لیں، مل لیں۔ اُن کا آپ کو الوداع کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ ماں جی کہیں تمام عمر یہ کسک آپ کے دل میں نہ رہ جائے کہ آپ نے آخری بار اپنے سوہنے پتر کا ماتھا نہیں چوما۔'' ملک مصطفیٰ علی نے بمشکل مہرالنساء کو تخت پوش سے نیچے اُتارا اور سہارا دیتے ملک عمار علی کے پلنگ کے نزدیک لے آئے۔ لوگ خود بخود پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

''عمار علی میں کیسے یقین کرلوں۔ پتر شام ہونے والی ہے، اب اُٹھ جاؤ۔ عصر اور شام کے درمیان نہیں سونا چاہیے۔ تُو ہی تو یہ کہا کرتا تھا۔ جیون جوگے (زندہ رہنے والے) اُٹھ جا! دیکھ تو تیرا حسان کب سے تجھے اُٹھا رہا ہے۔'' مہرالنساء نے نرم پوروں سے اُن کے ٹھنڈے یخ گال چھوئے پھر پوری ہمتیں اکٹھی کر کے اپنے لرزتے نحیف الوداعی ہونٹ ملک عمار علی کی روشن پیشانی پر رکھ دیے۔ پھر اُن کی پیشانی پر نمایاں محراب پر اپنی کمزور انگلیاں لگا کر آنکھوں سے لگالیں تو مہرالنساء کی آنکھوں سے ایسا بپھرا آنسوؤں کا ریلہ پھوٹا جس پر کوئی بند نہیں باندھ سکتا تھا۔ فرش پر اک بدنصیب لاغر ماں کا وجود پڑا کانپ رہا تھا۔ اور اُن کے لاغر ہاتھ، ملک عمار علی کے چہرے کو چھو رہے تھے۔ غلافِ کعبہ کے چند سیاہ دھاگے اُن کی آنکھوں پر پلکوں کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ جو ملک عمار علی کی بند آنکھوں کو قدرتی چمک وانوکھی سج دھج عطا کر گئے تھے۔

مہرالنساء کا سکتہ ٹوٹا تو آنسوؤں نے آنکھوں کی ندی کو جل تھل کر دیا۔ درختوں پر تیزی سے جھکتے غمگین وپُر ملال سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

سورج کا انگارے کی شکل کا بڑا سا گولا اپنی لالی دور تک پھیلاتا آہستہ آہستہ اُفق کے پار اپنی بنفشی کرنیں دھرتی کے کشادہ سینے پر اپنا لمس چھوڑ رہی تھیں۔ جب جہان آباد کا سردار یہاں کی رعایا کا باپ گاؤں والوں کو یتیم کر کے جا رہا تھا۔ کسی کی آہ و پکار ملک عمار علی کو نہ روک سکی۔ ان کے دادا ملک مراد علی کا انتقال بھی ہارٹ اٹیک سے ہوا تھا۔ ملک قاسم علی کو بھی دل کا دورہ پڑا تھا۔ اب ان کی تیسری پیڑھی کے ولی عہد ملک عمار علی بھی دل کے دورے سے چل بسے تھے۔

ملک عمار علی جس کی وجہ سے کئی گھروں کے ٹھنڈے چولہے جلنے لگے تھے۔ اب اپنے حصے کا دانہ پانی سمیٹ کر اس دنیا کے تمام کھاتے بے باک کر کے جا رہا تھا۔ اپنے اصلی سفر پر نہ ہی انہیں جوان بیوی کی سسکیاں روک سکیں۔ نہ چھوٹا بھائی اپنا مضبوط بازو ٹوٹ جانے پر، واسطہ دے کر روک سکا نہ اکلوتی عزیز از جان بہن کی دریا بنتی آنکھیں اُنہیں روک سکیں۔ نہ ہی ایک سالہ چھاموکی حیران آنکھیں اُنہیں

منا سکیں، نہ ہی نحیف ماں کا زخمی دل، ان کا بڑھاپا، اُن کی بیوگی ملک عمار علی کو روک سکی۔ جانے کی عمر تو ماں کی تھی پر جوان بیٹا چلا گیا۔ اگر اُن کا بس چلتا تو بیٹے کی جگہ خود چلی جاتیں۔ جو سچے رب کا حکم وہی بندے کے لیے لازم، صبر تو ہر صورت آ جاتا ہے لیکن اس کے لیے طویل مدت و عمل کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے۔ وقت بڑا مسیحا ہے، وہ اپنی مرہم کے پھائے سے گہرے زخم بھی مندمل کر دیتا ہے۔

مہر النساء نے ایک گہری چپ سادھ لی تھی۔ ہر وقت جائے نماز پر بیٹھی عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتیں۔ تخت پوش پر بیٹھی تسبیح پڑھتیں۔ وہ ٹکر ٹکر حویلی کے صدر دروازے کی طرف دیکھتی رہتیں۔ اُنہیں لگتا ابھی ملک عمار علی حویلی کے اس لکڑی کے دروازے سے نمودار ہوں گے۔ اُن کی نگاہیں بدستور ماں جی پر گڑی ہوں گی۔ ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ سجائے تیز تیز ڈگ بھرتے برآمدے کی ٹائلز کی چوڑی سیڑھیاں چڑھتے اُن کے قریب آئیں گے۔

''السلام علیکم ماں جی!'' وہ اُن کے کمزور ابھری نسوں والے دودھیا ہاتھ جن میں ہمیشہ فیروزے کی دو انگوٹھیاں سجی رہتی تھیں۔ ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگائیں گے۔ تب ماں جی دبی دبی مسکراہٹ چہرے اور آنکھوں میں سجائے۔ اُن کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتی رہیں گی۔ عمار علی نے نہ آنا تھا، نہ وہ آئے۔ کئی لوگ اس دروازے سے حویلی میں داخل ہوتے جس کا مہر النساء کو انتظار رہتا وہ نہ آیا۔ اُن کی آنکھوں کی جوت ماند پڑنے لگی۔ ماہین زبردستی انہیں اُن کی خواب گاہ میں لے آتی۔ انہیں چند لقمے کھلاتی اور دوا دے کر بستر پر لیٹا دیتی۔ تب ماہین اُن کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے اُداسی سے مسکراتی اور اُن کے ساتھ بیڈ پر لیٹ جاتی اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی، دوسرے ہاتھ سے اُن کا کندھا تھپتھپاتی رہتی جیسے کسی ضدی بچے کو ماں محبت سے سنبھالتی ہے۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی کو اب زیادہ تر جہان آباد میں رہنا پڑتا تھا۔ پہلے تو ملک عمار علی نے یہاں کے تمام معاملات سنبھال رکھے تھے۔

جہان آباد فوڈز فیکٹری کی ذمے داری فی الحال زیدی صاحب کے سپرد کر دی تھی۔ زیدی صاحب قابلِ اعتبار شخصیت تھے، جو ملک مصطفیٰ علی کو کبھی مایوس نہیں کر سکتے تھے۔ بلال حمید پر بھی انہیں بھروسا تھا۔ ہر چیز کا لمبا چوڑا سلسلہ وہی تو سنبھال رہا تھا۔ بلال حمید اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ جب کوئی بھروسہ کرتا ہے تو اُس کے اعتماد کو بحال رکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ بلال حمید کو اب کسی قسم کا لالچ طمع نہیں تھا۔ وہ خدا کی رضا پر راضی وشا کر تھا۔ زیادہ کی حُب اب اُس کے دل میں نہیں رہی تھی۔ ہر رات وہ پیٹ بھر کر سوتا تھا کیا یہ کم کرم تھا پروردگار کا اُس پر۔ پھر وہ زیادہ کا حرص کیوں کرتا۔

☆......☆......☆

جس صبح ملک عمار علی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اُم فروا نماز کے بعد قرآن پاک پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔ ہاتھ میں تسبیح پکڑے صحن میں آ گئی۔ نہ سمجھ آنے والی بے کلی چھا رہی تھی اُس کی طبیعت پر۔ یہاں بھی اُسے بے قراری رہی تو نپے تلے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ تسبیح اب بھی اُس کے ہاتھ میں لپٹی تھی۔ موبائل اسکرین پر ملک مصطفیٰ علی کا نام چمک رہا تھا۔ یا اللہ خیر اتنی صبح صبح اُن کا فون؟

سلام کرنے کے بعد اُمِ فروا نے عجلت سے پوچھا۔

''خیریت آج آپ نے صبح صبح فون کیا ہے۔''

''اُمِ فروا عمار لالہ کو ہارٹ اٹیک کا شدید حملہ ہوا ہے۔ میں اور ماہین ابھی ابھی جہان آباد کے لیے نکل رہے ہیں دعا کرنا اللہ پاک میرے بھائی کو بڑی زندگی دے۔''

فون بند ہو چکا تھا۔ اُمِ فروا پریشان ہو گئی تھی۔ وہ دیر تک ملک عمار علی کے صحت یاب ہونے کی دعائیں کرتی رہی۔

''ملک مصطفیٰ علی اپنے بھائی کی وجہ سے بہت پریشان معلوم ہو رہے تھے۔ اُمِ فروا پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ہر ہر پل اُس کے دل سے عمار علی کی دراز زندگی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ آج اُس نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ بے بے جی فکرمندی سے اُسے دیکھتی رہیں۔ آخر وہ بول ہی پڑیں۔

''اُمِ فروا ناشتا کیوں نہیں کر رہی ہو؟''

''بے بے جی دل نہیں چاہ رہا۔''

''بچے خالی پیٹ رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ نیم گرم دودھ کا ایک گلاس لے لو۔'' بے بے جی کا دھیان مسلسل اُمِ فروا کی طرف تھا۔

''دودھ تو نہیں چائے لے لیتی ہوں۔ اُمِ زارا مجھے چائے دے دو۔''

''یہ لیں آپی! اُمِ زارا نے کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ گرم چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے اُس کا دماغ ملک عمار علی کی طرف ہی اٹکا ہوا تھا۔ وہ بے بے جی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی ورنہ وہ پوچھتیں۔ تمہیں کس نے بتایا تو وہ کیا جواب دیتی۔ وہ منتظر رہی ملک مصطفیٰ علی کے فون کی کہ وہ عمار علی کی بابت اُسے بتائیں گے کہ وہ اب خطرے سے باہر ہیں۔

ظہر کی نماز پڑھ کر مولوی صاحب مسجد سے آئے تو پریشان تھے۔ مولوی صاحب برآمدے میں چارپائی پر آ کر بیٹھ گئے۔

''مولوی صاحب خیریت تو ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' بے بے جی اُن کی جانب متوجہ ہوئیں۔ داڑھی پر وہ بے چینی سے ہاتھ پھیر رہے تھے۔ قریب بیٹھی اُمِ فروا کی سانسیں رُکی جا رہی تھیں۔ مولوی صاحب کی آنکھوں میں اُداسی تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے ملک مصطفیٰ علی کا فون آیا تھا۔''

''خیریت۔'' بے بے جی فوراً سے پہلے بولیں۔

''اُن کے بڑے بھائی ملک عمار علی کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''اِنا للہ وِ انا الیہ راجعون۔'' بے بے جی نے با آواز بلند پڑھا۔ قریب بیٹھی اُمِ فروا نے بھی دل میں پڑھا۔ اچانک سے اس پر نقاہت طاری ہو گئی تھی۔ ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ وہ بمشکل اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ بے حد افسوس ہوا تھا اُسے۔ جانے ملک مصطفیٰ علی کی کیا حالت ہو گی۔ اُن کی بیوی اور ماں کس کرب سے گزر رہی ہوں گی۔ میرے رب رحم فرما۔ اُمِ فروا کا دل پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ وہ ایسا کیوں محسوس کر رہی تھی؟ اُس کا اُن سے کیا واسطہ تھا؟ وہ ملک مصطفیٰ علی کے بھائی تھے۔ شاید اس وجہ

سے وہ اس حد تک افسردگی میں تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ بے اطمینانی اُس کے روم روم میں اُتر رہی تھی۔ اُس نے قرآنِ پاک کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

دو دن بعد اُمِ فروا کو ملک عمار علی کا فون آیا تھا۔ ''اُمِ فروا میں نے مولوی صاحب کو اطلاع دے دی تھی آپ کو پتا چل گیا ہوگا۔ عمار لالہ کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''جی پتا چل گیا تھا۔ بہت افسوس ہوا ہے۔'' اس کی آواز میں اضمحلال تھا۔

''خدا کا یہی حکم تھا۔'' وہ اُداس تھے۔

''اللہ پاک انہیں اپنے جوارِ رحمت میں انشاء اللہ بہترین مقام عطا فرمائے گا۔''

''آمین۔'' یک بارگی ملک مصطفیٰ علی کے ہونٹوں سے پھسلا۔

''اُمِ فروا خدا سے ہم سب کے لیے صبر کی دعا ضرور کریں۔''

''کیوں نہیں۔'' وہ بولی۔ فون بند ہو چکا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کی اُداس آواز نے اسے بھی افسردہ کر دیا تھا۔ اُن کا کم سن بچہ، جوان بیوی اور آنے والا بچہ جو یتیمی کے ساتھ دنیا میں آئے گا۔ اللہ پاک غیب کا علم تُو ہی جاننے والا ہے۔ تیرے حکم کے سامنے کسی کی کیا مجال۔''

کافی دن گزر گئے ملک مصطفیٰ علی کا کوئی فون نہ آیا۔ وہ غیر ارادری طور پر اُن کے فون کی منتظر رہی۔

☆......☆......☆

مولوی صاحب اور اسماعیل بخش جہان آباد افسوس کے لیے گئے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی غم سے چُور تھے۔ مولوی صاحب نے انہیں تسلی و تشفی دی تھی۔ چند آیات پڑھ کر سنائی تھیں تا کہ اُن کا رنج والم قدرے کم ہو سکے۔ ملک مصطفیٰ علی ابھی تک سنبھل نہیں پا رہے تھے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بندے کو خود ہی سنبھال لیتا ہے۔

تقریباً ایک مہینے بعد ملک مصطفیٰ علی کا فون اُمِ فروا کو آیا تھا۔ وہ بہت ٹوٹے ہوئے تھے۔ اُن کی آواز میں نوحہ کنائی تھی۔

☆......☆......☆

اِس چھوٹی سی غیر ذمے دار ماہین میں اتنا صبر کہاں سے آ گیا تھا۔ قدرت نے اُسے صدمہ دیا تو صبر کا پھاہا بھی خود ہی رکھ دیا۔ دو دن بعد ماہین کے ممی پاپا آیان اور ارسل بھی آ گئے تھے۔ فوزیہ کا برا حال تھا۔ غم سے نڈھال تھیں۔ ملک عمار علی سے اُن کے کئی رشتے تھے۔ وہ اُن کے پیارے بھائی ملک قاسم علی کا لختِ جگر تھا۔ وہ اپنی پھوپی کی گود میں بڑے ہوئے تھے۔ جو پھوپی کا راج دلارا تھا اور جب ملک عمار علی فوزیہ کے داماد بنے تو انہیں اور پیارے ہو گئے۔ ہمیشہ فوزیہ نے بیٹی ہی کو سرزنش کی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں ملک عمار علی کبھی زیادتی کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو ماہین کو ہاتھوں کا چھالا بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ ماہین کی بے اعتنائی کڑوی ترش باتیں ہنس کر درگزر کر جاتے۔ کیونکہ ماہی اُن کی شریکِ حیات تھی۔ اُن کی پیاری پھوپی کی بیٹی تھی۔ اُن کی ماں جی کی بھتیجی تھی۔ باپ کی بھانجی تھی۔ بھلا ملک عمار علی اِس لڑکی سے اتنے رشتے رکھتے ہوئے اُسے کیسے دکھی کر سکتے تھے۔

ملک عمار علی کے ساتھ گزرا ایک ایک پل ماہین کو یاد آتا۔ وہ شکیل و وجیہہ، وہ خوبصورت باتیں کرنے

والا، ماہین کی محبت میں جذبات سے لدی آنکھوں والا، ماہین کی محبت میں دہکتے لمحوں میں اپنی ہستی ماہین کے نام انتساب کرنے والا۔ ملک عمار علی اپنی بے کراں یادیں اسے سونپ گئے تھے۔

اپنے دو بچے اس کی سپردگی میں دے گئے تھے۔ جن میں سے ایک کو انہوں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ الٹرا ساؤنڈ میں یہ تو ملک عمار علی کو پتا چل گیا تھا دوسرا بھی اُن کا بیٹا ہے۔ ماہین کے پاس اب اُن کی یادوں کے سوا تھا ہی کیا۔ ماہین جب انہیں سوچنے بیٹھتی تو خود سے شرمندہ ہوتی۔ اُن کی بے انتہا محبتوں کے باوجود میں اُن سے بے رخی برت جاتی تھی۔ بار بار انہیں ہرٹ کرتی۔ وہ مسکرا کر اگنور کرتے ہوئے ٹاپک بدل دیتے۔ اُن کی محبت کی وارفتگی میں تب بھی فرق نہ پڑتا۔ میں ہی اُن جیسے شریف اور محبت کرنے والے شخص کی قدر نہ کرسکی۔ اسی لیے تو خدا نے میری ناقدری کی مجھے اتنی بڑی سزا دی ہے۔ کاشان احمد تمہاری ممنون ہوں۔ درِشہوار تمہاری شکرگزار ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے سمجھایا۔ خدا کا صد شکر میں سدھر گئی۔ میں عمار سے محبت کرنے لگی۔ اکثر یہ احساس عمار کی آنکھوں میں غرور و گھمنڈ بھر دیتا کہ اُن کی ماہین اُن کی جانب لوٹ آئی ہے۔ مختصر وقت جو اس کی زیست کا بہترین وقت تھا اُس نے عمار علی کے ساتھ بتایا تھا۔

مالک تیرا بہت شکر ہے جاتے ہوئے عمار مجھے چھاموکی صورت دنیا کی سب سے بڑی دولت سے نواز گئے۔ میں ہی غلط تھی۔ عمار بہت اچھے تھے۔ میں نے اُن کی قدر نہ کی اس لیے وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ بچوں کی صورت جینے کی وجہ مجھے دے گئے۔ عمار آپ نے اور میرے رب نے مجھے اپنا مقروض بنالیا۔

نماز تو وہ پہلے بھی پڑھتی تھی اب زیادہ خضوع وخشوع سے پڑھنے لگی تھی۔ راتوں کو اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس کی نیندیں ملک عمار علی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے اب تہجد پڑھنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

بلال حمید نے ملک مصطفیٰ علی سے نورین کے متعلق تفصیل کے ساتھ بات کی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی نورین کو جانتے تھے کیونکہ وہ شاہ جہان فوڈز فیکٹری میں جاب کرتی تھی۔

''بلال تم نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا ہے۔ اگر واقعی تم سمجھتے ہو۔ وہ زندگی کے ہر مقام پر تمہارا ساتھ نبھا سکتی ہے تو اس سے بڑھ کر اچھی بات نہیں ہے۔ تم شادی کی تیاری کرو۔ اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ پیسوں کی فکر نہیں کرنا۔''

''ملک صاحب! ملک عمار علی کو گزرے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میں تو بس سادگی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔''

''پھر بھی بلال پیسوں کی تو ضرورت پڑے گی۔''

''ملک صاحب میری سیلری ہی کافی ہے۔''

''بلال کپڑے زیور تو تمہیں بنانے ہی ہوں گے۔''

''ملک صاحب اُم فروا کو جو زیور میں نے ڈالا تھا وہ اُس نے واپس کردیا ہے، بس وہی کافی ہے۔ کپڑوں کے چند جوڑے بھی بن جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' ملک مصطفیٰ علی نے تحفے کے طور پر کچھ رقم بلال حمید کو زبردستی تھمادی تھی۔

''ملک صاحب اِس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے ہی آپ نے میرے لیے بہت زیادہ کیا ہے۔''
''کوئی زیادہ نہیں کیا تم غیروں جیسی باتیں نہ کرو۔ ہاں سنو جو فرسٹ نمبر کی انیکسی ہے شادی کے بعد تم وہاں شفٹ ہو جانا۔ وہ انیکسی مکمل طور پر فرنش ہے۔ چند ماہ پہلے اُسے پینٹ بھی کروایا تھا۔''
''ملک صاحب شکریہ دراصل میں نے فیکٹری کے نزدیک ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا ہے۔''
''ٹھیک ہے جیسے تمہاری خوشی۔ خدا تمہیں نئی زندگی مبارک کرے۔''
اس وقت ملک مصطفیٰ علی سوچ رہے تھے کہ بلال احسان تو تم نے مجھ پر کیا ہے اُمِ فروا جیسی دولت مجھے سونپ کر۔''
''ملک صاحب ایک اور بات آپ کو بتانی تھی۔''
''بولو۔''
''فیری نیویارک شفٹ ہوگئی ہے۔ وہاں اُس کی خالہ زاد راکھی مارشل رہتی ہے۔ وہ اور اُس کا بیٹا عیسیٰ فیری کو لے گئے ہیں۔ یہاں سے اپنا سب کچھ بیچ گئی ہے۔''
''بلال یہ تو اچھی بات ہے۔ اب تو اُس کی طرف سے لگی ٹینشن بھی ختم ہوگئی۔''
''جی ملک صاحب ایسا ہی ہے۔''
ملک مصطفیٰ علی بھی فیری کے چلے جانے سے مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔

☆......☆......☆

ماہین آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ درِ شہوار اور اریبہ، اِس کے پاس جہان آباد آئی تھیں، عمار علی کے افسوس کے لیے۔ اُن کے آ جانے سے ماہین کو کافی ڈھارس ہوئی تھی۔ کاشان احمد بار بار اُسے فون کر کے تسلیاں دیتا رہا۔ وہ جہان آباد آنا چاہتا تھا لیکن ماہین نے منع کر دیا تھا۔ احمد انکل اور افرا آنٹی کے بھی فون آئے تھے۔ اسے دیر تک تشفی دیتی رہیں۔ کاشان ہر تیسرے چوتھے دن ماہین کو فون کرتا۔ نئے سرے سے اس کی ہمت بندھاتا۔ وہ کہتا۔
''ماہی تمہیں خوش ہونا چاہیے، کچھ اچھا وقت تم دونوں نے اکٹھے گزارا۔ اب یہ احساس تمہاری روح کو کچوکے نہیں لگائے گا کہ تم نے ہمیشہ عمار علی کے ساتھ اذیت ناک بے رُخی برتی۔ تمہارا بچہ ہو بہو باپ کا ہم شکل ہے۔ تم جب جب اپنے بچے کو دیکھو گی یہ احساس تمہیں تقویت بخشے گا کہ ملک عمار علی اپنا ہم شکل تمہارے پاس چھوڑ گئے ہیں۔ ماہی یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کرو۔ خدا ہمارے لیے جو کرتا ہے یہ اُس کی رضا ہوتی ہے، پھر ہم رب کی رضا کو اپنی رضا کیوں نہ بنا لیں۔''
''شان تم بہت اچھے ہو، خدا کا صد شکر اُس نے مجھے اتنے اچھے دوست عطا کیے۔''
''ماہی تم خود بہت اچھی لڑکی ہو۔ نہیں، بلکہ اب تو خاتون ہو خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔'' کاشان احمد دیر تک ماہین سے باتیں کرتا۔
اِل واپس جا چکی تھی۔ ممی پاپا بھی چلے گئے تھے۔ ماہین کی عدت کا معاملہ تھا ورنہ وہ ماہی کو اپنے ساتھ امریکہ لانے کی کوشش کرتیں۔ فوزیہ چاہ رہی تھیں کہ پاکستان واپس آ جائیں لیکن آیان اور ارسل کی پڑھائی ابھی باقی تھی۔ جاتے ہوئے وہ ماہین کے لیے فکر مند تھیں۔ وہ بار بار ممی کو تسلی دے رہی تھی۔

"پلیز ممی میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ بس آپ میرے لیے دعا کرتی رہا کریں۔ اب مجھے خود کو سنبھالنا آ چکا ہے۔ میں چھاموکی ماں ہوں۔ خدا میرے بچے کو سلامت رکھے۔ دعا کرتی رہا کریں۔ میری عدت پوری ہو جائے گی تو مصطفیٰ بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈیں گے۔ میں چاہ رہی ہوں جلد اُن کی شادی ہو جائے۔ تب میری بھی بوریت ختم ہو جائے گی۔ ویسے تمام رشتے دار ہمارا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ گاؤں کی عورتیں روزانہ آتی ہیں۔ گاؤں کی چند لڑکیوں کی شادیاں تھیں۔ جنہوں نے عمار کی وجہ سے مؤخر کر دی تھیں۔ مصطفیٰ بھائی نے اُن سب سے کہا بھی ہے کہ آپ بچیوں کا فرض ادا کر دیں۔ لیکن وہ نہیں مان رہے۔ اپنے ملک عمار علی کے صدمے میں گاؤں والے بہت دکھی ہیں۔ اب تو پھوپی ماں کو بھی مجھے ہی سنبھالنا ہے خدا مجھے ہمت دے۔"

فوزیہ ماں تھیں۔ ماہین کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ جوان لڑکی ہے، کیسے تنہا رہے گی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ کیا اُسے سکون سے رہنے دے گا؟ قدم قدم پر اُسے مشکلات کا سامنا ہوگا۔ کٹھن حالات سے نبرد آزما ہو پائے گی؟ کب تک لوگوں کی باتیں سُن سُن کر سہارتی رہے گی۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی نے اُم فروا کو بلال حمید کی شادی کے متعلق بتایا تھا۔ اُم فروا کے دل میں دور تک اِک سکون پھیل گیا تھا۔ لیکن اِک اَن دیکھی پھانس بھاری سل کی مانند اس کے دل کو جکڑ چکی تھی۔ جو اطمینان وہ محسوس کر رہی تھی یہ شاید اُسی کا ردِ عمل تھا جس سے وہ تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہوئی تھی۔ شام تک وہ نارمل ہو چکی تھی وجہ یہی تھی کہ کچھ عرصہ وہ بلال حمید کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہی تھی۔

☆......☆......☆

مہر النساء بھی ماہین کے متعلق سوچتی رہتیں۔ 'جو میں سوچ رہی ہوں اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ میری ماہین، میرا پوتا ہمیشہ میرے پاس رہیں گے۔ کیا ماہین مان جائے گی؟ اگر وہ مان گئی تو کیا مصطفیٰ علی مانے گا۔ مالک ہمارے لیے بہترین سبیل نکال۔ جو تیرا حکم وہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ تجھ سے بہتری کے خواستگار ہیں۔'

ماہین کی عدت ختم ہو چکی تھی۔ وہ چیک اپ کے لیے لاہور آئی تھی۔ عدت کے دوران وہ سرگودھا میں چیک اپ کراتی رہی تھی۔ اپنی گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر کے پاس، خادمہ گلنار اور ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ وہ ڈاکٹر صبا کے کلینک گئی تھی ماہین کا چیک اپ اور چند ٹیسٹ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صبا ملک عمار علی کی ناگہانی موت پر بہت افسوس کر رہی تھیں۔

"ماہین آپ خود کو جتنا خوش رکھیں گی، آنے والے بچے پر اچھا اثر پڑے گا۔"

اس نے اثبات میں آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دی تھی۔ ماہین سوچ رہی تھی کسی کو کیا معلوم بظاہر وہ شخص مر گیا ہے لیکن وہ میرے اندر پل پل زندہ رہتا ہے۔ میری جاگتی آنکھوں میں، میرے خیالوں میں، خوابوں کے گھروندوں میں وہ امر ہے۔ میری ہر ہر دھڑکن میں زندگی بن کر رہتا ہے۔ میں خود تو کہیں نہیں ہوں جدھر نظر دوڑاتی ہوں بس وہی ہے اس سے آگے پیچھے کچھ نہیں۔ عمار کو یاد نہ کروں؟ بھولوں گی تو ہی یاد آئے گا ناں۔' وہ اپنی مخروطی انگلیوں والے گلابی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے مسکراتی۔ اس کے خیالوں کے آبگینوں میں عمار علی جو مسکراتے تھے۔

ڈاکٹر صبا دیر تک اُسے سمجھاتی رہیں لیکن وہ اُن کی باتیں سُن ہی کب رہی تھی۔ وہ تو عمار علی کی ہمراہی میں زمرد کی سبز وادیوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لمبی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

اُم فروا کا خیال اب بھی ملک مصطفیٰ علی کا پیچھا کرتا تھا۔ اُم فروا کی عدت کب کی پوری ہو چکی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی کو طرح طرح کے وسوسے گھیرے رکھتے۔ اب مولوی صاحب اُم فروا کا نکاح کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ جلدی میں کہیں بھی اُس کی شادی کر دیں گے۔ وہ اُن کی بیٹی ہے لیکن میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔

کسی نے اُن کے اندر زور سے قہقہہ لگایا۔ جس کی کسیلی بازگشت اُن کے کانوں میں ابلتا سیال انڈیل گئی۔ اُن کے احساسات باغی ہو رہے تھے۔ اندر سے باور کرایا جا رہا تھا کہ 'مصطفیٰ تم اُم فروا کو پسند کرنے لگے ہو۔ محبت کرتے ہو اُس سے۔ لیکن کیوں؟' اس کیوں کا جواب اُن کے پاس نہیں تھا۔

لمحے سرکتے رہتے انہیں پتا نہ چلتا، ان گنت ساعتیں دبے پاؤں اُن کے قریب سے گزرتیں۔ وہ یوں ہی سجدے میں پڑے رہتے۔ وہ اپنے معبود کو منا کر پوری ایمانداری سے خود کو اُم فروا کا طلب گار کہلانے کے قابل بنانا چاہتے تھے۔ بھائی کی جدائی سوہانِ روح تھی اُن کے لیے، اللہ کے حضور پیش ہو کر سکون مل جاتا۔ بھائی کے بچھڑنے کے زخم مندمل ہونے لگتے۔ جیسے تپتی ریت پر چلتے چلتے اچانک ٹھنڈے سائے میسر آ جاتے ہیں۔

ملک مصطفیٰ علی کی روٹین تبدیل ہو چکی تھی۔ صبح کی نماز مسجد میں پڑھنے کے فوراً بعد ماں جی کو فون کرتے۔ اپنے دن بھر ہونے والی تفصیل انہیں بتاتے۔ ماں جی ریاست کو سنبھال رہی تھیں، اُن کی غیر موجودگی میں اس کی بابت بات ہوتی پھر وہ تیار ہو کر فیکٹری کے لیے نکلنے لگتے تو ماہین سے تفصیلی بات ہوتی۔ زیادہ باتیں حسان علی کی ہوتیں۔ ملک مصطفیٰ علی، ملک عمار علی کا تذکرہ کرتے ہوئے کتراتے۔ اُن کی یہی کوشش تھی ماہین جلد سنبھل جائے۔ لیکن ملک مصطفیٰ علی کو کیا پتا تھا کہ ماہین ہر لمحہ جاں کنی میں وقت گزارتی ہے۔ وہ آنسو میڈیا کا شکار ہو چکی تھی۔ کیسے اُس کے ذہن پر بر ڈن نہ پڑتا۔ ملک عمار علی اس کی ہنسی کی جھنکاریں بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ملک مصطفیٰ علی کا بس چلتا تو اس پیاری سی لڑکی کی تمام اُداسیاں اور آنسو اپنی جھولی میں ڈال لیتے۔ لیکن وہ خود بھائی کی ناگہانی موت کو سہار نہیں پا رہے تھے۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے فیکٹری جاتے تھے۔ چار بجے تک واپسی ہوتی پھر سو جاتے۔ اُمِ فروا کی ایک جھلک انہیں بے قرار کیے رکھتی لیکن ایسا کوئی اسباب نہیں بن رہا تھا کہ وہ اُسے اپنے سامنے پاتے۔

اُس لڑکی کے لیے یہ اُن کی کیسی تڑپ تھی۔ عشق تھا جو انہیں بے بس کیے جا رہا تھا۔ اُم فروا نے جب سے ملک مصطفیٰ علی کو اُن کے رب سے ملوایا تھا اپنے رب کے ساتھ ساتھ اُمِ فروا کے بھی مقروض تھے۔ اُن کا دل مچلتا اندر اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو جاتی۔

☆......☆......☆

ماں جی اب خوش رہنے لگی تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی کے اندر کی تبدیلیاں دیکھ کر، ملک مصطفیٰ علی کی لائف یکسر بدل رہی تھی۔ اب وہ بڑے بڑے اجتماعات میں جانے لگے تھے۔ خطیب کے لیکچر اُن کے دل پر گہرا اثر چھوڑتے۔ مقرر کی خوش الحانی سے پُر تقریر ہمہ تن گوش سنتے ہوئے گہرائی میں جانے کی کوشش کرتے۔ ڈائس پر کھڑے لیکچر دیتے، مقرر فرما رہے تھے۔

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے
اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ جولائی میں ملاحظہ کیجیے)

انتخابِ خاص

خالدہ حسین

زنجیر اور تالا

''اس نیلی چھتری والے کے اشارے پر کھلی میرے بھائی۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔'' تاؤ جی نے ٹوپی اتار اپنے گھنے سفید بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دوبارہ ٹوپی سر پر دھری ''جب وہ ساعت آگئی تب نہ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ آدمی خود بخود......

سوچ کے نئے در وا کرتا ایک بہت خاص انتخاب

ڈبو کی موت کا واقعہ ایک مدت تک آنے جانے والوں کو سنایا جاتا رہا۔ ایسے میں آسمان یکدم چپ سادھ لیتا۔ اس میں تیرتی چیلیں ساکت ہو جاتیں اور درختوں کی شاخیں جھک آتیں۔ سارے

میں کچھ نارنجی مائل روشنی گھلتی محسوس ہوتی اور ایک لق ودق میدان کہ جس کا اور نہ چھور' اس کی آنکھ کے سامنے کھلتا' چھپ جاتا۔ بڑا مانوس مگر گم شدہ۔ اسے اپنی بانہوں کے روئیں تک ٹک اٹھتے محسوس ہوتے۔

ڈبو بے حد ڈی کلاس کتا تھا کہ خود بخود گیٹ پر آن بیٹھنے لگا۔ ایک بار تاؤ جی نے سوکھی روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا پھر وہ اپنے مقررہ وقت پر آکر بیٹھ جاتا۔ قدرے انتظار کھنچتا پھر ایک روتی ہوئی آواز گلے سے نکالتا۔ کوئی نہ کوئی بچی کھچی روٹی لے کر دوڑتا پھر اس نے ایک ایک قدم حدود توڑنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے اس کا آسن برآمدے کی سیڑھی بن گیا۔ اب تاؤ جی' دودھ پانی میں روٹی ڈال کر دینے لگے اور برابر کی سطح پر اس سے مکالمے کی رسم ڈالی۔

''لے کھالے۔ آج تیری دعوت ہے۔ اوں ہوں۔ یہ چیچڑ کہاں سے آیا۔ بڑا آوارہ مزاج ہے۔ بھئی ہیں!''

اب وہ چمٹی سے اس کی بھوری کھال صاف کرتے نظر آتے۔ ایسے میں وہ اپنا لبوترا منہ ان کے پاؤں سے رگڑے جاتا۔ رہ رہ کے اس کی کھال میں کپکپی دوڑتی اور دم کا پنڈولم بری طرح ہلتا رہتا۔ پھر وہ خانہ باغ کے انار تلے بیٹھنے لگا۔ انہی دنوں معلوم ہوا کہ آوارہ کتوں کو مارنے کی مہم زوروں پر ہے۔ میونسپلٹی کی گاڑیاں سڑک کنارے پڑے مردہ کتوں کو لاد لاد کر لے جاتی تھیں۔ تاؤ جی نے اب ایک سستا سا چاکلیٹی رنگ کا پٹا ڈبو کے گلے میں ڈالا۔ دراصل اس پٹے کے بعد ہی اس کا نام ڈبو پڑا۔

اس کی آوارہ مزاجی سے تنگ آکر تاؤ جی نے اسے زنجیر کرنا شروع کیا۔ ہوتے ہوتے وہ تاؤ جی کے معمولات کا حصہ بن گیا۔ دن کا اکثر حصہ ڈبو بندھا رہتا۔ عصر کے بعد تاؤ جی مسجد سے لوٹتے تو اس کی رہائی ہوتی۔ کیسی کیسی الٹی چھلانگیں لگاتا۔ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر دم ہلا ہلا کے تاؤ جی کے گلے پہنچ جاتا۔ ایسے میں ہم سب ڈرائنگ روم کی جالی کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے' تاؤ جی نہایت دوستانہ لہجے میں سمجھاتے۔

''او یار' یوں نہیں کرتے۔ شاباش۔ چل ذرا گھوم پھر آ۔ جا......'' وہ دم ہلاتا گیٹ کی طرف چل دیتا آنے جانے والوں نے نخوت سے نوٹس لیا۔

''کتا پال لیا ہے۔ نجس جانور ہے۔ اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے جہاں کتا ہو۔''

''رحمت کے فرشتوں کے لیے دوسرا گیٹ ہے۔'' تاؤ جی نہایت سنجیدگی سے اطلاع دیتے۔

ڈبو کے آنے سے اتنا ضرور ہوا کہ تفریحاً گھنٹی بجا کر مانگنے والے اور گھروں کے پتے پوچھنے والے بالکل غائب ہو گئے۔ اس کی سہیلیاں پہلے فون پر اطلاع دے دیتیں۔ ''ہم آرہے ہیں وہ تمہارا ڈبو نام تو نہیں پوچھے گا؟''

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب وہ کمزور ڈی کلاس ڈبو دودھ روٹی کھا کھا کے خوب فربہ ہو گیا تھا اور اس کی کھال سفیدے کی مانند چمکنے لگی تھی اور اس کی سرمہ لگی آنکھیں' روشن' چمکتی' آپس میں جڑتی' بڑی سمجھ داری سے ہر ایک کو دیکھتیں اور بات بات کی سُن گن لیتیں۔ زور آور ایسا ہو گیا تھا کہ اکثر تاؤ جی کے قابو میں نہ آتا۔ لاکھ زنجیر کھینچتے ان کو بھی گھسیٹ لے جاتا۔ عجب عجب طرح کی آوازیں نکالنا اس کا مشغلہ بن چکا تھا۔ جس روز وہ زیادہ بدتمیزی کرتا' تاؤ جی اس کی پابندی کے وقت میں اضافہ کر دیتے۔ وہ مالی کو حکم دیتے۔ ''آج اس کو پانچ نہیں' ساڑھے پانچ کھولنا۔''

''لیو بھئی' آج تو تاؤ جی کو ناراج کر دیو۔ کیوں بھئی ڈبو۔'' مالی اپنے سیاہ چمکتے چہرے پر ذہین لمبی لمبی آنکھوں میں ہنستا۔ جب پہلے روز فریدہ نے مالی کا نام سنا تو اس کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک دہک اٹھا۔ بڑی باجی مالی سلیم کو گلِ داؤدی کے گملے رکھنے کی ہدایات دے رہی تھیں۔

''یہ تمہارے مالی کا نام سلیم ہے؟'' اس نے نہایت رنجیدہ بلکہ زخم خوردہ ہو کر پوچھا۔ ''کیوں۔ ہے تو سہی۔''

''اتنا اچھا نام...... مالی...... یہ آیا کہاں سے ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' اور واقعی انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ ان دنوں اکثر سرحد پار سے مہاجرین کسی ٹھکانے' سرونٹ کوارٹر کی تلاش میں گھر گھر گھنٹیاں بجاتے۔ مالی سلیم' ابا جی کے دفتر پہنچ گیا تھا اور وہاں سے گھر۔ دفتر اور گھر دونوں جگہ مالی گیری کرتا۔ خانہ باغ کے ساتھ ساتھ کوارٹروں کی لمبی قطار تھی۔ تعداد میں کل آٹھ کوٹھریاں تھیں۔ ایک آدھ کے سوا ساری پکی اینٹ کے فرش والی۔ ابھی تین کوارٹر خالی پڑے تھے۔ ایک میں مالی سلیم آن جما۔ وہ تنہا تھا۔ پوربی' تاؤ جی جب موڈ میں ہوتے تو اسے پورب کا بھیا کہہ کر پکارتے۔ روزانہ صبح سویرے جب اسکول بس اسٹاپ کے لیے وہ سڑک پر نکلتی۔ مالی سلیم' انتہائی سفید جگمگاتے کپڑے پہنے۔ ہاتھ میں سلور کا ٹفن کیریئر پکڑے' کام پر جارہا ہوتا۔ تنگ موری کا پاجامہ' کرتا اور صدری۔ سر پر کالی ٹوپی اور جگمگاتے جوتے۔ وہ ہرگز مالی نہ لگتا تھا۔ جب کوارٹروں کے آخر میں لگے بھوری بھینس کے چھپر میں آنا جانا ہوتا تو مالی سلیم کی کوٹھریا سب سے الگ صاف ستھری چمکتی نظر آتی۔ فرش کی سرخ اینٹیں انار کے دانوں کی طرح چمچماتیں۔ ایک طرف چار پائی پر کالا سفید ڈبے دار کھیس بچھا ہوتا۔ سامنے دیوار میں بنے طاق پر جگر جگر کرتی ایلومونیم کی پتیلیاں اور بھوری پھولدار پیالیاں۔ اسے حیرت ہوتی مرد بھی اتنے اچھے برتن دھوتے ہیں اور جھاڑ' پھر وہ گھوم کر دیکھتی مالی گھر کی دھوتی اور صدری پہنے' کھرپی لیے کیاریاں کھود رہا ہے۔ ہاتھ مٹی میں سنے ہیں۔ یہ پہلے مالی سے کتنا مختلف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد اور گٹھے جسم کا پھرکی کی طرح گھومنے والا مالی' پانچ منٹ میں ناچتا کودتا پودوں کو گنجا کیا' پانی دیا اور سائیکل پر یہ جا وہ جا۔ بڑے بھیا نے اس کے فوارے پر سفید پینٹ سے ''مالی بھمیری'' لکھ دیا تھا۔ اگلے ہی روز وہ بچوں کی بدتمیزی کا عذر کر کے چل دیا مگر یہ مالی سلیم زمین پر کیسے جمے جمے قدم ڈالتا۔ اس کی ہر حرکت میں توازن کا احساس ہوتا تھا۔ اسے فریدہ کا سوال پھر یاد آ گیا۔ ''یہ ہے کون؟''

بھری گرمیوں کی سنسان دوپہر اس کے کوارٹر سے سسکیوں کی آواز آئی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا مگر سامنے تو کھٹے کی باڑ آجاتی تھی۔ سب کمرے اندھیرے کیے سو رہے تھے۔ اس نے چپکے سے دروازے کی چٹخنی گرائی۔ لان کی سوکھی گھاس پار کرتے کرتے اس کے تلوے چلچلانے لگے۔ مالی کے کوارٹر کی دہلیز پر ململ کا دھانی دوپٹہ اوڑھے ایک سانولی سی عورت بیٹھی ہچکیاں لے رہی تھیں۔ اس کی پتلی لمبی' چٹیا کمر پر ہلکورے کے ساتھ لرز جاتی۔ بانہوں میں ہری اور بسنتی کانچ کی چوڑیاں' سیاہ لمبے بال' سیدھی مانگ۔ وہ حیرت سے کھڑی دیکھتی رہی' مالی غائب تھا۔

شام کو تاؤ جی نے بتایا' مالی سلیم کی بھانجی ہے۔ اس کا آدمی ہندوستان میں تھا' گزر گیا۔ ایک دم اس کا دل ڈھے گیا۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ کچھ لوگ اِدھر کچھ اُدھر' اتنی دور اس کی آنکھوں میں لمبی چٹیا' کمر اور سبز چوڑیاں گھوم گئیں۔ اب شاید یہ اپنی چوڑیاں توڑ دے گی۔ تو پھر مالی سلیم کے لوگ کہاں ہیں۔ وہ تنہا کیوں ہے۔ شاید اس کے سب عزیز بھی اُدھر ہی ہیں۔ وہ یہاں تنہا کیا کر رہا ہے اور پھر وہ اس کے نام پر ششدر رہ گئی۔ فریدہ کا سرخ چہرہ۔ ہاں کیا معلوم یہ کون ہے۔ یوں جما جما کر قدم دھرنے والا۔ شہزادہ سلیم۔ ان دنوں الحمراء میں انارکلی ڈرامہ اسٹیج کیا جارہا تھا۔ صاحب عالم' مہابلی' شیخو' رُلارام۔ دمدموں میں دم نہیں اب خیر مانگو۔ اے ظفر بس ہو چکی اب تیرے ہندوستان کی۔ غدر کے افسانے' شہزادی کی بپتا اس کا تصور بھٹکتا چلا گیا۔

مالی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح سفید براق کپڑوں میں چمکتا ٹفن اٹھائے کام پر جاتا۔ کیاریوں میں بیج ڈالتا' فوارے سے پانی دیتا اور تیسرے پہر اس کے کوارٹر سے کسیلا دھواں بل کھاتا' کھٹے کی باڑ کے پار اڑتا اور گول گول لہراتا فضا میں تحلیل ہو جاتا۔ لان کے پار کوارٹروں کے ساتھ

ساتھ عجب دنیا آباد تھی۔ اب ایک جانب ڈبو کا ٹھکانہ تھا۔ اسے بیری کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ کونے میں بھوری بھینس کا چھپر۔ ساتھ والے کوارٹر میں مرغیاں اور توڑی ملی جلی اور پھر آگے سب کے ٹھکانے۔ ڈرائیور عظیم جو عرف عام میں جیم کہلاتا تھا اور مالی پھر خانساماں فضل دین جو تیسرے پہر اپنا پھندنوں جڑا الغوزہ بجایا کرتا۔ شام ڈھلے کوارٹروں سے چار پائیاں باہر نکالی جاتیں۔ صاف ستھرے بستر بچھتے۔ مالی ہاتھ کی چھوٹی سے حقی پیتا۔ بند مٹھی میں وہ پراسرار حقی ہوتی وہ انگلیوں کی جھونپڑی سی بنا کر منہ کے قریب لے جاتا۔ گڑ گڑ گڑ اور پھر تھوڑا سا دھواں۔ مغرب کی اذان درختوں درختوں ہوتی برآمدے میں اترتی کوارٹروں میں لالٹینیں روشن ہو جاتیں۔ ڈبو کی عجب کیفیت تھی۔ اذان پر ہولے ہولے رونے لگتا۔ اس کے گلے سے درد سے لرزتی باریک آواز نکلتی۔ ایسے میں آس پاس گھروں کی منڈیریں اور بھی تنہا اور خاموش ہو جاتیں اور درخت سراپا سماعت' معلوم نہیں کن صداؤں کی لہریں جذب کرتے رہتے۔

وہ شدید گرمی کی شام تھی۔ درو دیوار سے آنچ اٹھ رہی تھی۔ ابھی ابھی عصر کی اذان کے ساتھ ساتھ ڈبو دھاروں دھار رویا تھا۔ ایسے میں اس کے پورے جسم میں جھرجھری اٹھتی۔ اندر فضل دین میز پر شام کی چائے لگا رہا تھا۔

''چائے...... چائے......'' چھوٹی پیالی پر چمچی کی تال بجا رہی تھی کہ اچانک سڑک پر تیز گھسٹتی ہوئی بریک لگی۔ چر ر...... ر...... کچھ وقفہ...... اور پھر رواں دواں سواریاں۔ گھر لب سڑک ہوں تو دن رات ٹریفک کا ریلا گویا گھر ہی میں بہتا ہے۔

''مگر کھلا کیسے؟ یہ تو بندھا تھا۔ اس زنجیر کے ساتھ۔'' تاؤ جی ہاتھ میں ٹوٹی زنجیر لیے کھڑے تھے۔ ''میں نے خود اپنے ہاتھوں سے باندھا تھا۔'' انہوں نے سوچتی آنکھوں سے سڑک کے پار دیکھا۔

سورج ڈوبنے کو تھا اور آسمان کناروں کناروں سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر روز ہی کی طرح اندھیرا ہوا۔ مغرب کی اذان گونجی اندھیرا پڑتے ہی مالی حقی گڑ گڑاتا تاؤ جی کے ساتھ تبادلہء خیال کرتا رہا۔

''مگر تاؤ جی۔ میں نے کھود دیکھا۔ اس جنجیر کے ساتھ بندھا تھا۔ میں ادھر درکھت تلے بیٹھا تھا۔ ایک دم جیسے کسی بلاوے پر اس نے ایک جور لگایا۔ ایسا بپھر کر جور لگایا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ مانو کسی نے کھود ہاتھ سے زنجیر کھول دی ہو۔ وہ تیر کی طریوں بھاگا۔ سیدھا اور اسی دم اُدھر سے وہ اینٹوں کا ٹرک چلا آ رہا تھا۔ مانو اسی کی کھاتر اور سیدھا۔ اس کے اوپر سے گزر گیا۔ پر میں کہتا ہوں اس کی جنجیر کس نے کھولی؟''

''اس نیلی چھتری والے کے اشارے پر کھلی میرے بھائی۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔'' تاؤ جی نے ٹوپی اتار اپنے گھنے سفید بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دوبارہ ٹوپی سر پر دھری ''جب وہ ساعت آ گئی تب نہ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ آدمی خود بخود اپنی جگہ پر کھنچا جاتا ہے۔ یہ اس وعدہ نبھانے والے کا وعدہ ہے۔ چلو اب اس زنجیر کا کیا کرنا ہے۔'' انہوں نے زنجیر ایک طرف ڈھیر کر دی۔ پھر اٹھائی۔ اسے الٹا پلٹا۔ پھر زیر لب...... ''خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل۔ تھی اسی فولاد سے شاید میری شمشیر بھی۔'' مالی مفت میں شرمندہ پشیمان' بیٹھا حقی گڑ گڑاتا رہا۔

اب مالی کی بھانجی اکثر آنے جانے لگی۔ اس کا سانولا دبلا پتلا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ کبھی وہ کپڑے دھونے والی صابن کی ٹکیہ نظر آتی۔ جو چپ چاپ گھلتی چلی جاتی ہے۔ سردیوں کے آغاز میں دھنیا آتا خالی کوارٹر میں روئی دھنائی جاتی اور پر چھت تک روئی کے گالے برف ایسے سفید' پہاڑ سا جمتا چلا جاتا۔ ادھر اس کی آواز۔ دھن۔ دھن۔ دھا۔ برابر کی چھوٹی چھوٹی آوازوں کے بعد ایک ترچھی پڑتی چوٹ۔ دھنیا مالی کا ہم وطن' پوربی تھا۔ اس کی وہ لمبی سی کمان

مہارت لیے چلتی رہتی۔ لحاف بھرے جاتے۔ روئی کو چھڑی سے برابر کیا جاتا۔ ہلکی ہلکی چوٹ سے کنارے کنارے روئی پھیلائی جاتی اور پھر مالی کی بھانجی اس کا نام مہرن۔ یقیناً مہرالنساء ہوگا۔ مہرن دالان میں فرش پر لحاف پھیلائے سر جھکائے ڈورے ڈالتی رہتی۔ کبھی اماں ادھر آن نکلتیں، باتیں کرتے کرتے مہرن کی آنکھیں یکدم جل تھل ہو جاتیں۔

''اور مالی؟ اس کا کوئی نہیں؟'' اماں نے پوچھا۔

''ماما...... مامی ہے، دو بیٹے ہیں۔ نانی بھی تھی، مر گئی۔ ایک بیٹا تو بہت بیمار رہا۔ بہت یاد کرتا تھا۔ سب لوگ بہت روتے ہیں، مامی تو بالکل......''

''چلو کبھی ان کو بھی یہیں لے آئے گا نا۔'' اماں نے تسلی دی۔

''بہت کوشش کی مگر پاسپورٹ نہیں بنتا۔ بند ہیں۔ بالکل نہیں بننے کے......''

ابا جی بھی بہت بھلکڑ تھے۔ اماں کے بار بار کہنے پر بھی مالی کا پاسپورٹ نہ بنوا سکے۔ جانے سے ایک دو دن پہلے وہ بہت سا وقت کوارٹر میں گزارنے لگا تھا۔ کبھی رات گئے اس کی گہری، کھردری آواز لہر در لہر کانوں سے ٹکراتی۔ ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے جس کے کارن میں جوگن بھئی وہی نہ جلتا ہوئے وہ جیسے کسی اونچان سے گرتی چلی جاتی۔ پھر ایک روز صبح سویرے مالی سلام کرنے کو پہنچا۔

''میاں تم بغیر پاسپورٹ کے کہاں جا رہے ہو۔ سرحد کیسے پار کرو گے۔ ابھی رکو۔ کچھ عرصے میں سلسلہ چل نکلے گا۔ بن جائے گا پاسپورٹ۔''

''جی نہیں صاحب۔ میرا دل پریسان ہے۔ لگتا ہے وہاں میری جرورت ہے۔ ان سب کی آواجیں آتی ہیں کانوں میں۔ بس ان کو لے کر آجاؤں گا اپنی اس کوٹھریا میں۔ ابھی تالا لگائے جاتا ہوں۔ تالی صاب کو تھما دی ہے۔''

یوں اس بیچ کے کوارٹر میں تالا ڈل گیا۔ زنجیر دار کنڈے میں بھاری سا لوہے کا تالا جس میں مسلسل بارش سے زنگ لگ گیا۔ چابی معلوم نہیں اماں نے کہاں ڈال دی ہوگی کیونکہ جب دوسری برسات میں سب کوارٹروں کی چھتیں ٹپکیں تو اس کا تالا تاؤ جی نے ہتھوڑے سے توڑا۔ سامنے جگمگاتی پتیلیوں پر مٹی کی تہہ جمی تھی۔ چارپائی ایک کونے میں کھڑی تھی، اس کے پائے کے ساتھ گیندے کا سوکھا ہار لٹک تھا۔ مہرن نے کانپتے کانپتے، پتیلیوں، رکابیوں، پیالیوں کے ساتھ وہ ہار بھی بوری میں ڈالا۔ چارپائی ٹھیلے پر رکھوائی۔

''ہمارے محلے کا لڑکا اور ماما ساتھ ہی تو گئے تھے مگر باڑ کے قریب سے وہ تو لوٹ آیا۔ ماما اندھیرے میں سرکا۔ تابڑ توڑ گولیاں برسائیں مگر وہ بھاگتا ہی گیا۔ آ رہا ہوں۔ آ رہا ہوں۔ وہ نیلی چھتری والا۔ ٹھیلہ جانے کے بعد تاؤ جی نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھائی۔''

وہی اشارے کرتا ہے، کبھی صدائیں دیتا ہے۔ لبیک اللھم لبیک۔ ہر جی کو وہ مزہ چکھنا ہے۔ حضرت سلیمان دربار کرتے تھے کہ ایک شخص نے باریابی چاہی۔ بلا کر تختِ شاہی پہ بٹھایا۔ وزیر بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔ نووارد اسے بہت دیر تک گھورتا رہا۔ بارے رخصت ہوا۔ وزیر نے حضرت سلیمان سے عرض کی۔ یہ شخص کون تھا جو مجھے اس بری طرح گھورتا رہا۔ حضرت نے فرمایا۔ یہ عزرائیل تھا کہ انسانی بھیس میں آیا۔ وزیر نے عرض کی مجھے اس کا گھورنا بہت برا لگا۔ آپ مجھے فلاں دور دراز کے جزیرے میں پہنچا دیجیے۔ حضرت نے اپنے ہوائی تخت پر اسے مذکورہ جزیرے میں پہنچا دیا۔ وہاں وہ شخص پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ بعد میں حضرت سلیمان سے عرض کی کہ جب میں آپ کے پاس آیا حیران تھا کہ مجھے تو چند لمحوں میں اس جزیرے میں اس شخص کی روح قبض کرنا تھی اور یہ اب تک یہاں بیٹھا ہوا ہے۔

تاؤ جی نے ڈبو کی ٹوٹی زنجیر اور کوارٹر کا تالا لپیٹ کر خالی طاق میں ڈال دیے۔

☆☆☆

دوشیزہ میگزین
رنگِ کائنات
دوشیزہ گلستاں
نئے لہجے، نئی آوازیں
یہ ہوئی نا بات
لولی وُڈ، بولی وُڈ
نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
کچن کارنر
حکیم جی!
بیوٹی گائیڈ

اسماء اعوان

فرمانِ الٰہی

(پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا (لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے) تو اللہ نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور اُن پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تا کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے، ان کا ان میں فیصلہ کردے اور اس میں اختلاف بھی انہیں لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آچکے تھے (اور یہ اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے (کیا) تو جس امرِ حق میں وہ اختلاف کرتے تھے، اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے۔

(سورۃ البقرۃ 2۔ ترجمہ آیت: 213)

زکوٰۃ

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے زکوٰۃ مسلمانوں کے دولت مندوں سے لی جائے اور مسلمان کے فقراء کو لوٹا دی جائے۔ اس میں 'ترد' یعنی لوٹا دی جائے کا لفظ بڑا اہم ہے۔ گویا زکوٰۃ کی رقم جو دولت مندوں سے لی گئی ہے، وہ فقراء ہی کا حق تھی اور اس کے اصل مالک فقراء ہی تھے جنھیں یہ رقم لوٹائی گئی ہے۔ یہ ان پر کوئی احسان نہیں ہے۔

انتخاب: اخلاق احمد۔ کوئٹہ

علم

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔ ''علم کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا۔

''علم یہ ہے کہ اگر کوئی تم پر ظلم کرے تو تم اُس کو معاف کردو۔ انتقام کی طاقت ہو تو درگزر سے کام لو۔ خطا کار سامنے آئے تو سوچو اُس کی خطا بڑی ہے یا تمہارا رحم۔ غصے میں ایسی بات نہ کرو جس سے بعد میں ندامت ہو۔''

مرسلہ: معصومہ رضا۔ کراچی

سنہرے اقوال

☆......محبت اور شک ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔ (خلیل جبران)

☆......طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ (سولفٹ)

☆......عقل مند لوگ اندازہ نہیں کرسکتے کہ بے وقوف اب کیا کہنے والا ہے۔ (برائٹ)

☆......آنسوؤں کو بہہ جانے دو یہ غموں کو مایوسیوں میں بدلنے سے روکتے ہیں۔ (اوتھیلو)

مرسلہ: افشاں رضا۔ راولپنڈی

احساس

ابھی میں سوچتا پھرتا تھا کچھ لفظوں کے بارے میں
وہ سب کچھ کہہ گیا مجھ کو اشارے ہی اشارے میں

کسی کے ساتھ اُس کو دیکھ کر جتنا جلا ہے دل
جلن اتنی کہاں ہوگی جہنم کے شرارے میں
تُو میرے پاس میرے دو قدم کے فاصلے پر تھا
میں تجھ کو ڈھونڈتا پھرتا تھا قسمت کے ستارے میں
نظرِ منظر سے خالی ہو یہ ممکن ہو نہیں سکتا
کوئی موجود رہتا ہے ہمیشہ ہی نظارے میں
(عدیم ہاشمی کی کتاب 'بہت نزدیک آتے جارہے ہو' سے ندیا مسعود کا انتخاب)

نعمت

مریض نے بڑی تشویش سے ڈاکٹر سے کہا۔
''مجھے بہت عجیب سا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ جب بھی میری بیوی بولتی ہے مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔''
ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ مرض نہیں نعمتِ خداوندی ہے۔''

مرسلہ: نگہت عزیز۔ حیدر آباد

اُمید

رچرڈ برٹن سے شادی کے چھ ماہ بعد الزبتھ ٹیلر کی اُس سے اَن بَن ہوگئی اور نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ الزبتھ ٹیلر نے اُس سے کہا۔ ''تمہیں مجھ جیسی بیوی کبھی نہیں مل سکے گی۔''
رچرڈ نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''اِسی اُمید پر تو طلاق دے رہا ہوں۔''

مرسلہ: مسز نوید ہاشمی۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

وجۂ تسمیہ

شراب کے نقصانات پر لیکچر دیتے ہوئے ایک صاحب نے مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔
''اگر گدھے کے سامنے ایک بالٹی میں پانی اور دوسری بالٹی میں بیئر رکھی جائے تو وہ کس بالٹی میں سے پیے گا۔''
''پانی والی بالٹی میں سے......'' ہال میں سے ایک آواز آئی۔
''بالکل ٹھیک۔'' مقرر خوش ہوکر بولے۔ ''مگر وہ ایسا کیوں کرے گا؟''
''کیونکہ وہ گدھا ہے۔'' جواب آیا۔

مرسلہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

پانی

نہ اِس کا رنگ نہ ذائقہ پھر بھی اللہ کی قدرت ہے۔ یہ 'پانی' جس کے کئی روپ ہیں۔
اوپر اُٹھے تو بھاپ، اوپر سے گرے تو بارش
جم کے گرے تو اولہ، گر کے جمے تو برف
پھول پہ گرے تو شبنم، پھول سے گرے تو عرق
آنکھ سے گرے تو آنسو، بہے تو دریا
قدمِ اسماعیل سے نکلے تو زم زم
اور حضور ﷺ کی انگلی سے نکلے تو آبِ کوثر
اور اگر نہ نکلے تو کربلا

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری۔ کراچی

مزے کی بات

☆ جانوروں کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ عید بقرعید اور شادیوں پر بجٹ کا کیا کیا جائے۔
☆ اِن کے آخری لحات غیر ضروری رسموں اور بوجھل تکلفات سے دور ہوتے ہیں۔
☆ اِن کے کفن دفن پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔
☆ اِن کی موت کے بعد جائیداد کے سلسلے میں خاندان میں نفرتیں اور رنجشیں نہیں پیدا ہوتیں۔
☆ ...... انہیں آخرت میں سوال و جواب کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔

مرسلہ: شزا عدیل۔ کراچی

ایک سے بڑھ کر ایک

پولیس مین نے ایک کار کو روکا۔ جس میں سردار جی کی فیملی جا رہی تھی۔ پولیس مین نے ڈرائیور سے کہا کہ آج ہم آپ کو سیٹ بیلٹ لگا کر کار چلانے پر پانچ ہزار کا انعام دے رہے ہیں۔ آپ اِس انعام کا کیا کریں گے۔

سردار بولا۔ ''میں اس سے اپنا ڈرائیونگ لائسنس بنواؤں گا۔''

ماں جلدی سے بولی۔ ''اس کی بات کا یقین مت کریں یہ شراب پی کر کچھ بھی بولتا ہے۔''

سردار کا باپ سوتے سے اٹھا اور پولیس کو دیکھ کر بولا۔

''مجھے پتا تھا کہ چوری کی کار میں ہم زیادہ دور تک نہیں جا سکتے۔''

مرسلہ: احسن رضا۔ راولپنڈی

جو کہہ نہ پائے

میں بھول جاؤں تمہیں اب یہ ہی مناسب ہے
مگر بھولنا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں
کم بخت!
بُھلا نہ پایا وہ سلسلہ جو تھا ہی نہیں
وہ اِک خیال جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات جو میں کہہ نہیں سکا تم سے
وہ ایک ربط جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں

پسند: رضوانہ کوثر۔ شاعر: جاوید اختر۔ لاہور

بلب

ڈاکٹر: ''تم چھت سے کیوں لٹک رہے ہو؟''
پاگل: ''میں ایک بلب ہوں۔''

ڈاکٹر: ''تو پھر تم جل کیوں نہیں رہے ہو؟''
پاگل: ''ابے یہ پاکستان ہے لائٹ گئی ہوئی ہے۔''

مرسلہ: سعدیہ عابد۔ کراچی

جسارت

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے
یقیناً اک جسارت ہوگئی ہے
تمہیں کوئی شکایت تو نہ ہوگی
مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے

شاعر: جون ایلیا، پسند: نعیمہ فیروز۔ اسلام آباد

ذرا سنیے

خوش مزاج انسان ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے۔

جب پانچ سیکنڈ کی مسکراہٹ سے فوٹو اچھی آسکتی ہے تو ہمیشہ مسکرانے سے زندگی کتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔

کسی انسان کو دکھ دینا ایسا ہی ہے جیسا سمندر میں پتھر پھینکنا، مگر کوئی نہیں جانتا کہ پتھر کتنی گہرائی میں گیا ہے۔

کمزور انسان موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں جبکہ باہمت افراد مواقع خود پیدا کرتے ہیں۔

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

پریشانی

صاحب نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔ ''بشیر کار تیز چلاؤ کہیں میری فلائٹ مس نہ ہو جائے۔''

جواباً ڈرائیور فکرمندی سے بولا۔ ''آپ سے زیادہ مجھے پریشانی ہے صاحب کیونکہ بیگم صاحبہ نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ کی فلائٹ مس ہوگئی اور آپ نہیں گئے تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں گی۔''

مرسلہ: اعظم رشید۔ ساہیوال

لڑکیاں اور پھول

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ لڑکیاں اور پھول ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں خوبصورت، معصوم اور پاکیزہ ہیں۔ دونوں کے احساسات بھی برابر ہوتے ہیں۔ جس طرح پھول اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہہ سکتا، اسی طرح لڑکیاں بھی ہر لمحے دوسروں کی خوشیوں کی خاطر اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹتی رہتی ہیں۔

آہ......! لڑکیاں اور پھول کتنے مظلوم ہوتے ہیں۔

حسنِ خیال: شاہانہ احمد خان۔ کراچی

باضمیر

ایک صاحب نے محکمہ انکم ٹیکس کے سربراہ کے نام ایک خط لکھا۔ ''جناب! میں ایک باضمیر انسان ہوں۔ گزشتہ برس میں نے اپنی آمدنی کا غلط حساب بتایا تھا اور اس کے نتیجے میں ایسی بے چینی محسوس کرتا ہوں کہ میں راتوں کو سکون سے سو نہیں سکتا۔ میں اس خط کے ساتھ پچاس ہزار روپے کا چیک بھیج رہا ہوں، اگر اس کے بعد بھی میرے ضمیر کو قرار نہ آیا اور مجھے نیند نہ آئی تو میں بقایا رقم بھی بھیج دوں گا۔''

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

کردار

انسان کا کردار گلاب کے پھول کی مانند ہوتا ہے، اگر ایک بار شاخ سے ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں جڑ سکتا۔ جب تک پھول شاخ سے جڑا رہتا ہے تب تک اس میں رنگ اور خوشبو موجود رہتی ہے، جو اس کے حسن اور سحر میں اضافہ کرتی ہے مگر جب وہ شاخ سے جدا ہوتا ہے تو رنگ اور خوشبو کھو دیتا ہے۔

اسی طرح انسانی کردار جب تک پاکیزہ اور سچا رہتا ہے، دنیا کی ہر چیز سے قیمتی ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنی سچائی کھو دیتا ہے تو دنیا کی کم تر چیزوں سے ارزاں ہو جاتا ہے۔

حسنِ خیال: حنا لطیف۔ کراچی

غرور و تکبر

حافظ بن المنذرؒ اپنی کتاب 'العجائب الغریبۃ' میں لکھتے ہیں۔ میں نے نجران کی مسجد میں ایک جوان کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس کی خوبصورت، درازیٔ قد اور مضبوطی سے متعجب ہوگیا۔ اس جوان نے کہا۔ ''تم میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''میں نے کہا کہ آپ کے جمال و کمال پر حیران ہوں۔''

وہ کہنے لگا۔ ''تو ہی کیا، خود اللہ تعالیٰ کو بھی تعجب ہے۔''

یہ جملہ کہتے ہی وہ گھٹنے اور پستہ قد ہونے لگا اور کم ہوتے ہوتے ایک بالشت رہ گیا۔ اس کے کسی رشتہ دار نے اسے آستین میں رکھا اور لے گیا۔

مرسلہ: انوشہ آصف۔ کراچی

ترکیب

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔

''میں اپنا رنگ صاف اور گورا کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی ترکیب بتاؤ؟''

دوست نے کہا۔ ''سخت سردی میں رات تین بجے پانی میں برف ڈال کر نہایا جائے تو رنگ صاف اور گورا ہو جائے گا، یہاں تک کہ لوگ دیکھ کر بے ساختہ کہیں گے کہ کس قدر صاف اور گورا رنگ نکل آیا ہے، مرحوم کے چہرے کا۔''

مرسلہ: اُمِ حبیبہ۔ اسلام آباد

نئے لہجے نئی آوازیں

دعائیہ اشعار

مجھے دولتِ دین و زر دے الٰہی
مجھے گوہرِ سیم و زر دے الٰہی
چلی جاؤں اُڑ کے میں طیبہ کی جانب
مجھے حوصلوں کے تُو پَر دے الٰہی
میں باغ محمد ﷺ کی مالن بنوں گی
تُو دامن کو پھولوں سے بھردے الٰہی
محمد ﷺ کے در پہ مری حاضری ہو
دعاؤں میں میری اثر دے الٰہی
سلامت رہے میرا سرتاج مالک
فنا نظرِ بد کو تُو کردے الٰہی
بنیں پہلے انسان، پھر ہوں مسلماں
ہدایت کے اِن کو ثمر دے الٰہی
کسی کا بھی یارب نہ محتاج کرنا
نصیب ہم کو اپنا فقر دے الٰہی
تجھے واسطہ ہے شہ دوسرا ﷺ کا
دعاؤں میں میری اثر دے الٰہی
ہے عاجز کی یہ مخلصانہ دعائیں
جو مانگوں میں قطرہ بحر دے الٰہی

شاعرہ: ڈاکٹر اقبال امینہ قادری عاجز۔ کینیڈا

سہاگن

میں ٹوٹ چکی ہوں اندر سے
ہو کے ریزہ ریزہ بکھر رہی ہوں ہوا کے سنگ
لیکن پھر بھی آنکھوں میں کجرا
ہونٹوں پہ لالی
ہاتھوں میں گجرا
پیروں میں پائل باندھے
پھرتی ہوں یوں گھر آنگن میں
جیسے میں کوئی سہاگن
لیکن بھول گئی یہ پگلی!!
جسے پیا نہ چاہے وہ کیسی سہاگن

شاعرہ: ثمینہ عرفان۔ کراچی

تیری یاد کا موسم

اونچے پہاڑوں پر
لہراتے سبزہ زاروں پر
لکھی ہے تیری میری کہانی
وقت کی زبانی
چرچا تھا جہاں وفاؤں کا ہماری
وہیں لکھی ہے اب تیری جفا کی داستان ساری
خزاں میں مرجھاتے ہیں
بارشوں میں روتے ہیں
اب نہ ہوگی مزید ہم سے موسموں کی آبیاری

شاعرہ: سعدیہ عابد۔ کراچی

ایک چاند

میں نے کھڑکی سے جو دیکھا نظر آیا ایک چاند
بدلیوں میں کبھی چھپتا نظر آیا ایک چاند
مجھ کو ہیں چاند ستارے بہت اچھے لگتے
میں بھی بن جاؤں ستارہ یا دمکتا ایک چاند
روح شفاف ہو چہرے پہ چمک ہو جس کی
روشنی بن کے اُتر آیا ہو دل میں ایک چاند
اے خدا مجھ کو کبھی بھی نہ کوئی غم ہو نصیب
یہ دعا کرتی ہوں میں دیکھ کے اکثر ایک چاند

میں نے تو انزاء یہی چاند سے سیکھا ہے سبق
روشنی دے کے بھی لیتا نہیں کچھ بھی ایک چاند
شاعرہ: انزاء نقوی۔ کراچی

چاہت دلدل دلدل

گھنگھور گھٹائیں، کالے بادل، تیز بارش
ٹھنڈی مست ہوا
دل میں مچائے ہلچل، کوئل کی کوک من کے اندر ہوک
چاہت ٹھہری دلدل دلدل
بے رحم فضا، اکھیاں برسیں، اکھیاں ترسیں
ساون کی رم جھم، بھیگتا جائے آنچل
کوئی نہ جانے، کوئی نہ سمجھے
ساون برستا ہے، یا آنسو روتے ہیں
بھیگتی جائے
اک لڑکی پاگل پاگل
شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

رشتہ

میرا تمہارا وہی ہے رشتہ
جو ہواؤں کا فضاؤں سے ہے
بارشوں کا گھٹاؤں سے ہے
جو رات سے ہے دن کا
وہی جو پھولوں سے ہے چمن کا
ہوتا ہے کسی روح سے بدن کا
جو چندا سے ہوتا ہے کرن کا
میرا تم سے وہی تعلق، وہی ہے رشتہ
جو کسی مرنے والے سے زندگی کا
جو روشنی کا دیپ سے ہے
سمندروں کا جو سیپ سے ہے
شاعرہ: یاسمین اقبال۔ لاہور

تُو میرے ساتھ رہا

میں نے رکھا تھا تجھے کتنی چاہ کے ساتھ
اُنسیت ایسی رہی تجھ سے تُو رہا ہاتھوں ہاتھ
میں گیا جب بھی کہیں تُو میرے ساتھ رہا
جتنا سچا تھا میں تُو بھی اتنا ہی کھرا
تُو ہمیشہ میرے تکیے پہ میرے ساتھ رہا
مجھ کو نیندوں سے جگانے میں تیرا ہاتھ رہا
ہر خوشی غم میں بڑا تُو نے میرا ساتھ دیا
فردِ مشرق کی طرح ایسے جلا جیسے دیا
میں تجھے رکھ کے نہ جانے کہاں بھول گیا
تُو بھی چپ چاپ رہا تجھ کو آئی نہ حیا
اس نئے دل میں نہیں ہیں کوئی بھی یادیں پرانی
کوئی بھی نمبر نہیں ہے نہ ہے، میسج کی کہانی
شاعر: سید یوسف علی۔ کراچی

غزل

ایک مہتاب سجا آنکھوں میں
پھر ہوئی رات سزا آنکھوں میں
جب دریچے میں دکھا چاند کوئی
پھر کوئی عکس سجا آنکھوں میں
پھر تیری یاد کی خوش بو آئی
پھر کوئی پھول کھلا آنکھوں میں
جب سرِشاخ کھلا پھول کوئی
آ گیا روپ ترا آنکھوں میں
پھر دریچے میں جلے دیپ جمال
پھر کوئی آن بسا آنکھوں میں
شاعر: سمیع جمال۔ کراچی

اس ماہ امبرین رانا۔ ساہیوال کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

☺: زین جی! ہم رات بہت روئے بہت آہ فغاں کی۔ بتا تو دیں کیوں؟

✎: لائٹ جو نہیں ہے دو دن سے۔

ثمرہ خان۔ کراچی

☺ بھیا جی! اگر پاؤں چادر دیکھ کر پھیلانے چاہئیں تو ہاتھ کیا دیکھ کر پھیلایا جائے؟

✎ نوٹ دیکھ کر...... ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر۔

آمنہ علی۔ شیخوپورہ

☺: نیک انسان کو لوگ بے وقوف کیوں کہتے ہیں؟

✎: جسے خدا خود نیکی کی توفیق نہیں دیتا وہ دوسروں کے لیے ایسے ہی خیالات رکھتا ہے۔

شاہینہ۔ لاہور

☺: بھیا! اگر میں ساس کے آگے بھیگی بلی بن جاؤں تو؟

✎: تو وہ غضب ناک شیرنی کی طرح آپ پر جھپٹے گی۔

ثومیہ...... ناظم آباد کراچی

☺ دلہن شادی کے دن صرف سرخ جوڑا ہی کیوں پہنتی ہے؟

✎ دولہا کو خبردار کرنے کے لیے کہ آگے خطرہ ہی خطرہ ہے۔

ماہم علی۔ کھاریاں

☺ اگر دنیا کی تمام عورتیں میک اپ کرنا بند کر دیں تو؟

✎ دنیا کے تمام مرد خوف سے آنکھیں بند کر لیں گے۔

صائمہ۔ شکار پور

☺ جب سے تمہیں دیکھا ہے کچھ کچھ ہوتا ہے، دل تو پاگل ہے مجھ سے شادی کرو گی؟

✎ میں تیرا عاشق دیوانہ، چھوڑ شادی کا فسانہ۔

حمیرا سیال۔ نواب شاہ

☺ کیا زندگی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے؟

✎ زندگی کھیل نہیں دھوپ چھاؤں سے مزین حقیت ہے۔

فرحانہ۔ مانسہرہ

☺ چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے۔ ہم کو اب تک کچن میں پیاز کاٹنے کا زمانہ یاد ہے۔

✎ لگتا ہے میاں جی نے اب خانساماں رکھ دیا ہے، جب ہی وہ زمانہ یاد کر رہی ہیں آپ۔

عمیر شاہنواز۔ حیدر آباد

☺ کچھوا ایک ہزار انڈے دیتا ہے اور کسی کو نہیں بتاتا جب کہ مرغی صرف ایک انڈہ دیتی ہے اور زوردار پبلسٹی کرتی ہے کیوں؟

✎ قسم لے لو ہمیں راز کی باتیں بالکل نہیں معلوم۔

مناہل زہرا۔ گلستان جوہر کراچی

☺ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے......؟

✎ سیخ پر چڑھا دیے...... ہے ناں!

عاقب۔ سیالکوٹ

☺ آپ نے کبھی یہ سنا ہے کہ کسی انسان پر جن آ گیا ہو؟

✎ بی بی پہلی بار انسان ہی جن پر آیا تھا جو آج تک بدلہ لے رہا ہے۔

قمر ناز۔ سکھر

☺ مردوں کے بال دراز پیدا ہونے لگے تو عورتوں نے اپنے بال قطع کر دیے کیوں؟

✎ اب باربر کو بھی تو روزی چاہیے ورنہ تو سیلون بند ہو جائیں گے۔

رفعت۔ بہاول پور

☺ مجھے ہر سوال پر کھری کھری کیوں سننے کو ملتی ہے؟

✎ آپ کیوں لب سڑک کھڑے ہو کر سوال کرتی ہیں۔

سدرہ۔ کراچی

☺ ہمارے سامنے والی کھڑکی میں ایک......؟

✎ مکڑی کا جالا بنا ہوا ہے شاید برسوں سے وہ گھر خالی ہے۔

امبرین رانا۔ ساہیوال

☺ انسانی جسم میں کون سی ہڈی ڈھیٹ ہوتی ہے جو سب ایک دوسرے کو ڈھیٹ ہڈی کا مالک کہتے ہیں؟

✎ ڈھیٹ ہڈی ہی ڈھیٹ ہوتی ہے۔

سعیدہ۔حب، بلوچستان

☺ آنے والے دور میں میوزیم میں کیا چیزیں نظر آئیں گی؟

✍ انسانی اقدار۔

عتیقہ نواز۔ٹنڈو آدم

☺ یہ چھپن چھری کسے کہتے ہیں؟

✍ آہستہ بولو تمہیں کس نے کہا۔

صفیہ بتول۔گھوٹکی

☺ عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن؟

✍ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں...... وہ بھی بجلی، پانی، ارزانی اور سب سے بڑھ کر خلوص ومحبت کے۔

عارف اقبال۔پتوکی

☺ دل کی آواز اتنی دل نشیں کیوں ہوتی ہے؟

✍ کس کے دل کی آواز......؟ اپنی یا......

انیتا کنول۔کوٹری

☺: چڑیا گھر اور ان...... کے گھر میں کون سی بات مشترک ہے؟

✍: دونوں میں ہی ایک چڑیا کو قید کرلیا جاتا ہے۔

انیلا محسن۔گجرات

☺: اک راستہ ہے زندگی جو وہ نہیں تو کچھ نہیں......کیا؟

✍: ہاں عقل ناں! ظاہر ہے عقل کو رہبر بناؤ گی تو یہ راستہ اچھی طرح کٹ جائے گا۔

نومیرہ۔سوات

☺: آپ کسی کی دل کی بات زبان پر لانے کا کوئی طریقہ بتائیے؟

✍: سوال کچھ مبہم ہے کیا کسی اور سے اس کے دل کی بات اگلوانی ہے یا اپنی من چاہی بات اس کے منہ سے......

حُسنہ۔صوابی

☺: پیار، عشق، محبت کیا ان کا وجود دنیا میں اب بھی ہے؟

✍: جی ہاں بالکل ہے جیسے آپ ہم سے مخاطب ہیں۔

شارق میر۔سرحد، سندھ

☺: زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں جو مقام وہ پھر نہیں آتے...... کیوں؟

✍: اپنے ''حال'' کو بہترین بنائیے پھر یہ سوال ذہن میں تمہیں آئے گا۔

زویا شاہ۔حیدرآباد

☺: اگر فوج میں سب سے زیادہ مرد فوجیوں کے بجائے خواتین کو بھرتی کرلیا جائے تو؟

✍: سرحدی جھڑپیں بہت بڑھ جائیں گی۔

مہوش، سحرش۔کراچی

☺: بھیا آپ کی نظر میں خوبصورت ترین تحفہ کیا ہے؟

✍: دعائیں اور صرف دعائیں۔

☆☆......☆☆

''یہ ہوئی نا بات''

کوپن برائے
جون 2015ء

نام: ________________

پتا: ________________

شیرا بھیا میں تم کو کہنا ہی بھول گئی تھی۔ اچھا تو سیر بھر چاول ہیں' تم تین چھٹانک گھی عمدہ لے آؤ' لاؤ پیسے مجھ کو دو یہ لو روپیہ مگر دیکھو گھی ذرا اچھا لینا سونگھ کر اور چکھ کر دیکھ لینا۔ بیٹا جلدی جا۔ اے لو دس بج گئے اب وہ جاتے ہیں۔ کچہری تھوڑی ان چاولوں کے......

شوکت تھانوی کا توشۂ خاص، جو آپ کو ضرور محظوظ کرے گا

ہوا یہ کہ کل آئی تھی پورے لورے ایک روپے کی شکر اور بقول شخصے پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ میاں امجد کو جو شوق سوار ہوا تو کہہ بیٹھے۔ ''ننھے کی اماں! ذرا میٹھے چاول پکاؤ'' اب کیا تھا آ گئی قیامت اور شروع ہوا ساتھ نام اللہ کے انتظام۔

ننھے کو پالنے میں لٹا کر جو تشریف لے چلیں تو بھونچال کی طرح باورچی خانے میں جا کر دم لیا اور احکام جاری ہونا شروع ہو گئے۔ ''رحیمن ذرا چاول نکالو' شیرا پڑوس سے جا کر آگ لے آ اور دیکھ کہیں دیر نہ لگانا۔ میاں کو کچہری جانا ہے تیری عادت ہے۔ نگوڑ مارے کہ تو جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے بس آگ لے کر فوراً لوٹ آنا۔ ابھی بہت سے کام ہیں۔ رحیمن...... اے بوا نوج! تم سے کوئی کام کو کہے' کوٹھری میں چاول کیا نکالنے گئیں۔ جیسے سات سمندر پار کرنے لگیں۔ اے مٹھی بھر چاول لانے میں اتنی دیر۔ نوج بیوی ایسا بھی کوئی کاہل ہو گھنٹہ بھر میں چاول لے کر لوٹی ہو۔ اچھا دروازے سے جا کر دیکھو شیرا موا زندہ ہے کہ مر گیا۔ کمبخت آگ لینے کیا گیا ہے پڑوسن سے رشتہ جوڑنے گیا ہے میں تو کہتی تھی باتیں اڑ رہی ہوں گی۔ سوا نو بج چکے ہیں ابھی نہ چاول چنے گئے ہیں' نہ آگ سلگی ہے۔ رحیمن شیرا کو دیکھنے کیا گئی ہیں کہ اب لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی بوٹیاں چباؤں' چاولوں کی فرمائش کر دینا تو سب کو آتا ہے اب دیکھیں آ کر موئے نوکر کیسے ڈھنگ کے رکھے ہیں۔ نتھنوں چنے چبوا رہے ہیں۔ آگ لگے ایسے نوکروں پر' ان سے تو میں بے نوکر کی اچھی۔ ان نمک حراموں کے بھروسے پر اگر کوئی کام چھوڑ دیا جائے تو قیامت تک تو انشاء اللہ ہو نہیں سکتا۔

لائے شیرا' آگ لائے اور یہ موئے تم کہاں مر گئے تھے۔ میں کتیا کی طرح بھونک رہی ہوں' نہ رحیمن کا پتا ہے نہ تمہارا۔ رحیمن تم کو دیکھنے کیا گئی ہیں کہ اب تک لوٹنے کا نام ہی نہیں لیا۔ میں نے کہا تھا کہ رحیمن' یہیں دروازے سے شیرا کو دیکھ لو' ان کو تو بہانہ ملتا ہے

بس غائب ہوگئیں۔ پہنچی ہوں گی اسی موئی شیراتن کی لڑکی کی یہاں۔ ان کی بلا سے‘ کسی کا کام ہو یا آگ لگے۔ شیرا میرا بچہ‘ ذرا چولہے میں آگ تو سلگا دے‘ میں جب تک چاول چُنتی ہوں۔ دیکھ‘ وہیں توے کے پیچھے نمک کی ہنڈیا کے پاس پھکنی رکھی ہے‘ تھوڑی سی کھپریل میں سے چپٹیاں چن لا اور لالٹین میں سے ذرا سا تیل ان پر ڈال کر آگ سلگا دے۔ میں اتنے میں چاول چُنے لیتی ہوں۔ ان بوا رحیمن کے بھروسے پر رہی تو پک چکے چاول۔ سچ ہے‘ اپنا کام دوسرے کے بھروسے پر کبھی نہ چھوڑو۔ خدا نے ہاتھ پیر دیے ہیں کہ کام کرو۔ اے لاؤ‘ میں بھی دم بھر میں سب چاول چُنے دیتی ہوں۔ اے شیرا‘ یہ تم آگ سلگا رہے ہو کہ بیٹھے کھیل رہے ہو؟ پھکنی نہیں ملتی تو ڈھونڈو۔ اللہ نے یہ بڑی بڑی آنکھیں کس لیے دی ہیں؟ اے ہاں‘ ٹھیک ہے‘ خوب یاد آیا‘ پھکنی موئی ملے تو کیسے‘ صبح میں نے مرغی کو کھینچ کر ماری تھی‘ وہ سامنے والے ناب دان میں گھس گئی۔ جا تو ذرا نکال لا۔

شکر ہے‘ خدا نے ہماری رحیمن کو زندہ تو واپس کیا۔ بیوی آگے سے کان مروڑے‘ اب کبھی تم سے کسی کام کو نہ کہوں گی۔ تم ایسی گئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ.....لو میں نے چاول اتنی سی دیر میں سب چُن کر رکھ دیے۔ تمہارے بھروسہ پر رہتی تو کچھ نہ ہوتا۔ ذرا پتیلی تو مانجھ لو‘ المونیم والی پتیلی لینا اور جلدی سے مانجھ دو۔ موئی دیر پر دیر ہوئی چلی جاتی ہے اور وہ کپڑے پہن رہے ہیں‘ کچہری کا وقت آ گیا‘ لاؤ میں چاول تو چڑھا دوں جب تک ابلیں شیرا لپک کر ایک پیسے کی چھوٹی الائچی تو لے آ۔ دیکھ مَری مَری نہ لانا اگر خراب ہوئیں تو منہ پر کھینچ کے ماروں گی اور دیکھ اگر تو نے دیر لگائی تو اچھا نہ ہوگا ایسے جانا جیسے گیا ہی نہ تھا۔ شاباش‘ دیکھیں ہمارا شیرا کتنی جلدی لاتا ہے۔ رحیمن تم بیٹھی کیا کر رہی ہو۔

ذرا نگوڑے چاول دھو کر چڑھا دو۔ نوج بیوی تمہارا ایسا کاہل وجود۔ جو کام تم کو نہ کرنا ہوا کرے کہہ دیا کرو۔ اے ہاں رحیمن! ذرا جلدی سے شیرا کو آواز دے لینا۔ گھی کا کہنا ہی بھول گئی۔ موا جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ میری بہن جلدی سے جاؤ۔ ابھی جمن کے دروازے ہی تک پہنچا ہوگا جب تک میں کٹوری دھوئے دیتی ہوں اسی میں گھی لے آئے گا۔

شیرا بھیا میں تم کو کہنا ہی بھول گئی تھی۔ اچھا تو سیر بھر چاول ہیں‘ تم تین چھٹانک گھی عمدہ لے آؤ‘ لاؤ پیسے مجھ کو دو یہ لو روپیہ مگر دیکھو گھی ذرا اچھا لینا سونگھ کر اور چکھ کر دیکھ لینا۔ بیٹا جلدی جا۔ اے لو دس بج گئے اب وہ جاتے ہیں۔ کچہری تھوڑی ان چاولوں کے پیچھے چھوڑ دیں گے۔ دن بھر فاقہ سے رہیں گے وہ روز کی دال روٹی بھی ان نگوڑ مارے چاولوں کے پیچھے کھوئی۔ میں بھی آخر کیا کروں کوئی دس ہاتھ پیر تھوڑا ہی لگا لوں گی۔ یہ بھی کیا کوئی ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہے۔ کمبخت لکڑیوں نے بھی قسم کھا لی ہے کہ آج نہ جلیں گی۔ نا معلوم کہاں کی بھیگی ہوئی لکڑیاں کمبخت ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔ جیسے ہم کو خیرات ہی تو دے رہے ہیں۔ بھر مٹھی دام لیں گے اور چیز ایسی دیں گے جیسے مفت ہی تو دے رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اس موئے مولا بخش حرام خور کے یہاں سے اب کبھی لکڑیاں آئیں تو اچھا نہ ہوگا۔ ’’اُن کا‘‘ کیا‘ لکڑیاں منگا کر ڈال دیں پھر تو جو کچھ آفت ہوگی وہ جلانے والے کی جان پر ہوگی۔ ان کی بلا سے یہاں موئی آنکھیں پھوٹی جا رہی ہیں اور لکڑیاں ہیں کہ سلگنے کا نام نہیں لیتیں۔ اے ننھے کے ابا تم تو اور ہاتھ پیر پھلائے دیتے ہو‘ آخر میں پوچھتی ہوں کہ آج جو ذرا چاولوں میں دیر ہوئی ہے تو کیا تمہاری کچہری بھی جھاڑو پھری جلدی کھلنے لگی۔ ایسی بھی کیا جلدی چاول تیار ہیں اب کھا کر جاؤ ذرا موا شیرا الائچی لے آئے

بس میں ابھی داغ لوں تو دیتی ہوں۔ ایسی چیز بھی پکا کر پچھتانا پڑتا ہے کہ کس شوق سے تو تم نے چاولوں کو کہا اور چلے بھوکے کچہری۔ یہ بھی کوئی بات ہے ذرا ننھے کو گود میں اٹھالو۔ کیسا بلک کر رو رہا ہے۔ موئے کی آواز پڑ گئی، نوج تمہارا جیسا بھی کوئی سنگدل ہو۔ آواز سن رہے ہیں اور کوئی پروا نہیں۔ آخر تمہاری اولاد ہے اسے پرسوں سے ویسے ہی بخار آرہا ہے۔ سینہ الگ جکڑا پڑا ہے۔ کھانسی ہے کہ دم نہیں لینے دیتی۔ نہ موئی دوا ہے نہ علاج اور ہوتو کیسے ہو تم کسی بات میں خبر ہی نہیں لیتے۔ میں گھر کی بیٹھنے والی آخر یہ سب کیسے کروں۔ لو تم تو اس کو لے کر بیٹھ گئے ذرا کندھے سے لگا کر ٹہلو تو وہ چپ بھی ہو، معصوم ہے کس وقت سے دودھ نہیں پیا ہے لاؤ میں اس کو ذرا سا دودھ یہیں بیٹھے بیٹھے پلا دوں جب تک تم ذرا اس موئے شیرا کو باہر دیکھو کہ زندہ ہے موا یا اللہ کو پیارا ہوا۔ آگ لگے اس کمبخت کو جیسا اس نے مجھ کو عاجز کیا ہے۔ خدا اس موئے سے سمجھے۔ آنے دو آج میں نے بھی وہ خبر لی ہوگی کہ بچا کر چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ یا تو آج سے وہ نوکری کو سلام کریں گے اور یا پھر ٹھیک ہی ہو جائیں گے۔ آیا موا اُدھر تو آ' کیوں رے یہ تو کہاں تھا کہہ دیا تھا کہ جلدی واپس آنا دو گھنٹے لگا دیے۔ کیا تو اندھا تھا۔ تجھے دکھائی نہیں دیتا تھا کہ میاں کچہری جانے والے ہیں۔ کیا آنکھیں پھوٹ گئی تھیں۔ مرے اللہ کرے تو' آدھی رات کو کچاتی ہوئی کھٹیا نکلے اور اوپر سے گھور رہا ہے۔ آنکھیں نیچی کر مونڈی کاٹے' نہیں تو اسی وقت اپنی اور تیری جان ایک کردوں گی۔ تو گھورے گا تو لے' گھم گھم' گھما گھم' چٹاخ' چٹاخ' دھڑ' پٹ' بھڑاخ......

شیرا کی تو مرمت شروع ہوگئی اور میاں امجد دم دبا کر بھاگے کچہری' راستہ بھر ان کے کانوں میں وہی بیوی کی جھنکار دار آواز گونجا کی۔ کچہری پہنچے تو صاحب نے ٹانگ لی کہ دیر کیوں کی اور اس بہانے سے امجد نے آج تک جتنی غلطیاں کی تھیں لگے سب گنوانے اور شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے۔ ایک تو بے چارہ رات سے بھوکا' اس پر صبح سے دس بجے تک بیگم صاحبہ کی مسلسل اور دھواں دھار تقریر نے دماغ خالی کر دیا تھا کہ اب صاحب کو شوق سوار ہوا' لگے آئیں بائیں شائیں ہانکنے' انسان ہی تو ہے' دماغ بے چارے کا چکرا گیا۔ اب صاحب پوچھتے ہیں کھیت کی تو امجد بتاتے ہیں کھلیان کی' اونٹ بکری آگرہ جواب دینے لگے۔

صاحب کا ٹمپریچر دن بھر تیز رہا اور دن بھر امجد ایک ہاتھ پچکے ہوئے پیٹ پر رکھے اور ایک ہاتھ میں قلم لیے ''ڈنڈم کا فنڈم'' کام کرتے رہے اور صاحب کی ڈانٹ سنا کیے۔ کبھی کبھی یہ بھی یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ آج صبح کس کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا' دن بھر کھانا نہیں ملا خیر نہ ملتا اوپر سے گالیاں کھانے کو مل رہی ہیں ارے صاحب جب آدمی بھوکا ہو تو آخر ٹھیک کام کس طرح کر سکتا ہے۔ مارے بھوک کے اس کے تو پیٹ میں آگ لگی ہے' اب جو صاحب پوچھتے ہیں کہ بلوے والے مقدمے کا فائل کہاں ہے تو سوائے اس کے کیا جواب دے سکتا ہے۔ ''میٹھے چاول'' اس پر صاحب کو غصہ آتا ہے۔ خیر خدا خدا کر کے پانچ بجے اور امجد کی کچہری سے جان چھوٹی۔ جلدی جلدی گھر پہنچے دیکھتے کیا ہیں کہ نہ تو شیرا ہے اور نہ رحمن بیوی چولہے کے پاس بیٹھی پھکنی لیے پھوں پھوں کر رہی ہیں اور چاول پتیلی میں کھد بد کھد بد مغل پٹھانوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ امجد بھوک کی کمزوری کے مارے چاروں شانے چت چارپائی پر لیٹ گئے اور غنودگی طاری ہوگئی۔ جب صبح آنکھ کھلی تو چاول تیار تھے مگر ان میں مینگنی نکل آئی اس لیے ٹیپو کو کھلا دیے گئے۔

آج جمعہ تھا امجد نے سب نمازیوں کے سامنے قسم کھائی کہ اب کبھی ''میٹھے چاول'' نہ پکواؤں گا۔

☆☆☆

ڈی۔ خان

جاوید شیخ کی 3 فلمیں مکمل

بولی وڈ اداکار جاوید شیخ کی تین فلمیں مکمل ہوگئی ہیں جو عیدالفطر پر ریلیز ہوں گی۔ان فلموں پروڈیوسر مومنہ درید کی ''بن روئے'' ڈائریکٹر یاسر

نواز کی ''رانگ نمبر'' اور کامران اکبر خان کی ''بلہ گلہ'' شامل ہیں۔ان پاکستانی فلموں کے علاوہ بولی وڈ میں ان کی فلم ''تماشا'' بھی مکمل ہوگئی ہے جس میں انہوں نے رنبیر کپور کے والد کا کردار کیا ہے اور اس فلم میں دیپکا پڈوکون بھی شامل ہے۔

فواد خان کی ''ماہی پنجابی نکاح''

لولی وڈ ہیرو فواد خان کا بالی وڈ میں کامیابی کا سفر جاری ہے۔ انہوں نے ہدایت کار سہیل خان کی فلم ''ماہی پنجابی نکاح'' سائن کرلی ہے۔ بولی وڈ میں فلم خوبصورت سے فلمی سفر کا آغاز اور فلم فیئر ایوارڈ

حاصل کرنے والے اداکار فواد خان پر قسمت کی دیوی مہربان ہے۔ سلمان خان کے بھائی سہیل خان نے انہیں اپنی اگلی فلم ''ماہی پنجابی نکاح'' میں سائن کرلیا ہے۔

'زندگی آرہا ہوں میں' کی ویڈیو ریلیز

بولی وڈ فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگانے والے عاطف اسلم کے نئے گانے ''زندگی آرہا ہوں میں'' کی ویڈیو جاری کردی گئی ہے۔فلم میکر احمد خان کی ہدایتکاری میں بننے والے اس گانے کے میوزک کمپوزنگ کے فرائض امال ملک نے نبھائے ہیں

جبکہ ویڈیو میں اداکار ٹائیگر شیروف شاندار ڈانس کا مظاہرہ کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ عاطف اسلم

کی سریلی آواز میں ریکارڈ کیا گیا زندگی آرہا ہوں میں کے بولوں پر بنی یہ گانا ٹائیگر شیروف کی اگلی فلم میں شامل کیا جائے گا۔

ہما قریشی ہارر فلم میں

بولی ووڈ اداکارہ ہما قریشی نے اپنی نئی ہارر فلم کی تیاری کیلئے بھارت کی آسیب زدہ جگھوں پر تحقیق کرنا شروع کر دی۔ ہما قریشی نے اپنی نئی فلم کے سلسلے میں

آسیب زدہ جگھوں پر تحقیق کرنے کیلئے راجستھان میں بھان گڑ قلعے جانے کی منصوبہ شروع کر دی ہے۔ ان قلعے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھارت کی سب سے زیادہ آسیب زدہ جگہ ہے۔ واضح رہے کہ ہارر اوکولس ری میک کی عکس بندی آئندہ ماہ شروع ہوگی۔

سلمان خان کیخلاف تمام ثبوت جل گئے

ہندوستانی میڈیا نے انکشاف کیا ہے کہ بولی وڈ اداکار سلمان خان کے خلاف ہٹ اینڈ رن کیس

2002 کی تمام فائلیں جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ ایک سماجی کارکن منصور درویش کی جانب سے جب سلمان خان کے خلاف ہٹ اینڈ رن کیس کا ریکارڈ طلب کیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اس کیس کی ساری فائلیں 21 جون 2012 کو سرکاری دفتر میں آگ لگ جانے کے باعث جل کر خاکستر ہوگئی تھیں۔ درویش کو بتایا گیا کہ مذکورہ کیس کی تمام فائلز 21 جون 2012 کو اُس وقت جل کر خاکستر ہوگئیں جب اسٹیٹ سیکریٹریٹ میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس طرح ریاست مہاراشٹرا کی حکومت کے پاس بولی وڈ اداکار کے خلاف ہٹ اینڈ رن کیس 2012 کی کوئی "معلومات" نہیں ہیں۔

ودیا بالن کا ہوا نروس بریک ڈاؤن

بولی وڈ بھارتی اداکارہ ودیا بالن کو کام کی زیادتی سے نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ فلموں کی مسلسل شوٹنگ سے پریانکا چوپڑا اور کترینہ کیف کے بعد ان

دنوں ودیا بالن کو بھی بیمار کردیا۔ گزشتہ ہفتے ودیا بالن

فلم کی شوٹنگ کے لیے کلکتہ میں موجود تھیں۔ یونی ویژن نیوز کے مطابق شوٹنگ کے دوران ودیا نے اچانک زاروقطار رونا شروع کردیا۔ جس سے روتی دھوتی ودیا کو دیکھ کر فلم ڈائریکٹر کو شوٹنگ روکنی پڑی۔ جب ودیا سے رونے کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے بتایا کہ انھیں سر میں شدید درد ہوگیا۔

عمران ہاشمی کی اظہر

بھارتی کرکٹر اظہر الدین کی زندگی پر بننے والی

فلم کی پہلی جھلک منظر عام پر آگئی۔ بالاجی جوشن پیچکرز اور ایم ایس ایم موشن پکچرز نے فلم ''اظہر'' کی پہلی جھلک جاری کردی ہے۔ فلم میں عمران ہاشمی اظہر الدین کا کردار نبھائیں گے۔ پہلی جھلک میں عمران ہاشمی گراؤنڈ میں بیٹس مینکے روپ میں داخل ہوتے ہیں اس موقع پر مشتعل ہجوم اسٹیڈیم میں توڑ پھوڑ کرتا ہے اور کچھ افراد باڑ کو پھلانگ کر اس پر حملہ کردیتے ہیں۔ واضح رہے کہ فلم ''اظہر'' کی ہدایات ٹونی ڈیسوزا نے دی ہیں۔

شاہد کپور کی منگنی

بولی وڈ کے چاکلیٹی ہیرو شاہد کپور کی باقاعدہ منگنی ہوگئی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی منگیتر کو تئیس لاکھ روپے مالیت کی انگوٹھی پہنائی جس میں ہیرا جڑا

تھا۔ شادی سے پہلے میرا راجپوت کے گھر پر منگنی کی تقریب ہوئی جس میں لڑکا اور لڑکی نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی۔ تقریب میں شاہد اور میرا کے قریبی رشتے دار موجود تھے، شاہد کپور اور دلی کی طالب علم میرا راجپوت دس جون کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں گے، دونوں کی شادی یونان میں ہوگی۔

شردھا کپور کا چلبلا گیت ریلیز

اداکارہ شردھا کپور کی فلم اینی باڈی کین ڈانس ٹو کا ایک اور چلبلا سا گیت جاری، ہیرو ورون دھون نے بھی جگایا آواز کا جادو۔ سب ہیں موج مستی کے موڈ میں، پارٹی شارٹی کی ہو رہی ہے تیاریاں، رنگ برنگے غبارے ہاتھوں میں لیے نوجوانوں کی یہ ٹولی

ہیرو ورون دھون کی سالگرہ کا جشن منا رہی ہے۔ اپنی باڈی کین ڈانس 2'' شردھا کپور کی اولین ترجیح ہے اس کے باوجود وہ فلم انڈسٹری میں خود کو زیادہ سے

زیادہ مصروف رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور گزشتہ روز انہیں اس سلسلہ میں ایک اور کامیابی حاصل ہوگئی ہے اطلاعات کے مطابق شردھا کپور کو فلم باغی میں ٹائیگر شروف کے ساتھ ہیروئن کاسٹ کرلیا گیا ہے۔
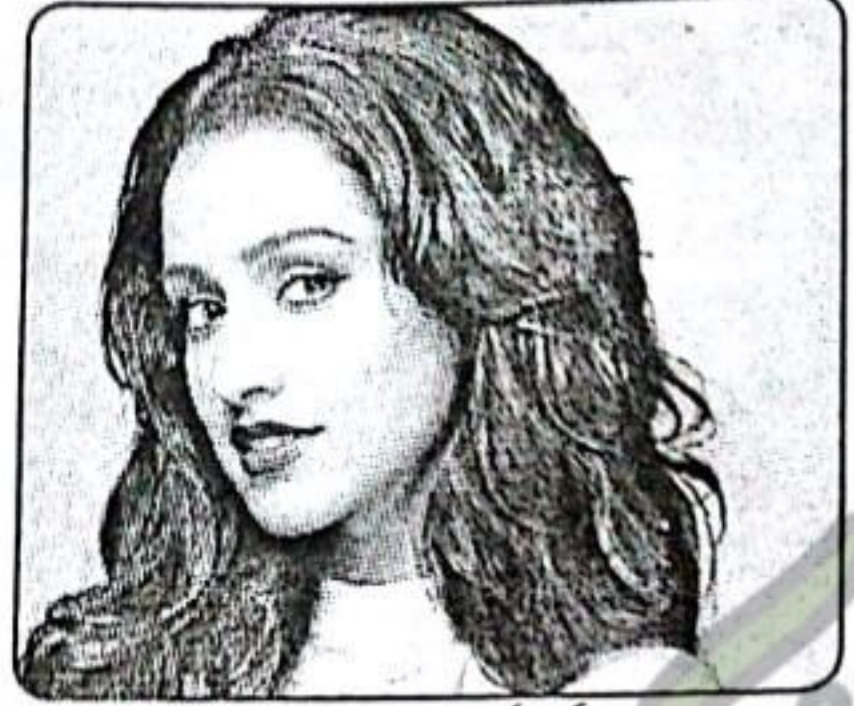
اکشے کمار فیشن ڈیزائنر بن گئے

بولی وڈ سپر اسٹار اکشے کمار اب اداکاری کے ساتھ ساتھ فیشن ڈیزائنر کے روپ میں بھی نظر آئیں گے۔ بولی وڈ میں کھلاڑی کے نام سے

مشہور سپر اسٹار اکشے کمار نے اب ایک نئے میدان میں انٹری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ سماجی ویب سائٹ پر اکشے کمار نے ایک پیغام میں کہا ہے کہ وہ جلد ہی آن لائن شاپنگ ٹی وی چینل پر اپنے ڈیزائن کردہ ملبوسات فروخت کے لیے پیش کریں گے۔ اکشے کمار کے مطابق یہ ملبوسات نا صرف جدید فیشن کے مطابق بلکہ قیمت کے لحاظ سے بھی ہر ایک کی پہنچ میں ہوں گے۔

امیتابھ بچن کا مداحوں کو انتباہ

امیتابھ بچن نے اپنے مداحوں کو متنبہ کیا کہ وہ ان کے نام سے ٹوئیٹر پر موجود جعلی اکاؤنٹ جس کے آخر میں سینئر بچن کے ہمراہ اضافی انگریزی حرف '

سی' لگا ہوا ہے کو جوائن نہ کریں۔ امیتابھ بچن کا کہنا تھا کہ جو جوائن کر چکے ہیں وہ ان فولو کر دیں کیونکہ یہ اکاؤنٹ ان ہی کی ٹوئیٹ کو اس جعلی اکاؤنٹ پر دوبارہ سے اپ ڈیٹ کرتا رہتا ہے تاہم مداح ہوشیار رہیں۔ واضح رہے کہ امیتابھ بچن کے اپنے ٹوئیٹر اکاؤنٹ پر ایک کروڑ 50 ہزار فالورز ہیں۔

ریکھا کا فلم ''فتور'' سے دل بھر گیا

بالی ووڈ اداکارہ ریکھا جنہیں شائقین طویل عرصے بعد فلم ''فتور'' میں دیکھنے کے لیے بیتاب تھے، فلم کی کاسٹ سے علیحدہ ہوگئی ہیں۔ ریکھا نے فلم کی شوٹنگ مکمل کروا دی تھی تاہم انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسکرین پر ویسی دکھائی نہیں دے رہیں جیسا کہ انہیں دکھنا چاہیے۔

☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

احمد خان۔ چیچہ وطنی

✿ پیاری باجی! میری زندگی بہت بے رونق، بے مزا اور بور ہے مجھ سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی، اس لیے میں اپنے دل میں کسی کی بھی محبت محسوس نہیں کرتا۔ سوچتا ہوں بڑا آدمی بن گیا ہوں۔ سب میری عزت کر رہے ہیں۔ آج جو مجھے توجہ نہیں دیتے آنے والے کل میں ان کی پروا نہ کروں گا۔ دل بجھا بجھا رہتا ہے۔

☆ زندگی بے رونق ہونے کا سبب یہی ہے کہ آپ کسی سے محبت نہیں کرتے۔ سوچوں اور خیالوں میں بڑے آدمی کا تصور حقیقی دنیا سے بہت دور کر دے گا۔ آج ہی اپنی ذات سے عہد کریں کہ خیالوں کے خود ساختہ جال سے باہر آ کر حقائق کا مقابلہ کریں گے۔ بے مقصد زندگی بور اور بے رونق ہوتی ہے اس لیے عزم اور ہمت سے مقصد حیات کا تعین کرنا ضروری ہے کیوں کہ کوئی بھی انسان دنیا میں بے کار نہیں ہے۔ کسی ایسے نصب العین کا تعین کر کے جو طبیعت اور مزاج کے مطابق ہو، زندگی میں حرارت اور تازگی محسوس ہو گی۔ اپنی بہترین ذمہ داریوں کی انجام دہی میں ذہن کا بھی محاسبہ کرتے رہیں تا کہ مایوسی اور نا امیدی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔

ساجدہ۔ حیدر آباد

✿: باجی جان! مجھے کالج سے گھر آنے میں ذرا سی دیر ہو جائے تو ابو بس اسٹاپ پر دیکھنے آجاتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر امی حیران و پریشان ملتی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں صرف آدھا گھنٹہ دیر ہوئی ہے اور آپ لوگ ٹینشن میں آگئے۔ پتا نہیں ان کے ساتھ کیا نفسیاتی مسئلہ ہے سوچتی ہوں یہ دونوں دنیا سے ڈرتے ہیں یا مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔

☆ کبھی آپ نے ان لڑکیوں کے بارے میں سوچا ہے جن کا گھر پر کوئی انتظار کرنے والا نہیں ہوتا ایک شہر سے دوسرے شہر جائیں تو کوئی لینے آنے والا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک جانے والوں سے پوچھیں جو ایئر پورٹ پر کسی کا انتظار کیے بغیر اپنی منزل کی طرف خود ہی چل پڑتے ہیں۔ انسان اس کا انتظار کرتا ہے جس سے اس کو محبت ہوتی ہے، یہ محبت جن لوگوں کو حاصل نہیں، ان کے دلوں میں حسرت ہوتی ہے۔ والدین کو دیکھ کر مسکرایا کریں۔ ان کو اطمینان دلائیں کہ موجودہ حالات میں آدھا یا ایک گھنٹہ دیر ہونا معمولی بات ہوگئی ہے۔ انہیں آپ پر اعتبار ہے جب ہی تو کالج بھیجتے ہیں۔

عالی۔U.K

☆: باجی! میں لوگوں کی نگاہ میں خوش قسمت ہوں۔ اعلیٰ تعلیم اور اچھی ملازمت بھی ہے دیکھنے میں صحت اچھی نظر آتی ہے، بہ ظاہر پریشانی کی کوئی وجہ نہیں لیکن پریشان رہتا ہوں۔ میرا خواب تھا کہ ملک سے باہر چلا جاؤں، ترقی کروں، سو وہ پورا ہوا لیکن میں خوش نہیں۔ اپنے ملک کی خبریں نہیں سنتا کیوں کہ پھر پریشانی شدید ہو جاتی ہے۔ گھر والوں سے فون پر مختصر بات ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا ہوا ہے مجھے۔

☆ ماہرین کے مطابق ذہنی امراض کی عدم موجودگی کسی شخص کو صحت مند ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں، بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے اور کس کی زندگی پریشان کن اور تکلیف دہ ہے۔ سب حاصل کرنے کے بعد بھی اگر آپ اپنے دل میں خوشی محسوس نہیں کر رہے ہیں تو اپنی ذہنی زندگی کا محاسبہ کیجیے اور دیکھیے پریشان ہونا بچپن کی عادت تو نہیں، یا پھر اپنے ملک کی خبریں تکلیف دہ ہیں کہ وہاں آپ ملنے جانا چاہتے ہیں اور کسی طرح کا خوف روک رہا ہے۔ دیکھیں کہ اپنے رب کے ساتھ آپ کا کیسا تعلق ہے؟ اگر یہ تعلق مضبوط ہوتا ہے تو زندگی میں قلب اور روح کی آسودگی محسوس ہوتی ہے۔

ثمن آراء۔ لاہور

☆: میری بیٹی کی عمر 22 سال ہے۔ اس نے ایک لڑکے سے دوستی کی، مجھے معلوم نہیں ہوا، پھر وہ اس کے ساتھ گھومنے جاتی رہی، یہ بھی معلوم نہ ہو سکا پھر وہ اپنے کچھ کپڑے گھر سے لے کر گئی مجھے بتایا کہ سہیلی کی شادی میں جا رہی ہوں، ایک ہفتے بعد آئے گی۔ پندرہ دن گزر گئے۔ میں فون کرتی رہی بات ہوتی رہی۔ اب وہ گھر پر ہے اور بضد ہے کہ شادی کر دی جائے۔ اب اس نے ساری کہانی سنا دی ہے۔ میں بے حد پریشان ہوں کیوں کہ وہ لڑکا مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ اس کے والدین بھی رضامند نہیں۔ میرے شوہر ملک سے باہر ہیں، یہاں میرا بیوٹی پارلر ہے میٹرک تک اسکول سے آنے کے بعد لڑکی گھر میں رہتی تھی، مجھے آتے آتے رات ہو جاتی۔ کالج میں داخلہ لینا تھا کہ یہ واقعہ ہو گیا۔ میرا دماغ مفلوج سا ہو کر رہ گیا ہے۔

☆ والدین کی طرف سے بچوں کی مادی ضروریات کی تکمیل کافی نہیں ہوتی ان کو نیک فرنبردار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وقت دیا جائے اچھا تو یہ تھا کہ بیٹی کو گھر چھوڑنے کے بجائے پارلر میں اپنے ساتھ رکھتیں لیکن اب وقت گزر چکا ہے۔ لڑکے سے بات کریں وہ اپنے والدین کو راضی کرے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ آپ کی بیٹی کو شادی کے بعد عدم تحفظ یا مسائل و مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ باوجود اس کے کہ بیٹی نے فرمانبرداری نہیں کی، اس کا ساتھ دیں، اس کو تنہا نہ چھوڑیں ورنہ اس کے دکھ آپ کو بھی افسردہ کر دیں گے۔

عرفانہ احمد۔ گھوٹکی

☆ عرفانہ آپ نے سوال شائع کرنے سے منع کیا ہے اس لیے صرف جواب لکھ رہی ہوں۔ وزن بڑھنے کی پہلی وجہ تو زیادہ کھانا ہی ہے لیکن اگر کھانا کم کرنے کے باوجود وزن میں کمی کے بجائے اضافہ ہو رہا ہے تو گھر کے کاموں کی انجام دہی کے علاوہ مناسب ورزش کریں۔ اپنے فیملی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔ اتنی کم عمری میں جوڑوں کا درد، کمر کا درد، سستی، چکر آنا بہت زیادہ دل گھبرانا توجہ طلب ہے۔ وزن میں غیر معمولی اضافہ کسی جسمانی مرض کے سبب بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆......☆☆☆

نادیہ طارق

قارئین! اِس ماہ کچن کارنر میں ہم آپ کے لیے بہت مزیدار لیکن پکانے اور بنانے میں سادہ اور آسان ڈشز لے کر آئے ہیں۔ اِن کی تیاری میں، وقت کی بچت بھی ہے اور دسترخوان کے ذائقے بھی آزمائیے اور داد وصول کیجیے۔

پائن ایپل رائس

اجزاء

اُبلے ہوئے چاول	: آدھا کلو
کٹا ہوا لہسن	: پون چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی ادرک	: پون چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی ہری پیاز	: ایک کپ
نمک	: حسبِ ذائقہ
پسی ہوئی کالی مرچ	: ایک چائے کا چمچہ
کُٹی ہوئی لال مرچ	: ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس	: دو کھانے کے چمچے
سرکہ	: ایک چائے کا چمچہ
کٹا ہوا پائن ایپل	: ایک کپ
پائن ایپل سیرپ	: آدھا کپ
تیل	: دو کھانے کے چمچے

ترکیب: چاولوں میں سرکہ ڈال کر اُبال لیں، گلنے کے بعد اچھی طرح ٹھنڈا کر کے رکھ لیں۔ ایک ساس پین میں تیل گرم کریں۔ کٹا ہوا لہسن، ادرک ڈالیں اور ہلکا سا تلنے کے بعد ہری پیاز، چاول، نمک اور کالی مرچیں ڈال کر ملائیں پھر سویا ساس، پائن ایپل جوس اور پائن ایپل کے سلائس ڈال کر اچھی طرح ملانے کے بعد ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

کریمی چکن قورمہ

اجزاء

مرغی کے سینے کا گوشت	: ایک کلو
پیاز	: چار عدد
وائٹ قورمہ مسالا	: دو کھانے کے چمچے
میدہ	: دو کھانے کے چمچے
خشک دودھ	: دو کھانے کے چمچے
پسا ہوا لہسن، ادرک	: دو کھانے کے چمچے
کشمش	: دو چائے کے چمچے
فریش کریم	: آدھا پیکٹ
تیل	: چار کھانے کے چمچے
دہی	: پون کپ
نمک	: حسبِ ضرورت

ترکیب: مرغی کے سینے کا گوشت لیں اور اس کی چوکور بڑی بوٹیاں بنائیں۔ اس کے بعد دیگچی میں تیل گرم کریں۔ پیاز سنہری تلنے کے بعد تیل سے نکال کر پیس لیں۔ پھر اسی تیل میں مرغی، لہسن، ادرک، قورمہ مسالا اور دہی ملا کر پکائیں، پانی نہیں ملائیں۔ پھر پسی ہوئی پیاز، کشمش ڈالیں۔ درمیانی آنچ پر پکانے کے بعد پانی خشک کر لیں۔ فریش کریم، لیموں کا رس اور خشک دودھ ملا کر اتار لیں۔ گرم گرم نان یا اُبلے ہوئے

چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

روز سلش

اجزاء

پانی	:	پانچ کپ
چینی	:	750 گرام
عرقِ گلاب	:	ایک چائے کا چمچ
لال رنگ	:	ایک چٹکی
لیموں	:	ایک عدد
دار چینی پاؤڈر	:	ڈیڑھ چائے کا چمچ

ترکیب: ایک پتیلی میں پانی اور چینی کو ملا کر پانچ منٹ کے لیے پکائیں۔ یہاں تک کہ آمیزہ گاڑھا ہو جائے۔ چولہا بند کردیں، پھر اس میں عرقِ گلاب، لیموں، دار چینی پاؤڈر اور لال رنگ شامل کریں۔ اچھی طرح مکس کریں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

رس ملائی

اجزاء

خشک دودھ	:	دو کپ
بیکنگ پاؤڈر	:	دو چائے کے چمچ
میدہ	:	ایک چائے کا چمچ
گھی	:	دو کھانے کے چمچ
انڈے	:	دو عدد
دودھ	:	دو کپ
چینی	:	دو کپ
ہری الائچی	:	آٹھ یا دس
پستہ	:	حسبِ ضرورت

ترکیب: دودھ ابال لیں اس میں الائچی اور چینی شامل کردیں۔ دودھ کو پانچ دس منٹ پکائیں۔

ایک برتن میں خشک دودھ، میدہ اور گھی شامل کریں اور پھینٹ کر انڈے ڈالیں اور نرم درمیانے سائز کے پیڑے بنائیں۔ اب دودھ میں شامل کردیں۔ آنچ تیز کردیں اور پانچ منٹ تک پکائیں۔ اب آنچ دھیمی کردیں اور مزید دس پندرہ منٹ تک پکائیں۔ پستے سے گارنش کریں اور ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

سویوں کے لڈو

اجزاء

کھویا	:	تین سو گرام
شکر	:	ڈھائی سو گرام
سویاں	:	سو گرام
کاجو	:	سو گرام (توڑ لیں)
الائچی	:	دو سے تین عدد (پسی ہوئی)
گھی	:	دو کھانے کے چمچے

ترکیب: ہلکی آنچ پر کڑاہی میں گھی گرم کریں۔ سویوں کو مناسب انداز میں توڑ لیں اور گھی میں ڈال کر سرخ کریں۔ بعد میں اسے کسی چیز سے نکال کر الگ کرلیں، اسی گھی میں کھویا ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اور اس میں کاجو شامل کرلیں۔ آخر میں چینی ملا کر اچھی طرح ہلائیں۔ اب اس مکسچر میں الگ رکھی ہوئی سویاں اور الائچی پاؤڈر بھی شامل کرلیں۔ کچھ دیر بعد آنچ سے اُتار لیں۔ جب یہ آمیزہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس مکسچر کے لڈو بنالیں اور ٹرے میں رکھتی جائیں آخر میں اوپر سے باریک کٹے ہوئے بادام اور کھوپرا چھڑک دیں۔ مزیدار سویوں کے لڈو تیار ہیں۔

آلو کی میٹھی کچوریاں

اجزاء

آلو	:	آدھا کلو

شکر : آدھا کلو

الائچی : دو عدد

گھی : حسبِ ضرورت

پسا ہوا ناریل : تھوڑا سا

ترکیب: آلوؤں کو اُبال کر چھلکے علیحدہ کر کے باریک پیس لیجیے۔ پہلے آلوؤں کے بھرتے کو گھی میں الائچی کا بگھار دے کر بھونیے، جب گلابی ہو جائے تو شکر ملا کر بھونیے، پسا ہوا ناریل ملا لیں اور حسبِ معمول میدے یا آٹے کی کچوریوں میں بھر کر تل لیں۔ کچوریوں کے آٹے کو گوندھتے وقت بھی گھی ضرور ملا لینا چاہیے، اس کے بغیر خستگی نہ آئے گی، بہت مزیدار میٹھی کچوریاں تیار ہوں گی۔

کوکونٹ کھیر

اجزاء

ناریل : پچاس گرام (کدوکش کیا ہوا)

چاول : دو کھانے کے چمچ (ایک گھنٹے پہلے بھگو دیں)

چینی : دو کھانے کے چمچ

شہد : دو کھانے کے چمچ

الائچی پاؤڈر : آدھا کھانے کا چمچ

دودھ : تین کپ

ناریل : سجاوٹ کے لیے (باریک کٹا ہوا)

ترکیب: ایک پتیلی میں دودھ ابال لیں۔ اب دودھ میں چاول اور الائچی ڈال دیں اور چاول گلنے تک پکائیں۔ اس کے بعد چینی، شہد اور ناریل شامل کر کے مزید پکائیں۔ گاڑھا ہو جانے پر کھیر کو چولہے سے اتار لیں۔ باؤل میں نکال کر ناریل اور الائچی دانے سے گارنش کریں۔

مچھلی کی بریانی

اجزاء:

مچھلی کے ٹکڑے	ایک کلو
چاول (اُبلے ہوئے)	آدھا کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	250 گرام
ٹماٹر (چوپ کیے ہوئے)	375 گرام
پسا ہوا لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا، پودینہ (چوپ کیا ہوا)	آدھا، آدھا گڈی
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	6 عدد
آلو بخارے	50 گرام
بادیان کے پھول، چھوٹی الائچیاں	4 عدد
بڑی الائچیاں	2 عدد
لونگیں	4 عدد
پسی ہوئی جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	پون چائے کا چمچہ
بریانی ایسنس	چند قطرے
پسا ہوا دھنیا، ثابت کالا زیرہ	ایک، ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	ایک پیالی

ترکیب:

دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں مچھلی کے ٹکڑے بھی تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں ٹماٹر، لہسن ادرک، آلو بخارے، بادیان، چھوٹی اور بڑی الائچیاں، لونگیں، جائفل جاوتری، زردے کا رنگ، دھنیا، کالا زیرہ، کالی مرچ، لال مرچ اور نمک ڈال کر ٹماٹر نرم ہونے تک پکائیں۔ اس میں آدھی ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال کر مچھلی کے ٹکڑے تہہ کی طرح رکھ دیں۔ اس کے اُوپر چاولوں کی تہہ لگائیں پھر باقی ہری مرچیں، دھنیا، پودینہ اور بریانی ایسنس چھڑک کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بریانی ٹماٹر سے سجا کر پیش کریں۔

☆☆......☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفا بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

لیکوریا

خواتین کی اکثریت آج کل اس مرض میں مبتلا ہے لیکن فطری شرم و حیا اور مرض کو معمولی سمجھ کر وہ علاج کی طرف توجہ نہیں دیتیں حالانکہ یہ مرض ان کی صحت اور حسن و جمال کو متاثر کرتا ہے

اگر اس مرض کا جلد علاج نہ کیا جائے تو اس ضعیف اعضائے رئیسہ اور دیگر مرض کی شکایات کے باعث استقرارِ حمل کی قابلیت نہیں رہتی اور شادی کے ثمر، اولاد جیسی نعمت سے محرومی رہتی ہے۔ آج کل چھوٹی عمر کی لڑکیوں کو یہ مرض عام ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ بازار کا فاسٹ فوڈز کھانا اور تیز مسالے کی

چپس وغیرہ ہیں۔

اسباب

ورم، رحم کے ٹل جانے، حیض کی بندش، چھوٹی عمر میں حمل ہونے، اندام نہانی کے ورم یا سوزش کی وجہ سے عام جسمانی کمزوری، خون کی کمی، سوزاک، آتشک یا نقرس کے باعث یہ بھی مرض ہو جاتا ہے مباشرت کی کثرت سے بھی یہ مرض ہو جاتا ہے۔

علامات

کمر درد، پیڑو میں بوجھ اور درد کی شکایات پائی جاتی ہیں۔ بھوک نہیں لگتی، طبیعت سست اور کسلمند رہتی ہے۔ کسی کام کو جی نہیں چاہتا، عام جسمانی کمزوری ہوتی ہے، پیشاب بار بار آتا ہے، ماہواری درد اور تکلیف سے آتی ہے۔ پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ قبض کی شکایات ہو جاتی ہے اعضاء شکنی ہوتی ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ جاتے ہیں۔ چہرہ زرد اور بے رونق ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں۔

نسخہ:

سنگھاڑا	50 گرام
دکنی سپاری	25 گرام
مازیان	25 گرام
لودھ	25 گرام
طرفا	25 گرام
سنبل کا گوند	25 گرام
موصلی سفید انڈین	25 گرام
تخم جلونی	25 گرام
بنسلوچن	25 گرام
ضمغ عربی	25 گرام
سنگ جراحت	25 گرام
اسگندھ ناگوری	25 گرام
لاجونتی	25 گرام

ترکیب: تمام چیزوں کا سوف بنا کر 5 گرام صبح 5 گرام رات دودھ کے ساتھ۔

پرہیز: تمام گرم اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔

☆☆......☆☆

سنہرے درخت کا سنہرا پھل 'پپیتا'

پپیتے کو سنہرے درخت کا پھل کہا جاتا۔ یہ قدرت کا ایک ایسا انمول تحفہ ہے جس پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ 1977ء میں لندن کے ایک اسپتال میں پپیتے کو ایک ایسا انفیکشن روکنے کے لیے استعمال کیا گیا جو گردوں کے آپریشن کے بعد لاحق ہوتا تھا۔ اس کے استعمال کے بعد انفیکشن اتنی تیزی سے دور ہوا کہ جیسے کسی جادو نے کمال دکھایا ہو۔ لندن کے تمام اخبارات نے اس کراماتی پھل کے متعلق شہ سرخیاں لگائیں۔ اس کے بعد ہی یورپی لوگوں کو پپیتے کی صحیح اہمیت کا اندازہ ہوا، لیکن برصغیر پاک و ہند میں یہ پھل صدیوں سے مختلف امراض کے خاتمے کے لیے معاون تسلیم کیا جاتا ہے۔ حکمت میں اس کے پھل، چھلکے بیج اور پتوں سے درجنوں امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ صرف برصغیر پاک و ہند ہی نہیں دنیا کے دیگر خطوں میں بھی یہ پھل قدیم زمانے سے استعمال ہو رہا ہے۔ پپیتے میں وٹامن C وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ ایک تیار پپیتے میں وٹامن A اور C، فولاد، کیلشیم اور پوٹاشیم کی بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ بالوں اور جلد کو نکھارنے کے لیے ازحد مفید، کھانے کے علاوہ اگر اسے چہرے پر لگایا جائے تو جلد چمکنے لگتی ہے۔ اس پھل میں قدرت نے اتنی غذائیت رکھی ہے کہ اگر انسان اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تو ہمیشہ بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

بیوٹی گائیڈ

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

حسن اور خوبصورتی میں صرف چہرہ ہی نہیں بلکہ خواتین اپنے ہاتھ اور پیر بھی نرم و ملائم اور خوبصورت چاہتی ہیں۔ اس ماہ ہم بیوٹی گائیڈ میں خواتین کے لیے ہاتھوں کی خوبصورتی کے حصول کے لیے اہم ٹپس لائے ہیں جو یقیناً آپ کے اس مسئلے کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

حسن و خوبصورتی حاصل کرنا ہر عورت کی اولین خواہش ہوتی ہے۔ چہرے کی دلکشی کے بعد ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں نرم و ملائم اور خوبصورت نظر آئیں لیکن اس خواہش کا حصول ایسا کچھ مشکل بھی نہیں، تھوڑی سی توجہ اور محنت سے ہاتھوں اور پیروں کی صفائی اور نکھار کے لیے مینی کیور اور پیڈی کیور کا طریقہ اختیار کریں۔

نرم و ملائم اور خوبصورت ہاتھ

جسم کی دلکشی کے لیے متوازن غذا ضروری ہے۔ متوازن غذا میں ایسے پروٹین وغیرہ شامل ہوتے ہیں جو چہرے، ہاتھ اور پیروں کی جلد کو نرم و ملائم اور صحت مند و خوبصورت رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی غذا کو متوازن بنانے کے لیے سبزیاں، دالیں، اناج، مچھلی، دودھ اور پھل استعمال کریں اور کم سے کم دن بھر میں بارہ گلاس پانی ضرور پیئیں تاکہ زہریلے اور فاسد مادے جسم سے خارج ہو جائیں۔ کھلی جگہ میں روزانہ کم از کم دس بار لمبی لمبی اور گہری سانس لیں تاکہ آکسیجن خون میں شامل ہو کر صاف و تازہ خون جسم کو گردش کرنے دے، صاف وشفاف خون چہرے پر ہی نہیں، ہاتھوں پر بھی دلکشی بن کر جھلکتا ہے۔ متوازن غذا کے ساتھ کیلشیئم کی بھی مناسب مقدار لینی چاہیے تاکہ آپ کے ناخن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ہاتھوں کی بے رونقی کا سبب نہ بنیں۔

ہاتھوں کی بیرونی صفائی کے لیے روزانہ جتنی بار آپ ہاتھ دھوئیں، کم از کم خشک موسم میں ہاتھوں کو خشک کرنے کے بعد ہینڈ لوشن، کولڈ کریم یا پھر بالائی مل لیں، اس طرح کلائیوں تک مساج ہو جائے گا پھر ہتھیلیوں کی پشت اور انگلیوں کی حرکت ہمیشہ نیچے سے اوپر کی جانب رکھیں۔ اوپر سے نیچے کی جانب حرکت کرنے سے جلد لٹکنے لگتی ہے۔ گلیسرین، عرقِ گلاب اور لیموں کا رس ہم وزن لے کے ملا لیں۔ اس آمیزے کو بازو سے لے کر ہاتھوں کی انگلیوں تک لگا کر پانچ منٹ مساج کریں۔ اس طرح

ہاتھوں کی جلد نرم اور دلکش ہو جاتی ہے اور بازو سڈول اور خوبصورت شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

سردیوں میں گرم پانی کے استعمال سے نہ صرف جسم کی جلد خشک ہو کر چٹختی ہوئی نظر آنے لگتی ہے بلکہ ہاتھ بھی گرم اور سرد پانی کے باعث کٹے پھٹے، بے رونق اور خشک ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ناخن بھی خراب ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کا کام کاج مثلاً کپڑے اور برتن دھونے کے باعث بھی ہاتھوں کی جلد اور ناخن کو نقصان پہنچتا ہے اور ہاتھ بدنما دکھائی دیتے ہیں اس لیے ان امور کی انجام دہی کے وقت دستانے پہنیں تاکہ ہاتھوں کی ملائمت برقرار رہے بلکہ سبزیوں کو کاٹنے اور انہیں چھیلتے وقت بھی سردیوں کے موسم میں کپڑے کے دستانے استعمال کرنا مناسب ہوگا تاکہ روز روز ہاتھوں پر محنت کرنے سے بچ سکیں اور ہاتھ بھی صاف ستھرے اور نرم و ملائم رہیں۔

ہاتھوں کی خوبصورتی و دلکشی برقرار رکھنے کے لیے رات کو سوتے وقت ہاتھوں پر دودھ کی بالائی مالش کریں۔ دودھ اور عرقِ گلاب ملا کر ہاتھوں پر ملیں اور ایک گھنٹے کے بعد ہاتھ دھولیں۔

زیتون کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر ہاتھوں پر ملیں تو ناخن گلابی، مضبوط اور جلد میں نکھار اور ملائمت آئے گی۔ لیموں کا رس اور سرکہ بھی ہاتھوں پر ملنے سے داغ دھبے اور نشانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جلد نکھر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نیم گرم دودھ کو سونے سے قبل ہاتھوں پر ملنے سے بھی ہاتھ خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کھیرے اور ٹماٹر کے گودے کو مسل کر یا ہاتھوں پر اس مساج کریں۔

مردہ اور بھدی کھال نکل کر صاف شفاف جلد نکھر آئے گی اور ہاتھ خوبصورت ہو جائیں گے۔

ہاتھوں اور پیروں کی خوبصورتی کے لیے ناخن تراشنے سے ابتدا کریں۔ یہ عمل ہفتے میں کم از کم ایک بار ضروری ہے۔ ناخن تراشتے وقت اس کی موزوں لمبائی اور گولائی کا خاص خیال رکھیں۔ اگر آپ کے ناخن کمزور ہیں اور ٹوٹتے ہیں تو ایسے میں انہیں تین سے چار دن بعد تھوڑا تھوڑا تراشتی رہیں۔ ناخن تراشنے کے بعد اگر ان پر تھوڑا سا زیتون کا تیل، بادام یا ناریل کا تیل مل لیا جائے تو یہ عمل ناخنوں کے لیے موئسچرائزر کا سبب بنے گا۔

ناخنوں کو خوشنما بنانے کے لیے انہیں دودھ اور لیموں کے رس میں پندرہ منٹ بھگو کر رکھیں۔ کبھی کبھی شہد میں عرقِ گلاب ملا کر اس سے بھی ناخن صاف کریں۔ اگر ناخن میلے ہوں تو ایک پیالی پانی میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا کر اس سے ناخن صاف کریں۔ لہسن کے ایک یا دو جوے روزانہ ناخنوں پر ملنے سے ناخن مضبوط اور خوشنما ہو جاتے ہیں۔ مینی کیور کا اگر بہترین نعم البدل درکار ہو تو ایک چمچہ چینی اپنے ہاتھوں پر ڈالیں اور اسے لیموں کے ٹکڑے سے آہستہ آہستہ ملیں۔

ہاتھوں کی خوبصورتی اور دلکش کہنیوں کی صفائی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ کہنیوں کی دلکشی کے لیے ایک آلو کاٹ کر اسے کانٹے سے گود کر اس کا عرق کہنیوں پر ملنے سے سیاہی دور ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لیموں کا رس لگانے سے بھی کہنیوں کی سیاہ رنگت صاف ہو جاتی ہے۔ ناریل کے تیل میں لیموں کا رس شامل کر کے لگانے سے بھی کھردری، سیاہ اور بھدی کہنیوں کی جلد صاف ستھری اور چکنی ہو جاتی ہے۔

☆☆......☆☆